قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in
نومبر 2020 قیمت ₹15

ماہنامہ اردو دنیا
نئی دہلی

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

ادب اطفال
ماضی اور حال

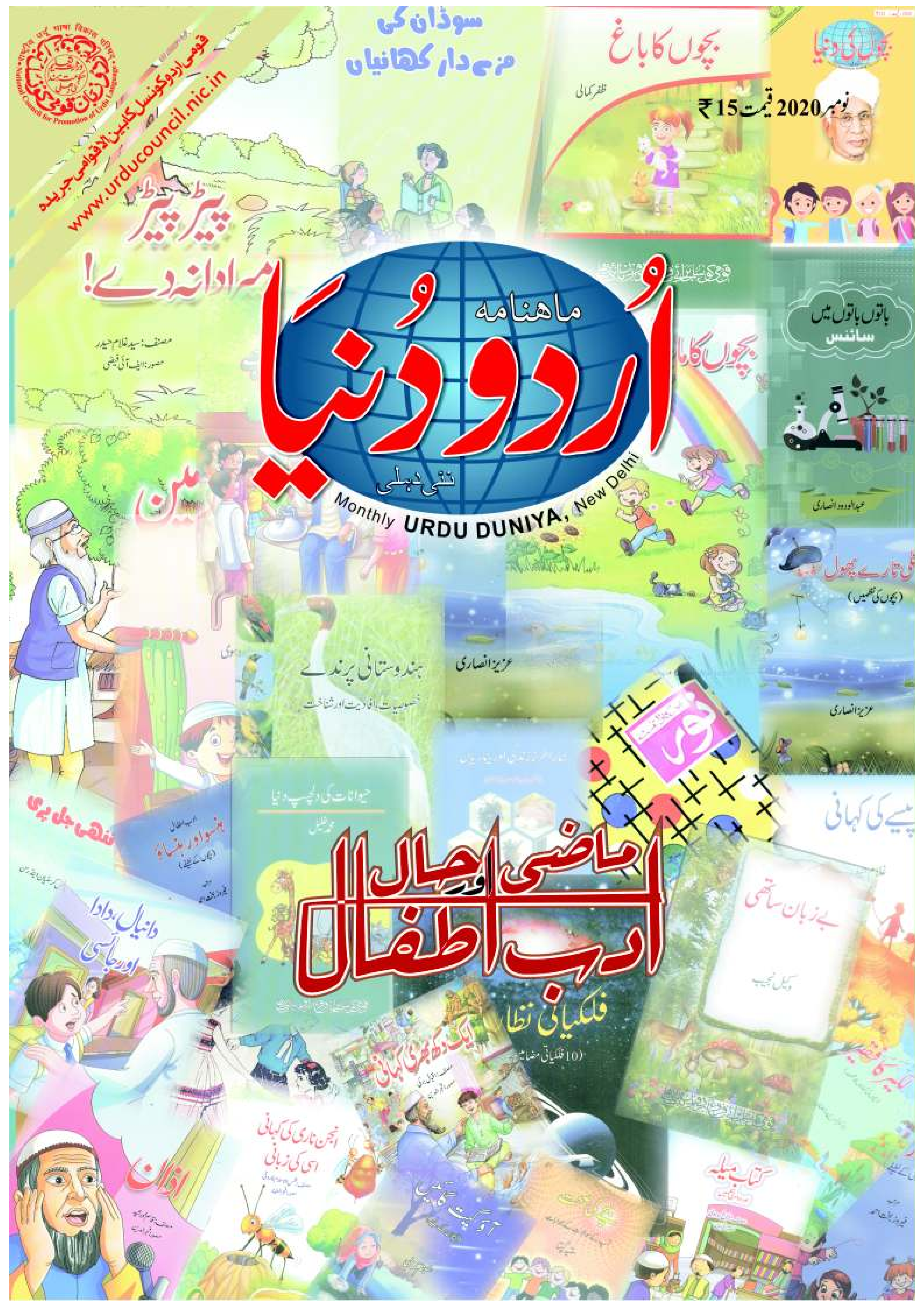

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

کے لیے اردو کی تاریخ کا سب سے خوب صورت، خوب سیرت شاندار رسالہ

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

دل چسپ کہانیاں
معلوماتی مضامین
ہنسنے ہنسانے کی باتیں

ماہنامہ
بچوں کی دنیا
دہلی
Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

پیاری پیاری نظمیں
قسط وار ناول

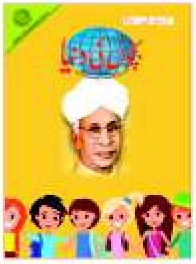

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیاہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ: 110-7-22، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھرگٹی، حیدرآباد-500002 فون: 040 - 24415194

اردو دنیا

ماہنامہ

Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

دہلی

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:22، شمارہ:11، نومبر 2020

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

مشیر : حقانی القاسمی

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

وزارت تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا

فیز-II، نئی دہلی-110020

مقام اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام

ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages:100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL,New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ۔ نئی دہلی-110025

فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in

E-mail: editor@ncpul.in

urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066

فون: 26109746، فیکس: 26108159

ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com

شاخ: 22-7-110 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس

بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002

فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ

ہماری بات 4

خطوط

آپ کی بات — قارئین کے خطوط 5

زبان اور زمینی صورت حال

... تو پھر اردو کا مرثیہ کون لکھے گا؟ — قاضی مشتاق احمد 7

نقد و نگاہ

اقبال کی داستان سرائی — عبدالحق 11

اردو طنز و مزاح کی روایت اور نظیر اکبرآبادی — مظہر احمد 14

مولانا آزاد اور سائنس و ٹیکنالوجی — محمد اختر 17

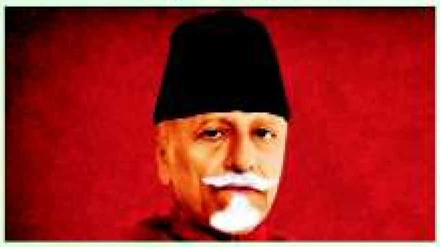

خراج عقیدت

پروفیسر فضل امام کی یاد میں — فاروق بخشی 20

ادب اطفال: فن اور فنکار

موجودہ عہد کے بچوں کا ادب بچوں کے رسائل — صادقہ نواب سحر 23

اور موجودہ صورت حال — محمد جہانگیر وارثی 25

اردو میں بچوں کا تحریر کردہ ادب — آفاق عالم صدیقی 28

جنوبی ہند میں بچوں کی نظمیں — سید اسرار الحق سبیلی 32

بچوں کے شاعر محمد اقبال — سعود عالم 35

مرتضیٰ ساحل تسلیمی — پرویز اشرفی 37

گجرات میں ادب اطفال کے شاعر و ادیب — صفیہ بانو اے شیخ 39

بچوں کے ادب کے فروغ میں رسالہ 'نور' کی خدمات — سعدیہ سلیم 42

ادب اطفال اور بچوں کی نفسیات — شاہد جمال 44

تمنا مظفر پوری — نشاط اختر 47

حافظ عبدالسمیع دھامپوری — غیاث الدین 50

عالمی ادبیات

ورڈس ورتھ کی فطرت پرستی — محمد جلیل 52

زبان و تعلیم

فاصلاتی تعلیم ہندوستان کے تناظر میں — ایس آر سبحانی 54

نگر نگر اردو

شہر ناندورہ کا ادبی منظرنامہ — محمد علیم اسماعیل 57

شخصیت

نیا آسماں نئے ستارے

اردو کے اہم محققین — محمد راشد اقبال 61

سیاسی و مذہبی جبر اور 'انگارے' — محمد اسد 65

تقسیم ہند کا المیہ — رضوان احمد 67

افسانوی روایت کا منفرد راوی نیر مسعود — نثار احمد 69

کمپیوٹر

ورک شیٹ کو از سر نو ترتیب دینا 73

کتابوں کی دنیا

تعارف و تبصرہ — ادارہ 76

خبرنامہ

اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 85

ہماری بات

انٹرنیٹ نے مطلوبہ مواد، مآخذ و مصادر تک رسائی کی راہ ضرور آسان کر دی ہے، مگر اس آسانی کی وجہ سے ایک بڑی دقت یہ پیدا ہوگئی ہے کہ content scraping کی وبا عام ہوتی جارہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ انٹرنیٹ سے پہلے سرقہ یا چوری کا چلن نہیں تھا۔ پہلے بھی دوسروں کے مسروقہ افکار و نظریات پر مضامین کی عمارت کھڑی کی جاتی رہی ہے اور اس سلسلے میں اس زمانے کے باشعور افراد آواز بھی بلند کرتے رہے ہیں۔ ہماری علمی اور ادبی تاریخ میں سرقے کے ایسے بہت سے اشارے ملتے ہیں جہاں بغیر کسی ترمیم و اضافے کے من و عن دوسروں کے جملوں اور عبارتوں کو اپنے مضمون میں شامل کرلیا گیا۔ سرقے کے تعلق سے کئی رسالوں کے خصوصی شمارے بھی شائع ہوئے جن میں سرقے کی پوری تفصیلات پیش کی گئیں اور وہ فہرست بھی جس میں کچھ بڑے نام بھی شامل ہیں۔

سرقہ جرم ہے، اخلاقیات کے منافی عمل ہے اور بعض ملکوں میں اس پر سزائیں بھی دی جاتی رہی ہیں۔ خاص طور پر طلبا اور اساتذہ اگر اس عمل میں ملوث پائے جاتے ہیں تو ان کے خلاف تادیبی کارروائی بھی کی جاتی ہے۔ بعض اوقات تو ایسا بھی ہوا کہ کسی تخلیق کی راتوں رات شہرت ہوگئی اور بعد میں پتہ چلا کہ وہ تخلیق مسروقہ تھی تو نہ صرف اشاعتی اداروں نے کتابیں بازار سے واپس لے لیں بلکہ اشاعتی معاہدے بھی منسوخ کر دیے گئے۔ اس طرح کے سیکڑوں واقعات ہیں جن کی روشنی میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ سرقے کی وبا سے بہت ہی کم لوگ محفوظ ہیں۔ پرانے زمانے کے مصنفین کسی قدر حزم و احتیاط سے کام لیتے تھے مگر آج کے عہد میں دھڑلے سے سرقے کا کام جاری ہے۔ سرقے کی بڑھتی ہوئی وارادات کو دیکھتے ہوئے کئی بڑی زبانوں میں سرقہ پکڑنے کی تکنیک دریافت کرلی گئی ہے جس کے ذریعے وہ مسروقہ مواد کی تفتیش و تشخیص میں کامیاب بھی ہوئے۔ اردو کا معاملہ یہ ہے کہ یہاں Plagiarism (PD) detection سافٹ ویئر کامیاب نہیں ہے جس کی وجہ سے اردو میں سرقے کی گرفت بہت مشکل ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ اردو میں سرقے کی روش عام ہے، خاص طور پر اکیڈمکس میں یہ وبا کچھ زیادہ ہی ہے۔ اسی لیے بعض جامعات میں سرقے کی گرفت کے لیے تکنیک کا سہارا لیا جاتا ہے اور تحقیقی مقالات کو سرقہ پکڑنے کے آلات سے گزارنے کے بعد ہی منظوری دی جاتی ہے، یہ ایک اچھا عمل ہے۔ اس کے دائرے کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے تاکہ سرقے جیسی غیر اخلاقی حرکت اور فراڈ کو روکا جاسکے۔

دراصل سرقہ شب خون مارنے جیسا ایک عمل ہے جس کی روک تھام نہیں کی گئی تو بہت سی تحقیقات اور تخلیقات آگے چل کر مشتبہ اور مشکوک قرار پائیں گی اور اصل مصنف کی شناخت دشوار ہوجائے گی۔ المیہ یہ ہے کہ بہت سے رسائل میں بعض لکھنے والے پکی روشنائی میں اپنا نام دیکھنے کی خواہش کے تحت پرانے رسائل و مجلات سے مضامین من و عن اخذ کرکے اشاعت کے لیے بھیج دیتے ہیں۔ اب ان رسائل اور مجلات تک رسائی زیادہ تر مدیران کی ممکن نہیں ہوتی، اسی لیے ایسے مضامین بھی غلطی سے شائع ہوجاتے ہیں، اس سے ادارے کی ساکھ بھی مجروح ہوتی ہے اور قلمکاروں کا طبقہ بھی بدنام ہوتا ہے۔ قلمکاروں کو یہ ضرور سوچنا چاہیے کہ غلط لکھنا نہیں بلکہ سرقہ کرنا گناہ ہے۔ مسجع، مقفی، مرصع جملوں سے وہ شکستہ اور ٹوٹے ہوئے جملے لاکھ درجہ بہتر ہیں جن میں فنکار کا اپنا خون جگر شامل ہوتا ہے۔ سرقہ کی حرکت کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جانی چاہیے، کیونکہ اس کا دائرہ بڑھتا جائے گا تو دشواریاں اور بڑھتی جائیں گی۔

قارئین! اردو دنیا کے اس شمارے میں ادب اطفال: ماضی اور حال کے عنوان سے ایک گوشہ دیا جارہا ہے۔ یہ گوشہ غیر ارادی طور پر ترتیب پا گیا کیونکہ اس تعلق سے اتنے مضامین آگئے تھے کہ اسے گوشے کی صورت میں شائع کرنا پڑا۔ دراصل آج کے عہد میں ادب اطفال پر توجہ دی جانے لگی ہے اور ادب اطفال سے جڑے ہوئے قلمکاروں کی ان شکایات کا ازالہ بھی کیا جارہا ہے کہ ان لوگوں کی نہ خاطر خواہ پذیرائی ہوتی ہے اور نہ ہی انھیں انعامات و اعزازات سے نوازا جاتا ہے، جبکہ یہی وہ قلمکار ہیں جو ہماری بنیادوں کو مضبوط کرتے ہیں اور نئے قاری اور قلمکار پیدا کرتے ہیں، زبان و ادب سے بچوں کا رشتہ جوڑتے ہیں مگر انھیں ہی نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ ان کی بعض شکایتیں بجا بھی ہیں کہ بڑے ادیبوں پر رسائل و جرائد میں بکثرت مضامین تو شائع ہوتے ہیں مگر بچوں کے ادیبوں کو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ اس کے علاوہ ادب اطفال سے جڑے ہوئے اور بھی بہت سے مسائل ہیں جن پر معروضی انداز میں گفتگو ہونی چاہیے اور ان کے مسائل و مشکلات کے ازالے کی کوشش کی جانی چاہیے۔

شیخ عقیل احمد

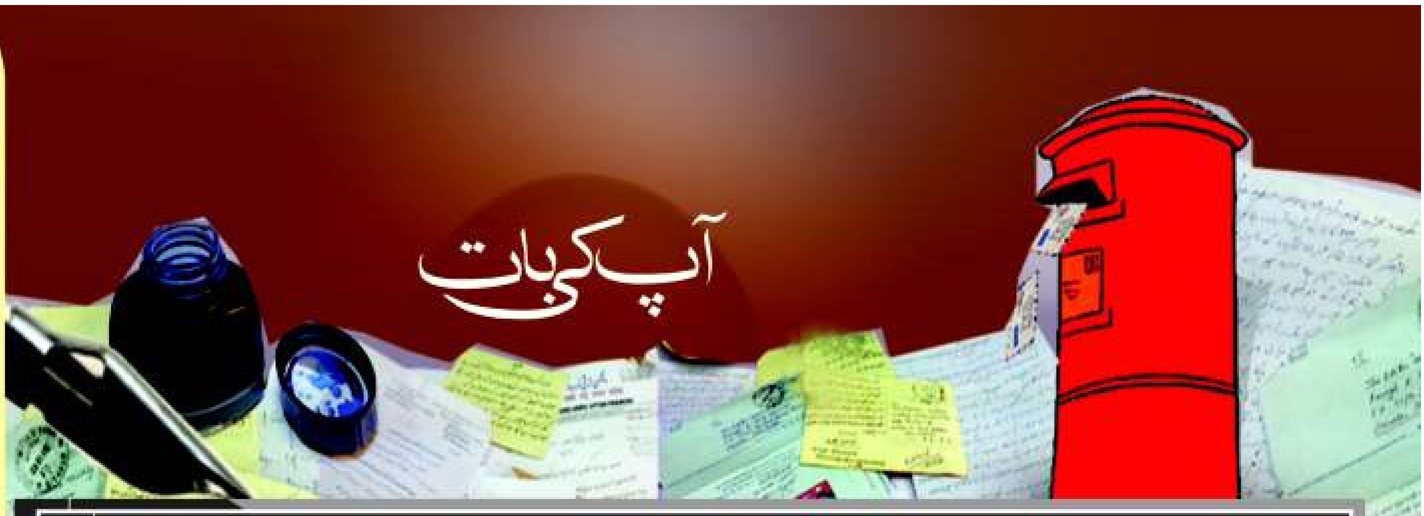

آپ کی بات

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

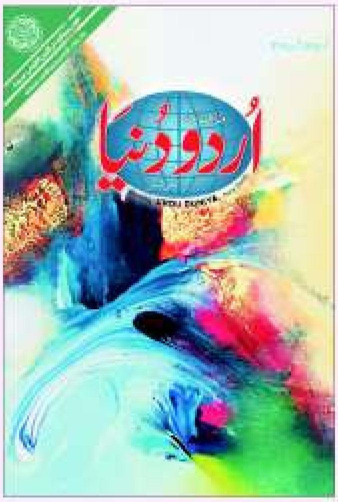

ماہنامہ 'اردو دنیا' ستمبر کا تازہ شمارہ پڑھنے کو ملا۔ مجھے غلام محمد انصاری صاحب کے مضمون 'اردو غزل 1950 کے بعد' کے حوالے سے یہ کہنا ہے کہ محمد انصاری صاحب نے تھوڑی اور تحقیق کی ہوتی تو کچھ شاعر جوان سے چھوٹ گئے کم از کم انھیں شامل کر کے گجرات کے شاعروں کے ساتھ انصاف کیا جاسکتا تھا۔ محشر سولہ پوری، اختر حسین اختر اور بھی نہ جانے کتنے شاعر ہیں جن کے شعری مجموعے گجرات ساہتیہ اکادمی سے شائع ہوئے ہیں۔ تحقیقی مضمون میں تساہلی سے یونیورسٹی کے طلبا پر منفی اثر پڑ سکتا ہے۔

❖ ڈاکٹر صفیہ بانو: گجرات

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی رسالہ اگست 2020 اور اپریل 2020 باصرہ نواز ہوا۔ سرورق حسب موقع دیدہ زیب اور معنی خیز ہے۔ ممنونم...... تمام مشمولات نہایت عمیق مطالعے اور تخلیقی زرخیزی کا بین ثبوت ہیں۔ اداریہ نہایت پر مغز اور غور وفکر سے مزین ہے۔ اردو کی تمام شعری ونثری اصناف جدید تقاضوں کو پورا کرتی ہیں۔ 'شب خون' کی چالیس سالہ ادبی خدمات ایک اہم کارنامہ ہے۔ اپریل کا شمارہ کئی اہم نصابی سرگرمیوں اور موضوعات پر مبنی ہے۔

'اردو دنیا' اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور علمی وادبی نیز سائنس وتکنالوجی کی جدید ترین معلومات کے ساتھ اذہان ودل کو تقویت عطا کر رہا ہے اور تازہ ترین اطلاعات سے ذہنی دریچوں کو تر وتازہ کر رہا ہے۔ مئی جون اور جولائی 2020 کے تینوں شمارے بیک وقت باصرہ نواز ہوئے۔ الحمدللہ! خوبصورت اور دیدہ زیب سرورق، پر مغز اداریہ، اعلیٰ تعلیمی نصاب کے تمام تر مقتضیات ونصاب سے وابستہ موضوعات سے مزین، اعلیٰ منزلوں کو سر کرتا ہوا 'اردو دنیا' دنیائے علم وادب کا خوبصورت گلدستہ ہے۔ تمام مشمولات، نہایت عمدہ، معیاری اور جدید تحقیق کے آئینہ دار ہیں۔

❖ ڈاکٹر رضوانہ ارم: صدر شعبۂ اردو، جمشید پور وومنس کالج، جمشید پور، جھارکھنڈ

جولائی ماہ کے شمارے کے مضامین کا انتخاب مدیر اور مشیر صاحبان کے ذوق سلیم کا واضح ثبوت ہے، تاہم میں لسانیات میں رغبت رکھنے کے باعث فاضل ادیب غضنفر کے مقالے زیرِ عنوان 'آئینۂ اردو میں دوسری زبانوں کا عکس' کا شیدائی ہو کر رہ گیا ہوں۔ سیکڑوں مضامین کے مطالعے اور سالہا سال گزر جانے کے بعد لفظیات کی اتنی زیادہ نیرنگی، سحر کاری اور رنگینیِ جمال دیکھنے کو ملی ہے۔ اس مضمون میں غالب اور اقبال کے اشعار کا برمحل استعمال بھی قابلِ دید وداد ٹھہرتی ہے۔

اس مقالے کے بعد محترمہ ڈاکٹر نصرت امین نے بھی اپنے مضمون زیرِ عنوان 'اردو زبان وادب پر فارسی زبان وادب کے اثرات' کے تحت موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ صفحہ 10 پر اول کالم کی اول سطر میں مستعمل ہندی لفظ 'سور ینگی' کی بجائے صحیح لفظ 'شور ینگی' درکار تھا۔ عربی زبان کا ایک لفظ ہے 'خبر'، جس کی جمع 'اخبار' ہے۔ یہ واحد لفظ ایسا ہے، جس کی جمع 'اخبارات' بہت سے اخبار کے معنی میں مروج ہے۔ اسی طرح اس ناچیز کے خیال میں صفحہ 10 پر 'چوں کہ' کو 'بلکہ'، 'جبکہ' اور 'حالانکہ' کی مانند ملا کر 'چونکہ' کی صورت میں لکھنا زیادہ صحیح ہوتا۔ اردو زبان کے دروبست کی چرچا کرتے ہوئے مصنفہ ڈاکٹر نصرت امین کو خالص ہندی نژاد والی آوازوں کا شمار کرتے ہوئے 'ڈھ' لفظ کو بھی شامل کرنا چاہیے تھا۔ ان معدودے چند استثنا سے قطع نظر یہ مقالہ اردو زبان پر فارسی زبان کے اثرات کو بخوبی ثابت کرتا ہے۔

اگست ماہ کے شمارے کے اداریے میں آپ نے آزادیِ ہند کے محرک چند اشعار درج کیا ہے۔ بِٹھور (کانپور) میں نانا صاحب پیشوا کے قابل وزیر جناب عظیم اللہ نے بہادر شاہ ظفر کے نواسے (دو بیٹے) مرزا بیدار بخت کے ساتھ مل کر بادشاہ کی رضامندی سے باغی

فوجیوں کے حق میں دہلی سے 'پیامِ آزادی' کے نام سے ایک اخبار نکالا تھا۔ اس اخبار کے ہر ایک شمارے کے سرورق پر عظیم اللہ خاں کا تحریر کردہ ایک نغمہ 'اُو پر برفیلا پربت پہریدار ہمارا' شائع کیا جاتا تھا جس کی تحریک پر علامہ اقبال نے 'سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا' جیسے قومی ترانے کی تخلیق کی۔ اس کی شروعاتی سطور تھیں:۔ ''ہم ہیں اس کے مالک، ہندوستان ہمارا/ پاک وطن ہے قوم کا، جنت سے بھی پیارا۔'' بعد میں بیدار بخت کو پھانسی دے دی گئی تھی اور اخبار کے جس شمارے میں وہ نغمہ شائع ہوا تھا، اس کی تمام کاپیاں ضبط کر لی گئی تھیں۔ برطانوی میوزیم میں آج بھی اس اخبار کی ایک کاپی محفوظ ہے۔

اگست کے اسی شمارے میں بہادر شاہ ظفر کے استاد اور شہرۂ آفاق شاعر شیخ محمد ابراہیم ذوق پر امتیاز رومی کا مضمون زیرِ عنوان 'ذوق کا رنگِ سخن: اعجاز و امتیاز' اچھا مضمون ہے۔

ذوق کے اشعار کا اثر ہندی فلموں کے مکالموں پر دیکھا جاتا ہے۔ مثلاً کسی فلم میں کامیڈی اداکار پریم چوپڑا کا ایک مکالمہ قابل غور ہے: ''میں وہ بلا ہوں جو شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔'' دراصل ذوق کے شعر سے ماخوذ ہے: ''نازک خیالیاں میری توڑیں عدو کا دل/ میں وہ بلا ہوں شیشے سے پتھر کو توڑ دوں۔''

❖ **ڈاکٹر کرشن بھاؤک** : کوٹھی نمبر 201-A، گورونانک نگر، گلی نمبر 18-K، 201-A، پٹیالہ (پنجاب)

جون 2020 اردو دنیا کا شمارہ ہمہ دست ہوا۔ اداریے میں مدیر نے کورونا وائرس سے مرتب ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کیا ہے۔ اسلم جمشید پوری نے آن لائن اردو تدریس پر اچھا مضمون لکھا ہے جس سے انھوں نے آن لائن طریقۂ تدریس کے حوالے سے اہم اشارات کیے ہیں۔ مصباح انظر نے اپنے مضمون میں بنیادی تدریسی مہارتوں پر روشنی ڈالی۔ ابوبکر عباد نے اردو زبان تلفظ کا مسئلہ اور نئی نسل میں املا اور تلفظ کی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے۔ ای آر محمد عادل نے اردو ادب کی تلمیحات کا سائنس کے آئینے میں جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اردو غزل میں سائنسی اشارات پر اشعار پیش کر کے تجزیہ کیا ہے۔ مرقع دہلی نثری جمالیات کا مرقع ہے اس میں مرزا داغ دہلوی کی حیات اور کلام کو موضوع بنایا گیا ہے۔ صحافیوں کے لیے ضابطہ اخلاق موجود ہے لیکن عمل ندارد ہے۔ صحافت میں لفافہ کلچر آگیا ہے اقدار پر مبنی صحافت کا فقدان ہے۔ عبدالسلام صدیقی نے چکبست کی شاعری میں حب الوطنی کے عناصر پر عمدہ مضمون تحریر کیا ہے۔ یہ پرچہ اردو داں طبقے کو جدید و عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کر رہا ہے اور اردو کی عصری ترقی کے لیے کوشاں ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' جولائی 2020 کا شمارہ بھی موصول ہوا۔ زیرنظر شمارے کے اداریے میں اردو زبان و ادب کے فروغ کے تعلق سے عمدہ باتیں لکھی ہیں کہ فنکار، ادبا شعرا اور اساتذہ اردو کی نئی نسل کی تربیت کریں۔ چراغ سے چراغ جلتا رہے گا اور ہمارا مستقبل حال سے بھی زیادہ روشن اور تابناک ہوگا۔ آپ کی بات کالم سے شمارے کی قدر و قیمت کا تعین ہوتا ہے۔ غضنفر نے آئینہ اردو میں دوسری زبانوں کا عکس میں عربی، فارسی، سنسکرت، ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کے اثرات کا اچھا جائزہ لیا ہے۔ محمد قمر سلیم نے اپنے مضمون 'مفکر فریری اور مکالمے کی تکنیک میں تعلیم و تدریس پر زور دیا اور لکھا ہے کہ مکالموں کے ذریعے بھی تعلیم دی جائے۔ نوشاد حسین کا مضمون 'ادبی سرقہ کیا ہے' میں ادبی چوری کے مختلف پہلوؤں سے بحث کی ہے اور لغوی و اصطلاحی معنی پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ زیبا محمود نے مہدی افادی کی انفرادیت میں ان کے فکر و فن و تخلیقات پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے کہتی ہیں کہ مہدی افادی بڑے لطافت پسند اور حسن پرست واقع ہوئے۔ ان کا موقف تھا کہ جو شے حسین ہے میری رشتہ دار ازلی ہے۔ محمد اسد اللہ لکھتے ہیں انجم مانپوری نے مزاحیہ کردار نگاری میں بھی اپنے فن کا کمال دکھایا ہے۔ اردو کے طنزیہ و مزاحیہ کرداروں میں رتن ناتھ سرشار کا میاں خوجی، منشی سجاد حسین کا حاجی بغلول اور امتیاز علی تاج کا چچا چھکن اور مانپوری کا میر کلو کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ عمرانہ خاتون نے اردو شاعری میں برسات کے عنوان سے ادب کی نشاندہی کی ہے۔ اردو شاعری میں موسم برسات پر جو نظمیں کہی گئی ہیں ان میں نہ صرف فطرت کی بہترین عکاسی موجود ہے بلکہ موسم برسات کے مختلف مناظر بھی دلکش انداز میں پیش کیے گئے ہیں۔ البیرونی کی خوبیوں اور علمی و تحقیقی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ وہ اپنے عہد کا مورخ، عظیم سائنس داں، فلسفی، مختلف زبانوں کا عالم، علم ہیئت و نجوم کا ماہر اور تقابل ادیان کے جانبدارانہ مطالعے کا بنیاد گزار تھا۔ ابرار اجراوی نے شین مظفر پوری: صحافت نصف صدی کا قصہ، محمد مبارک حسین: عہد اکبری میں علوم و فنون اور تہذیب و ثقافت کی صورت حال، معین الدین شاہین: ساغر اجمیری فکر و فن کے آئینے میں، معین الدین عثانی: فاضل انصاری اپنی شعری کائنات کے آئینے میں، سید محبوب قادری نظامی: رضا وصفی ایک منفرد لب و لہجے کا شاعر، شاہد اختر انصاری: ڈاکٹر ایم اے حق سے گفتگو، ملک شمس الدین: فن عروض اور ہماری ذمے داریاں، رشدہ شاہین: ڈاکٹر سیدہ جعفر کے تحقیقی کارنامے، انیس امروہوی: اشوک کمار، ایم ایس ایکسل پر کام شروع کرنا، کتابوں کی دنیا، تعارف و تبصرہ، خبرنامہ قابل ذکر ہیں۔ اس شمارے کا تجزیہ کیا جائے تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ رسالہ عصر حاضر میں اہم کردار نبھا رہا ہے۔ اردو کو عصری ٹکنالوجی، ماحول سے مربوط کر رہا ہے۔ 100 صفحات کے شمارے میں اردو قاری کو زبان و ادب اور کمپیوٹر و ٹکنالوجی کے بارے میں بھرپور آگہی حاصل ہوگی۔ یہ ہندوستان میں اردو کا عصری جدید ادارہ ہے۔ اس کے کردار و اوصاف کو سب پر عیاں کریں اس کی جانب سے شائع ہونے والا اردو مواد معیاری معتبر اور مستند مانا جاتا ہے۔ اردو قارئین اس کو پڑھیں، گھر پر منگوائیں تو اردو کی ترویج ترقی ہوگی۔

ڈاکٹر محمد ناظم علی: مکان نمبر 335-7-17، برہمن واڑی، یاقوت پورہ، حیدرآباد، تلنگانہ

ادھر آپ کے تمام رسائل کی رنگت بدل گئی ہے۔ مضامین میں تنوع ہے۔ یہ آپ اور آپ کے لائق معاونین کی کوششوں کا نتیجہ ہے۔

❖ **عظیم اقبال**: ادبستان، گنج نمبر 1، بتیا۔ 845338، بہار

پہلی تخلیق پہلا تاثر

کسی بھی رسالے میں جب آپ کی تخلیق شائع ہوتی ہے تو آپ کو بے انتہا مسرت کے ساتھ ایک نئی تحریک بھی ملتی ہے۔ ماہنامہ 'اردو دنیا' میں جب آپ کی تخلیق پہلی بار شائع ہوئی تو آپ کو کیسا محسوس ہوا؟ آپ اپنے خیالات لکھ کر ہمیں بھیجیں اور یہ بھی ضرور لکھیں کہ آپ کی ذہنی اور تحریری تربیت میں ادبی رسائل کتنا اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ذرا سوچیے! اگر یہ رسالے نہ ہوتے تو...؟

زبان اور زمینی صورت حال

قاضی مشتاق احمد

...تو پھر اردو کا مرثیہ کون لکھے گا؟

اردو رسائل میں اردو زبان کے تعلق سے جو بھی گفتگو ہوتی ہے ان سے حقیقی صورتِ حال کا ادراک نہیں ہوپاتا۔ زبان کی زمینی صورت حال کیا ہے اس سے آگہی کے لیے ضروری ہے کہ تحریکات و رجحانات کے بجائے ان بنیادی مسائل پر توجہ دی جائے جن کا زبان کے فروغ اور تحفظ سے تعلق ہے۔ عموماً اردو کے حقیقی مسائل سے اجتناب کیا جاتا ہے اور یہ جاننے کی کوشش نہیں کی جاتی کہ کن کن علاقوں میں اردو کی حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں سوال نامے کے ذریعے دراصل اردو زبان کے بنیادی مسائل سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جارہی ہے تاکہ یہ اندازہ ہوسکے کہ ملک کے مختلف علاقوں میں تعلیم، تدریس اور دیگر سطحوں پر اردو زبان کی صورت حال کیا ہے اور وہاں کس طرح کی دشواریاں اور مشکلات پیش آرہی ہیں۔ جب تک اردو زبان کے بنیادی مسائل پر سنجیدگی سے غور نہیں کیا جائے گا تب تک اردو زبان کے تحفظ اور بقا کے لیے مربوط لائحہ عمل تیار کرنا مشکل ہوگا۔

قاضی مشتاق احمد اردو کے معروف ادیب ہیں۔ 70 سے زائد کتابیں آپ کے قلم سے وجود میں آچکی ہیں۔ اردو شاعری میر سے پروین شاکر تک، اردو نثر ایک مطالعہ، جس نے یوروپ نہیں دیکھا جیسی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ آپ ایک معروف ڈرامانگار بھی ہیں اور آپ کے ڈرامے اسٹیج پر بھی پیش کیے جاتے رہے ہیں۔ ادبِ اطفال میں بھی آپ کی گراں قدر خدمات کا اعتراف پوری دنیا کرتی ہے۔ کئی اہم اداروں اور تنظیموں نے انھیں انعامات سے بھی نوازا ہے۔

سوال: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

جواب: بنیادی وجہ یہ ہے کہ خود اس زبان کے بولنے والے اپنی زبان سے بے اعتنائی برتتے ہیں۔ اردو زبان کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ اگر اردو مر بھی گئی تو اس کا مرثیہ اردو میں لکھا جائے گا لیکن جب اُردو رسم الخط سے واقف نسل ہی نہیں رہے گی تو مرثیہ کون لکھے گا؟ ماہر لسانیات ڈاکٹر اروند کالا کے مطابق ''آج دنیا میں 6500 تا 6800 زبانیں اور بولیاں بولی جاتی ہیں۔ ان میں زیادہ تر زبانیں اپنا وجود کھونے کے درپہ ہیں کیونکہ ہر دو ہفتے میں ایک زبان مر رہی ہے۔'' موصوف نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا ہے کہ اگر یہی حال رہا تو درجنوں ہندستانی زبانیں بھی اپنا وجود کھودیں گی۔ جدید ٹکنالوجی نے ساری دنیا کو ایک عالمی گاؤں میں تبدیل کردیا ہے۔ عالم کاری کی وجہ سے زبانوں میں بڑھتی ہوئی رقابت بھی ایک وجہ ہوسکتی ہے۔

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ اختیار کیا جانا چاہیے؟

ج: نئی نسل جو اپنی مادری زبان کے رسم الخط سے دور ہوتی جارہی ہے انھیں ان کی زبان کا رسم الخط سکھانے کا معقول انتظام کیا جائے۔ جس طرح دیوناگری (رسم الخط) کو عام کرنے کے لیے دکانوں اور ہوٹلوں کے سائن بورڈ تک صرف دیوناگری میں لگانے کی تحریک چلائی گئی اور اس میں کامیابی بھی ملی۔ اس سے لوگ خود بخود ہندی زبان کی طرف راغب ہوگئے۔

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

ج: چولی دامن کا۔ زبان تہذیب وثقافت کا جز ولاینفک ہے۔ مراٹھی زبان کے نامور مزاح نگار پی۔ کے۔ اترے کہا کرتے تھے کہ'' تاریخ صرف مہاراشٹر کی ہے باقی علاقوں کا صرف جغرافیہ ہے۔'' اس طرح 'مراٹھی تہذیب وثقافت' کو زبان سے جُوڑنے کا عمل شروع ہوا اور اس سے زبان کو فروغ حاصل ہوا۔ اپنی زبان اور اپنی تہذیب پر فخر کرنا کوئی بری بات نہیں ہے۔

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

ج: بے شک چونکہ خاندانی وراثت کے تمام دستاویز۔ قانونی کاغذات۔ متعلقین کی زبان میں موجود ہیں۔ جب اس زبان کو جاننے والے ہی نہ ہوں تو انسانی وراثت کا تحفظ کیسے ہوگا۔

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

ج: جی ہاں۔ اب اردو کی ہی مثال لے لیجیے۔ اردو میں سائنسی اور سماجی موضوعات کی صحافت میں کمی پائی جاتی ہے۔ اس لیے قارئین انگریزی اور علاقائی زبانوں کے اخبارات و رسائل کی جانب متوجہ ہوتے ہیں اور آج یہ عالم ہے کہ اردو مائل بہ زوال ہے۔ سرسید احمد خان نے رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا اجراء اُردو والوں (اور خصوصاً مسلمانوں) کی سائنسی اور سماجی موضوعات کی جانب بے رغبتی کو کم کرنے کے لیے کیا تھا۔ غنیمت ہے کہ 'اردو دنیا' جیسے اور دو۔ چار رسائل ہی اُردو معاشرے کو اس طرف راغب کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

ج: ٹیلی ویژن کے بعض چینلز غلط لب ولہجے کا استعمال کرکے اس زبان کی شیرینی میں 'نیم کا رس' گھول رہے ہیں لیکن کسی خوبصورت چہرے کو مسخ کرنا ممکن نہیں۔ ہاں اگر کوئی تیزاب ڈال کر چہرہ مسخ کرنے کی کوشش کرے تو اور بات ہے۔ تیزاب 'لسانی تعصب' کا بھی ہوسکتا ہے۔

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

ج: تشویشناک۔ کیونکہ خود اُردو والے اپنی زبان کے فروغ و بقا سے بہت کم دلچسپی لے رہے ہیں۔ بے مقصد سمینار، غیر معیاری مذاکرے، فضول کی بحث اور جُوتم پیزارنے اُردو والوں کو غیر اُردو طبقے میں مذاق کا موضوع بنا دیا ہے۔ اُردو اخبارات، رسائل، کتابیں چھپتی تو ہیں مگر کوئی خریدار نہیں۔ سرکاری اعداد و شمار کے مطابق جب گزشتہ پچاس سال میں اُردو بولنے والوں کی تعداد 5/کروڑ 15/لاکھ 36/ہزار 111/ہوگئی ہے تو پھر کیا بات ہے کہ ہماری زبان کے اخبارات، رسائل و کتابوں کی تعداد سکڑ کر 250 یا 500/رکیوں ہوگئی؟ برقی میڈیا کی یلغار کا رونا فضول ہے۔ کتنے فی صد اُردو والے اس کا استعمال کرتے ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ علاقائی زبانوں کے اخبارات و رسائل کی تعدادِ اشاعت میں اضافہ ہوتا جارہا ہے جبکہ اُردو رسائل و اخبارات یکے بعد دیگرے بند ہو رہے ہیں۔ (شب خون، شمع، بانو، کھلونا، روبی وغیرہ)

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کے روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

ج: بین الاقوامی 'یوم مادری زبان' ہر سال 21 فروری کو منایا جاتا ہے۔ اُردو ہماری مادری زبان ہے۔ ایک مفکر کا قول ہے کہ ''ہر زبان عمارتوں کا ایک ایسا شہر ہوتی ہے جس کا معیار ہر شہری ہوتا ہے۔'' جہاں تک اُردو والوں کا تعلق ہے چند تعلیمی اداروں کے رسمی پروگراموں کے علاوہ ابھی تک ہمارے یہاں 'یوم مادری زبان' منانے کا ماحول نہیں بنا ہے۔ اس دن کا استعمال زبان کی سطح پر جو بگاڑ ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کیا جاسکتا ہے۔ برقی میڈیا کی وجہ سے جو ایک نئی اُردو عالم وجود میں آئی ہے اسے 'ذی اردو' کہتے ہیں۔ یہ ایک سنہرا جال ہے جو اُردو زبان کو گھیرنے کے لیے پھیلایا گیا ہے۔ اس زبان میں 'ز' جبان (زبان) جادتی (زیادتی) جمین (زمین) اجاجت (اجازت) جیسے الفاظ دھڑلے سے استعمال کیے جارہے ہیں۔ خصوصاً دیہی علاقوں میں غیر اردو معاشرے میں زبان کا یہ بے لگام وائرس پھیلتا جارہا ہے۔ اگر ابتدائی سطح سے ہی خصوصاً اردو پڑھانے والے اساتذہ اس پر توجہ دیں تو اس بگاڑ کو روکا جاسکتا ہے۔ صوفیائے کرام کے مزاروں، درگاہوں، خانقاہوں اور مساجد میں جو سائن بورڈ اُردو میں لکھے جاتے تھے۔ اب وہاں بھی دیوناگری آگئی ہے۔ کیا اس علاقے میں کوئی اُردو والا صحیح رسم الخط کے ساتھ اُردو اعلانات، اوقات نماز، چندہ کی تفصیلات سائن بورڈ پر لکھنے کے لیے تھوڑا سا وقت بھی نہیں نکال سکتا؟ اردو صحافت کا المیہ یہ ہے کہ اس مقدس پیشے میں بڑی تعداد میں بہت سے کم پڑھے لکھے لوگ گھس آئے ہیں جو 'لنگوٹی چھاپ' اخبارات و رسائل نکال کر زبان کو بگاڑ رہے ہیں۔ پڑھے لکھے ڈگری یافتہ میں بیشتر تو ادب و زبان کے معاملے میں 'لاتعلق' ہوتے ہیں اور جو تھوڑا بہت عمل دخل رکھتے ہیں انھیں اُردو زبان میں کوئی خوبی نظر نہیں آتی۔

س: کیا اُردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رُک سی گئی ہے؟

ج: یہ تو قومی کونسل اور چند اکادمیوں کا کرم ہے کہ ادب پر اچھی کتابیں ان کی مالی اعانت سے شائع ہو رہی ہیں لیکن وہ محض لائبریریوں کی زینت بن کر رہ جاتی ہیں۔ اُردو ادب کے 'پیشہ ور' ناقدین ذہنی طور پر مغربی ادبیات سے متاثر ہیں۔ اس لیے وہ نہ تو ان کتابوں کو خود پڑھتے ہیں اور نہ اپنے طالب علموں کو 'ہندستانی' کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ اس سے ہماری زبان کا ادبی اثاثہ صحیح قارئین تک نہیں پہنچ رہا ہے۔ بعض لائبریریوں میں کتابیں خریدنے کے لیے کلاس فور حضرات کو بھیجا جاتا ہے جنھیں ادب سے نہیں 'کمیشن' سے دلچسپی ہوتی ہے۔ اس لیے غیر سرکاری ایجنسیوں نے اُردو زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت قریباً بند کردی ہے۔

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

ج: بشرطیکہ یہ گفتگو سنجیدہ طبقے میں ہو۔ عوامی طور پر گفتگو سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا کیونکہ سطحی ذہنیت والے صرف ہلکی پھلکی باتوں میں دلچسپی رکھتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے اُردو میڈیم اسکول ہیں اوران میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

ج: پونے شہر میں 19 اردو ہائی اسکول قائم ہیں اور پونے میونسپل کارپوریشن کے تحت 27 اردو پرائمری اسکولز، خانگی انتظامیہ کے تحت اردو مدارس کی تعداد 20 ہے۔ پونے ضلع کے مختلف مقامات پر بھی اردو پرائمری اور ثانوی مدارس ہیں۔ اساتذہ کی صحیح تعداد معلوم نہیں لیکن اندازاً دو ڈھائی سو کے قریب ضرور ہوں گے۔ مہاراشٹر سرکار نے پرائمری اسکولوں کے اساتذہ بھرتی پر اِسٹے دیا ہے اس لیے سیکڑوں کی تعداد میں ڈی۔ایڈ (ڈپلومہ) لیے نوجوان بھرتی ہونے کی امید میں دس۔ بارہ سالوں سے خالی بیٹھے ہیں۔ دیہی علاقوں کے غیر اُردو ڈی۔ ایڈ نوجوان نے بیکاری سے تنگ آکر مزدور کی حیثیت سے کام شروع کردیا ہے لیکن اُردو والے بیشتر 'تصوّر جاناں کیے ہوئے' بیکاری، تعصب، اقربا پروری کا رونا کیے یا تو شاعری کررہے ہیں یا والدین پر بوجھ بنے 'افسانوی گروپس' میں شامل ہوکر وقت گزاری کررہے ہیں انھیں اتنی بھی توفیق نہیں ہوتی کہ کم از کم سلم ایریا میں جاکر اسکول میں نہ جانے والے یا ڈراپ آؤٹ طلبہ کو خالی پڑے اُردو اسکولوں میں لانے کی کوشش کریں (یہ سب مہاراشٹر کے حوالے سے کہہ رہا ہوں) میں اپنے کالموں اور مضامین میں گنگا پور (ضلع مرشد آباد) کے بابر علی کا ذکر کرتا ہوں جس نے گاؤں کے کھلے آسمان کے نیچے اِدھر اُدھر بھٹکنے والے بچوں کو جمع کرکے پڑھانا شروع کیا۔ اس کے لیے وہ روزانہ 60 رکلومیٹر کا سفر کچی پکی سڑکوں پر طے کرتا تھا۔ جی پی سی نے بابر علی کو 'دنیا کا سب سے کم عمر ہیڈ ماسٹر' قرار دیا ہے۔ کرناٹک کے پری یونیورسٹی کورس میں ان پر ایک سبق شامل کیا گیا ہے۔ جولائی 2012 کے ٹی وی شو 'ستیہ میو جیتے' میں انھیں بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ آج بابر علی کا اسکول کھلے آسمان سے پکّی عمارت میں آ گیا ہے جہاں تین سو سے زائد طلبہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات ورسائل آتے ہیں؟

ج: پونے شہر کو 'مشرق کا آکسفورڈ اور دکن کا علی گڑھ' کہا جاتا ہے۔ اس لیے یہاں بے شمار لائبریریاں ہیں۔ جہاں تک اُردو کا تعلق ہے دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ کے زیر اہتمام ایک شاندار لائبریری اور ریڈنگ روم ہے جہاں بڑی تعداد میں شائقین ادب آتے ہیں۔ اس کے علاوہ مضافاتی علاقوں میں کھڑکی میں 'ہمدرد لائبریری'، کونڈوا، ہڑپسر، ایروڈا میں لائبریریاں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ہر پرائمری اسکول، ہائی اسکول اور کالج میں لائبریری موجود ہے۔ کونڈوا میں اپنا فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ایک لائبریری اور ریڈنگ روم ہے۔ یہاں کی میونسپل کارپوریشن، اعظم ٹرسٹ، عوامی محاذ، تنظیم والدین جیسے ادارے ان کی اعانت کرتے ہیں۔ پونا کالج میں اردو کے شعبے کے تحت اچھا کام ہورہا ہے۔ پونے میں کوٹھاری کمیشن کی سفارشات کے مطابق نصابی کتابیں تیار کرنے کے لیے 'بال بھارتی' نامی ادارہ قائم ہے۔ یہاں کی لائبریری میں بھی کتابوں کا ذخیرہ ہے۔ پونے میں اُردو زبان کے بیشتر اخبارات و رسائل آتے ہیں۔ قومی کونسل کی موبائل وین کا پونے میں ہمیشہ گرمجوشی کے ساتھ خیر مقدم کیا جاتا ہے۔

س: آپ کے علاقہ میں کتنی اُردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور کس نہج پر اُردو کے فروغ کے لیے کام کررہے ہیں؟

ج: چند اداروں کے نام میں پہلے ہی گنوا چکا ہوں۔ بہر حال دکن مسلم انسٹی ٹیوٹ، ہمدرد لائبریری، پونا کالج، عابدہ انعامدار کالج، اپنا فاؤنڈیشن، عوامی محاذ، انجمن ترقی اردو ہند (پونے) رسک متر منڈل، اعظم کیمپس کے زیر اہتمام 'بزم ادب'، تنظیم والدین اردو مدارس ضلع پونے' ادبی نشستوں کے انعقاد کے علاوہ اردو کتابوں کے اجراء اور نمائشوں کے ذریعے اردو کے فروغ کے لیے کام کررہی ہیں۔

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوشش کررہے ہیں؟

ج: میں تصنیف و تالیف اور ڈرامہ نویسی کے ذریعے مقامی سطح پر بھی اردو کے فروغ و بقا کے لیے کوشش کررہا ہوں۔ سرکاری ملازمت (بحیثیت ایڈیشنل ڈائریکٹر محکمۂ سماجی بہبود) میں نے سرکاری سطح پر انسداد منشیات کے تحت اُردو زبان میں مذاکرے، شعری نشستیں، نکّڑ ڈرامے، فل لینتھ ڈرامے مقامی اور ریاستی سطح پر پیش کیے۔ میں جس غیر اردو علاقہ (آئی سی ایس کالونی) میں رہتا ہوں وہاں کی سرگرم عمل ثقافتی انجمنوں، محلّہ کمیٹی، سینئر سٹیزن کلب کے تحت اُردو زبان میں مذاکرے، ڈرامے، ادبی نشستیں منعقد کرنے میں پہل کی اور یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس علاقے میں موجود ویکنٹھ مہتہ نیشنل انسٹی ٹیوٹ آف کوآپریٹیو مینجمنٹ (جہاں ملک اور بیرون ملک کے طلبہ زیر تعلیم ہیں) کے تعاون سے اُردو ڈرامے، شب غزل، سمینار منعقد کرائے۔ (قومی کونسل کی مالی اعانت سے اس ادارے نے سہ لسانی (اردو۔ ہندی۔ مراٹھی) مذاکرے منعقد کیے۔ پونے شہر اور مہاراشٹر کے دوسرے شہروں میں 'آئیڈیا' ڈرامہ اکادمی کے تعاون سے غیر اردو علاقوں میں اردو ڈرامے (مرزا غالب کی حویلی، آزاد کا خواب، شہید بھگت سنگھ، مہاتما جیوتی راؤ پھلے، بیگم جان کا شوہر وغیرہ) پیش کرکے غیر اردو شائقین کو اردو زبان و ادب کی شیرینی سے متعارف کرایا۔ غیر اردو علاقوں تک اردو زبان کو پہنچانے کے لیے مقامی تعلیمی اور ثقافتی اداروں کے تعاون سے 'اردو ساہتیہ پریشد' کے قیام میں جدوجہد کی اور اس کے نتائج امید افزا نظر آئے۔ اردو رسم الخط سیکھنے کے لیے سید آصف نے باقاعدہ کلاسیس چلائے بلکہ انھیں عروض سے بھی متعارف کرایا۔ شائقین ادب کی فرمائش پر اپنے ڈرامے دیوناگری رسم الخط میں (اردو لب و لہجہ قائم رکھتے ہوئے) چھپوائے۔ اردو تھیٹر کے فروغ و بقاء کے لیے دن رات ایک کردیے۔

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

ج: اردو بولنے والوں کی نئی نسل اردو رسم الخط سے دور ہوتی جارہی ہے۔ اس مشن کو ایک تحریک بنا کر اردو معاشرے کو جگانے کی ضرورت ہے۔ سبکدوش مدرسین کو جز وقتی محنتانہ دے کر اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ تعلیمی ادارے اور ثقافتی انجمنوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ اردو معاشرے میں ایسی بہت سی پڑھی لکھی خواتین ہیں جو کوئی جاب نہیں کرتیں، وہ بھی کافی مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔ خواتین کو گھر سے باہر جاکر غیر نصابی کتابیں حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے اس لیے 'گشتی لائبریری' قائم کرنا ضروری ہے۔ قلیل ماہانہ فیس حاصل کرکے خواتین کو ممبر بنایا جاسکتا ہے۔ اردو میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے والے طلبا و طالبات کو مناسب ٹریننگ دے کر اس کام کے لیے راضی کیا جاسکتا ہے۔ خواتین کے لیے خصوصی طور پر بیت بازی

> **اردو بولنے والوں کی نئی نسل اردو رسم الخط سے دور ہوتی جارہی ہے۔اس مشن کو ایک تحریک بنا کر اردو معاشرے کو جگانے کی ضرورت ہے۔سبکدوش مدرسین کو جزوقتی محنتانہ دے کر اس میں شامل کیا جاسکتا ہے۔تعلیمی ادارے اور ثقافتی انجمنوں کو آگے آنے کی ضرورت ہے۔ اردو معاشرے میں ایسی بہت سی پڑھی لکھی خواتین ہیں جو کوئی جاب نہیں کرتیں، وہ بھی کافی مددگار ثابت ہوسکتی ہیں۔خواتین کو گھر سے باہر جاکر غیر نصابی کتابیں حاصل کرنے میں دشواری ہوتی ہے اس لیے 'گشتی لائبریری 'قائم کرنا ضروری ہے۔**

کے مقابلے، ڈھول پر گائے جانے والے لوک گیتوں کے پروگرام کا اہتمام کیا جائے۔ کہانیاں، گیت، نظمیں لکھنے کے مقابلے ہوں اور کتاب کی صورت میں انعامات دیے جائیں۔خواتین کے لیے مخصوص پروگراموں میں تمام ذمے داریاں خواتین کو سونپی جائے اس میں مردوں کی دخل اندازی یا بالادستی کی کوئی گنجائش نہ ہو۔انسداد منشیات، بیٹی بچاؤ۔ بیٹی پڑھاؤ، شجر کاری جیسے پروگراموں کے ذریعہ اردو زبان کو عام لوگوں تک پہنچانا ضروری ہے۔ کارپوریشن اور ثقافتی وعلمی انجمنوں کی مدد سے دیواروں پر اردو زبان کے اشعار، نعرے، اعلانات لکھے جائیں۔ مسجدوں، درگاہوں اور ثقافتی اداروں میں نوٹس بورڈ پر اردو میں اعلانات لکھنے کی ذمے داری کسی ذمے دار شخص کو سونپی جائے۔سبکدوش مدرسین، طلبا اس کام میں تعاون کرسکتے ہیں۔

س: اردو رسم الخط کی بقاء کے لیے کیا کوششیں کی جاسکتی ہیں؟

ج: قومی کونسل اور اردو اکادمیاں سمیناروں اور مشاعروں پر خرچ ہونے والی مد سے کچھ رقم نکال کر اردو اسکولوں کے مدرسین اور طلبا و طالبات کے لیے صحیح رسم الخط سکھانے کے لیے ورکشاپ منعقد کریں۔ الفاظ کا 'صحیح تلفظ' ہر بنیادی لفظ کے ارکان کو قوسین میں لکھ کر ان پر اعراب لگانے کی ضرورت ہے تاکہ صحیح تلفظ کیا جاسکے۔تذکیر و تانیث کے علاوہ خاص علامتوں کے ذریعے یہ بتایا جائے کہ یہ لفظ کس زبان سے اردو میں آیا ہے۔انگریزی الفاظ انگریزی رسم الخط میں لکھ کر اور جس صورت سے وہ اردو میں مستعمل ہیں، اسی اعتبار سے ان پر اعراب لگائے جانے کا طریقہ۔ اس قسم کے ورکشاپ میں حصہ لینے والے شائقین ادب کو 'خادمِ اُردو' کا تمغہ دیا جائے اور اسے اس مشن کو آگے بڑھانے کی ذمہ داری سونپی جائے۔اس بات کا خصوصی طور پر خیال رکھا جائے کہ اس قسم کے ورکشاپ میں کسی بھی قسم کا تفریحی پروگرام نہ ہو اور نہ ہی اسے کسی اور پروگرام سے جوڑا جائے۔

اساتذہ کی تربیت کے لیے 'ہمدرد ایجوکیشن سوسائٹی' جیسے ذمے دار ادارہ کے زیر اہتمام ایک کورس ترتیب دینے کی ضرورت ہے۔اگر لائحہ عمل تیار ہوجائے اس کا روڈ میپ تیار کرنے میں آسانی ہوگی۔

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اُردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہوسکتی ہیں؟

ج: ہمارے اسکولوں میں ایک نصاب 'خیابانِ حیات' یا 'Garden of Life' کے نام سے رائج ہے۔اس میں مختلف اقدار اور اوصاف کو دلنشین کرنے کے لیے بہت سے دلکش طریقے اختیار کیے گئے ہیں جن میں سے ایک کہانی اور تمثیل ہے۔یہ طریقہ ایسا ہے جسے ماہرین انتہائی کامیابی کے ساتھ برت سکتے ہیں۔اس طریقۂ کار میں ایسے ماہرین کی ضرورت ہے جو اُردو زبان کے علاوہ اپنے علاقے کی علاقائی زبان پر بھی دسترس رکھتے ہوں۔اس طریقۂ کار میں اپنے کثیر المذاہب وکثیر اللسان وطن کی گنگا جمنی تہذیب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔اچھا اُستاد دورانِ تدریس خود کو نصاب تک محدود نہیں رکھتا وہ جو کچھ پڑھاتا ہے اس سے اپنے طالب علموں کے دل میں اور جاننے کی آرزو پیدا کرتا ہے۔اُردو زبان کے بارے میں بہت سی غلط فہمیاں جان بوجھ کر پیدا کی گئی ہیں۔عام خیال یہ ہے کہ اُردو شعر و ادب میں محض عشق، محبت، انتہا پسندی اور تشدد کی باتیں ہیں۔اس غلط فہمی کو دور کرنا ضروری ہے۔علاقائی زبانوں میں بہت سی اچھائیاں اور لائق اخذ باتیں ہیں۔جو بر سبیل تدریس ذہن نشین کی جاسکتی ہیں۔

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

ج: جی ہاں۔میں اور میری اہلیہ ہم دونوں خالص اُردو والے ہیں۔تینوں بیٹے، بہوئیں، پوتے پوتیاں جب بھی یکجا ہوتے ہیں اردو میں ہی بات چیت کرتے ہیں۔ پوتے پوتیاں انگریزی میڈیم سے پڑھنے کے باوجود گھر میں عربی تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ اُردو بھی سیکھ رہے ہیں کہ آتی ہے اردو زباں آتے آتے۔

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اُردو زندہ رہے گی؟

ج: ان شاء اللہ۔میری الماریوں میں بھری اُردو کتابیں اور اُردو زبان کی خدمات کے اعتراف میں ملیں بے شمار ٹرافیاں، تمغے، سپاس نامے اور انعامات انھیں یہ یاد دِلاتے رہیں گے کہ اُردو زبان سے ان کا تعلق خاندانی ہے۔

س: غیر اردو حلقے میں فروغِ اُردو کے لیے کیا حکمتِ عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

ج: سب سے پہلا کام یہ ہے کہ غیر اُردو حلقے کی یہ غلط فہمی دور کرنا ہے کہ اُردو خالص ہندستانی زبان ہے اور یہ صرف مسلمانوں کی زبان نہیں ہے۔کتابیں لکھ کر یا سیمپوزیم کرکے اس زاویۂ نگاہ کو بدلا نہیں جاسکتا۔جس طرح مرحوم سید حامد صاحب نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے لیے مختلف ناموں سے ملک کے مختلف علاقوں میں نہایت کامیاب اور مؤثر پروگرام منعقد کیے۔ان کے زیر قیادت کاروانوں کے دوران مختلف مقامات پر منعقدہ جلسوں میں مختلف مذاہب کی اہم شخصیات نے شرکت کی اور تاریخ کے حوالے سے واضح کیا کہ ماضی کی جنگیں سیاسی اقتدار کے لیے ہوا کرتی تھیں فرقہ وارانہ بنیاد پر نہیں۔

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالجز یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اُردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

ج: پونے یونیورسٹی کے علاوہ یہاں سمبائسیس، بھارتی وِدّیا پیٹھ وغیرہ ڈیمڈ یونیورسٹیاں موجود ہیں لیکن پونے یونیورسٹی کے زیر اہتمام پونا کالج، عابدہ انعامدار کالج، واڈیا کالج، دکن انسٹی ٹیوٹ میں اُردو کی تعلیم کا انتظام ہے۔پڑھنے والوں کی تعداد مختصر ہے۔

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں میں اُردو کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں کس طرح کی مدد لی جاسکتی ہے؟

ج: پونے میونسپل کارپوریشن نے جس طرح یہاں کے آرٹس (ڈرائنگ، ڈیزائننگ، پینٹنگز، آرٹیکچر) کی تعلیم دینے والے اداروں کی مدد سے خالی دیواروں پر مراٹھی زبان میں نعرے 'بیٹے سے بیٹی بھلی۔دونوں گھروں کو روشن کرے'، 'ہم دو ہمارے دو'، 'اگر ایشور بھی اصرار کرے تب بھی نشہ بازی مت کرو' قسم کے خوبصورت پینٹنگز ماہر پینٹروں سے بنواکر نہ صرف مراٹھی زبان کی ترویج و اشاعت کا کام کیا بلکہ شہر کی زینت کاری میں بھی مدد کی۔ اس کے علاوہ چوکوں میں خوبصورت فوارے، اُردو زبان میں چوک کے نام لکھوا کر، اُردو زبان میں خوبصورت پوسٹرس وغیرہ بنواکر، سلم ایریا میں اردو قوالیوں، صوفی سنگیت، نمائشوں وغیرہ کا انعقاد، محلّہ سطح پر طالب علموں نیز خواتین کی دلچسپی کے پروگرام وغیرہ۔غیر سرکاری تنظیمیں اس کام میں بے حد مددگار ثابت ہوتی ہیں۔(میں نے محکمہ سماجی بہبود کے ایڈیشنل ڈائریکٹر کی حیثیت سے انسداد منشیات کی مہم میں غیر سرکاری تنظیموں کی مدد سے ایسے کئی کام کیے ہیں اور آج بھی کررہا ہوں)

س: سینٹرل اسکولوں اور نودے وِدّیالیہ میں اُردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ج: جی نہیں۔کیونکہ یہ غیر اُردو علاقہ ہے۔مہاراشٹر اسٹیٹ اُردو اکادمی کے رکن کی حیثیت سے غیر اُردو تعلیمی اداروں میں غیر سرکاری تنظیموں کی مدد سے اُردو زبان کے کئی پروگرام منعقد کیے ہیں۔

■

Qazi Mushtaq Ahmad
B-6, RAY-Venue Society
I.C.S.Colony
Pune - 411007 (MS)
Mob.:9422317129

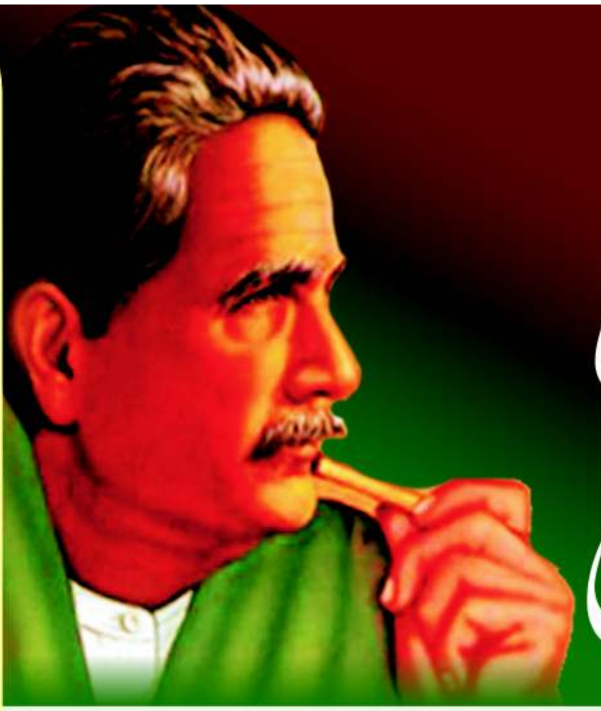

اقبال کی داستان سرائی

عبدالحق

اقبال کے فکر وفن کی روح میں انسان کی ہی جلوہ نمائی ہے۔ اشعار پر جہاں بھی نظر پڑتی ہے، حضرتِ انسان کی شبیہ وصورت کے ساتھ اس کے حال و مقام کا ذکر ملتا ہے۔ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان کے لیے ہی ان کا فکر وفلسفہ وقف ہے۔ادبیات عالم میں شاید ایسی مثال نہ ملے۔گویا انسانی ترانہ یا نغمہ سازی ہی اقبال کی شناخت ہے۔یہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے وہ کسی دور یا حال میں غافل نہیں رہے۔فکری ارتقا کے ساتھ ہی بنی نوع بشر سے متعلق خیالات بہتر سے بہتر صورت گری کی طرف بڑھتے گئے اور بلند پروازی میں اضافہ ہوتا رہا۔ منزل کبریا تک رسائی اس کا ہدف ٹھہرا۔

انسان ارض وسما کی سب سے برگزیدہ تخلیق ہے اسے سب پر شرف حاصل ہے۔ یہ مسجودِ ملائک اور خالقِ کون و مکاں کی سب سے محبوب شے بھی ہے۔اس کی ہزراوں صورتیں ہیں۔مختلف زمانوں اور بستیوں میں اس کی ہدایت اور خیر خواہی کے لیے عظیم انسانوں کا نزول ہوتا رہا ہے۔تخلیق آدم سے پیغمبر اعظم وآخر تک بعثتِ رسول کا سلسلہ جاری رہا ہے اور ان کے بعد مفکروں اور دانش وروں کے قیل و قال کا سلسلہ حشر تک جاری رہے گا۔ اقبال کی نظر میں اس طویل انسانی تاریخ کی بہت اہمیت ہے۔ان کی داستان پسند طبیعت کے لیے حضرتِ انسان کی کہانی میں بڑی دل کشی تھی۔ان کی تخلیق کا سرچشمہ یہی انسان ہے جو موجودات میں منفرد اور حقیقت میں رازِ درونِ کائنات ہے۔دنیا کے تمام انسان ایک وحدت سے منسلک ہیں کیونکہ سب اولادِ آدم ہیں۔سب کی پیدائش اور پہنائی میں اسی مشتِ خاک کی کارفرمائی ہے۔اقبال کی تمام تر توجہ اور آرزو وحدتِ آدم کے عظیم تصور پر مرتکز ہے۔سارے قبائل ایک وحدت میں گم ہوں۔جمعیتِ اقوام کی جگہ جمعیتِ آدم ہو۔احترام آدمیت ہی منشائے مالکِ کون ومکاں ہے۔ یہ سب فکرِ اقبال کے اشارات ہیں۔

اقبال فکر شعر کے ابتدائی دور سے ہی اس موضوع پر سنجیدگی سے متوجہ ہیں۔عمر پچیس سال کی ہے، مگر افکار کی پرواز اور ہجوم طوفاں بدوش ہیں۔انسان ان کا ممدوح اور محبوب بھی ہے۔جگہ جگہ انسانیت سے متعلق سوز وساز کی اضطرابی کیفیت نمایاں ہونے لگی ہے۔متروک کلام یعنی 1901 سے پہلے کی شاعری میں بہت ہی واضح تصور موجود ہے۔انھیں نظر انداز کر کے صرف بانگِ درا کے پہلے دور کے کلام پر توجہ ہے کیونکہ زیر بحث نظم 1904 کی تخلیق ہے۔اسی دور سے انسان پر غیر معمولی توجہ ان کی اساسی فکر کا برملا اظہار ہے۔اس سے نوجوان شاعر کے سروکار کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔یہ اشارہ قاری کی بصیرت کو بھی آواز دیتا ہے۔ابتدائی دور کا یہ تصور اقبال کی فکری راہوں کو روشن کررہا ہے۔اس موضوع سخن کو ماہ وسال کے آئینے میں ہر دور میں دیکھا جاسکتا ہے اور ارتقائی صورتِ حال پر گفتگو بھی کی جاسکتی ہے۔پہلی نظم ہمالہ (1901) کے آخری بند سے داستان سرائی شروع ہوتی ہے۔

اے ہمالہ داستاں اس وقت کی کوئی سنا
مسکنِ آبائے انساں جب بنا دامن ترا
کچھ سنا اس سیدھی سادی زندگی کا ماجرا

اس دور کی سب سے طویل (انہتر اشعار) نظم 'تصویرِ درد' ہے جو تاثیر اور تاکید میں بے مثل تخلیق ہے۔ انسانی محبتوں سے سرشار یہ تخلیق اقبال کی بصیرتوں کی بے نظیر مثال بھی ہے۔اس کے اشعار زبان زد محاورے بن گئے، جن کی بازگشت سیاسی ایوان ومحل اور مسجد ومحراب میں بھی گونجتی ہے۔اقبال کی محبتوں کا ترجمان یہ شعر ملاحظہ ہو۔

شرابِ روح پرور ہے محبت نوع انساں کی
سکھایا اس نے مجھ کو مست بے جام وسبو رہنا

یہ بات لطف سے خالی نہیں ہے کہ اقبال دوسروں کے احوال وکوائف کے ساتھ اپنی رام کہانی بھی سناتے ہیں۔ ایک طرف بزمِ قدرت، انسان و حیوان اپنی سرگزشت سناتے ہیں۔ دوسری طرف حضرت انسان رودادِ زندگی بیان کرتے ہیں۔اقبال سرگزشتِ آدم رقم کرتے ہیں اور آدم کے قصۂ رنگیں کو داستان سرائی کے لیے پسند کرتے ہیں۔ان کے لیے یہ ناممکن تھا کہ اپنی کہانی قلم بند نہ کریں۔ وہ بھی اولادِ آدم تھے۔آدم کی سرگزشت کے ساتھ اپنی سرنوشت بھی رقم کرتے ہیں۔ اس دور کی ایک دوسری تخلیق 'زہد اور رندی' بہت ہی لطف انگیز ہے جس میں مزاج کی سیمابی اور آزادروی کے ساتھ اور بہت کچھ منظوم ہوگیا ہے۔مکالماتی لب ولہجہ بہت ہی کیف پرور اور داستانوی دلچسپی سے بھرپور ہے۔اقبال ہی قصہ گو ہیں اور ہیرو بھی۔منظر ومکالمہ بھی دل فروز ہے۔اس نظم میں ستائیس اشعار ہیں اور ہر شعر بستہ وپیوستہ ہے۔نظم صوت وحرف کے اعتبار سے مترنم اور خوش آہنگ بھی ہے۔

اک مولوی صاحب کی سناتا ہوں کہانی

سے شروع ہوتا ہے۔مولوی صاحب صوفی منش، باعزت، عالم دین، اپنی کرامات کے ذاکر تھے۔وہ اقبال سے بھی واقف تھے۔ان کے لفظوں میں اقبال کی کہانی سنیے۔

سنتا ہوں کہ کافر نہیں ہندو کو سمجھتا
ہے ایسا عقیدہ اثر فلسفہ دانی
کچھ عار اسے حسن فروشوں سے نہیں ہے
عادت یہ ہمارے شعرا کی ہے پرانی

لیکن یہ سنا اپنے مریدوں سے ہے میں نے
بے داغ ہے مانند سحر اس کی جوانی
اس شخص کی ہم پر تو حقیقت نہیں کھلتی
ہوگا یہ کسی اور ہی اسلام کا بانی

ایک دن حضرت زاہد سرراہ اقبال سے ملے تو علامہ نے شکایت کی۔ مولوی صاحب نے فرمایا کہ تمھارے بارے میں جو کچھ کہا وہ محبت کے سبب تھا اور شریعت کی راہ دکھانی تھی۔ اقبال اپنے مزاج کی ترجمانی کرتے ہیں۔

میں خود بھی نہیں اپنی حقیقت کا شناسا
گہرا ہے مرے بحرِ خیالات کا پانی
مجھ کو بھی تمنا ہے کہ اقبال کو دیکھوں
کی اس کی جدائی میں بہت اشک فشانی

اس قصے کے خاتمے کا شعر مطالعۂ اقبال کا لازوال محاورہ بن گیا۔ اقبال کی پراسرار شخصیت کا ایسا برملا اظہار کسی تحریر میں ممکن نہ ہوسکا۔

اقبال بھی اقبال سے آگاہ نہیں ہے

اس کہانی کے تین کردار ہیں زاہد، اقبال کے دوست اور خود اقبال۔ کہانی کے تینوں لوازمات متکلم، مخاطب اور غائب قصہ کی متحرک تصویریں ہیں۔ یہ اقبال کی قصہ گوئی کی ایک عجیب مثال ہے۔ سرگزشتِ آدم بانگِ درا کے ابتدائی حصے کی (1904) تخلیق ہے اور کل اٹھارہ اشعار پر مشتمل ہے۔ اقبال بنیادی طور پر بیانیہ تخلیق کے انوکھے فن کار ہیں۔ غزلوں میں بھی حسن بیان کی ساحری موجود ہے۔ بال جبریل کی غزل منظر مکالمہ اور مخاطب کی حیرت فروش مثال ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا

اس نظم میں اقبال کا حسنِ بیان بڑی دل کشی رکھتا ہے۔ بیانیہ کے کچھ لوازمات ہیں۔ سرگزشت اپنے وجود پر گزری ہوئی داستان سرائی کا نام ہے۔ اس کے لیے قصہ گو کے ساتھ سامع اور مخاطب بھی بزم آرا ہوتے ہیں۔ ظاہراً ان کا وجود معدوم ہوتا ہے مگر فن کار تصور کر لیتا ہے کہ وہ سامعین کی محفل میں اپنی خودنوشت سنا رہا ہے۔ اسے ایک تمثیلی تخاطب بھی کہہ سکتے ہیں۔ گو کہ شاعر خود اپنی ذات سے ہم کلام ہوتا ہے۔ مخاطب جو غائب ہے محض خیال میں موجود ہے۔ خودکلامی کی ایک بلیغ صورت اس نظم کی ایک خوبی ہے اور حسن آفرینی کی بہت ہی خوبصورت مثال سامعین کی صف میں ارض و سما پر محیط پوری کائنات ہے جو وسعت اور پھیلاؤ میں بے کراں ہے جس کے حدود کا تصور بھی انسانی ذہن سے بالاتر ہے۔ انسان فرشِ زمین سے ہی نہیں بام گردوں سے بھی مخاطب ہے۔ چونکہ آدم پہلی تخلیق ہی نہیں تمام تخلیقات عالم میں سب سے بلند و برتر ہیں۔ ان کی ذات میں ارض و سما کی وسعتیں اور پہنائیاں سمٹ کر ایک نقطے پر مرکوز ہوگئی ہیں۔ ایسے وسیع اور بے کراں پیکر کا خطاب کائنات سے ہی موزوں ہے۔ کسی خطے، قبیلے، یا قوم سے مناسب نہیں ہے۔ یہ ایک محدود زاویہ ہوگا۔ یہ نکتہ ذہن میں رکھنا چاہیے کہ اقبال کا انسان صرف مشتِ خاک کا مجموعہ نہیں ہے بلکہ وہ بے کراں وسعتوں کی ایک علامت ہے جس میں زمین و آسماں اور زمان و مکاں کے امکانی حدود سمٹ کر علامت بن گئے ہیں۔ اقبال کی ہی مثال ہے کہ آنکھ کے تِل میں آسمان کی وسعتیں اور سمندر ایک بوند پانی میں بند ہوگیا ہے۔

سمندر ہے اک بوند پانی میں بند
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے

(ساقی نامہ)

پہنائیوں کا تقاضا تھا کہ اقبال قصہ گو کائنات سے گفتگو کے لیے روبرو ہوتے اور بزمِ کائنات کو اپنی رام کہانی سے روشناس کراتے۔ متکلم اور مخاطب میں مساوی مراسم لازم ہوتے ہیں۔ جس شان کی بزم اور سامع ہوں اسی عظمت کی داستان بھی ہو اور واقعہ نگار بھی اتنا ہی عظیم ہو تب ہی سننے اور سنانے کا لطف ہے۔ ایک دوسرا نکتہ بھی ذہن میں رکھنے کی ضرورت ہے کہ اقبال کا انسان جگہ جگہ بزم کائنات سے مخاطب ہوتا ہے۔ اسی دور (1904) کی ایک دوسری بہت اہم نظم 'انسان اور بزمِ قدرت' ہے۔ دونوں میں ایک بہت ہی فکر انگیز مکالمہ ہے۔ انسان اپنی روسیاہی اور زوال کے اسباب دریافت کرتا ہے۔

میں بھی آباد ہوں اس نور کی بستی میں مگر
جل گیا پھر مری تقدیر کا اختر کیوں کر
نور سے دور ہوں ظلمت میں گرفتار ہوں میں
کیوں سیہ روز سیہ بخت سیہ کار ہوں میں

بزمِ قدرت انسان کو اس کے وجود کی آگہی بخشتی ہے اور انسان کو قدرت کی طرف سے دی گئی نوازشات کو یاد دلاتی ہے کہ

باغباں ہے تری ہستی پۓ گلزارِ وجود

انسان کو عرفانِ ذات کا پہلا سبق نگارِ قدرت سے حاصل ہوتا ہے۔ فلسفۂ خودی کا مہتم بالشان تصور قدرت کے آغوش سے جنم لیتا ہے۔ خیال اقبال کا ہے مگر مکالمے کا تقاضا تھا کہ بزمِ قدرت ہم کلام ہوتی۔ عرفانِ حق اور عرفانِ ذات کے لیے دنیا میں بس دو ذرائع ہیں جنھیں انفس اور آفاق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اپنی ذات اور مظاہر فطرت پر غور و فکر کی تاکید قرآن کا حکیمانہ ارشاد ہے۔ اقبال نے دوسرے مقامات پر حوالے دیے ہیں۔ سرگذشت آدم کے مکالمے میں اس زاویے کو پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے۔ اقبال کی شاعری کا بڑا حسن مکالماتی اندازِ بیان ہے۔ شاعری میں تمثیلی (ڈرامائی) اسلوب بذات خود ایک مقبول فن ہے۔ اس میں گفت و شنید کے ساتھ حرکات و سکنات کی متحرک تصویریں بڑی دلآویز لگتی ہیں۔ قاری کو قربت کا احساس شریک منظر بنا لیتا ہے۔ سامع پر محویت کی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ وہ خود ہم کلام ہونے لگتا ہے۔ اس طرح کے مکالماتی اسالیب سے اقبال کی شاعری بھری پڑی ہے۔ یہ سب کسی نہ کسی طرح افسانوی یا داستانوی حسن بیان کے امتیازات سے بھرپور ہیں۔ بانگِ درا کی دوسری نظم 'حقیقت حسن' داستان سرائی کی عجیب و غریب مثال ہے۔ غیر ذی روح شے قصے کا آغاز مکالمہ سے کرتی ہے۔

خدا سے حسن نے اک روز یہ سوال کیا

اب قصے میں مناظر فطرت کے شاہکار کردار بن کر ابھرتے ہیں۔ چاند تارے شبنم زمین و آسماں بہار شباب وغیرہ کہانی کو حسن کاری سے آراستہ کرتے ہیں۔ شکوہ و جواب شکوہ کا مکالمہ ایک دوسری نوعیت کا ہے۔ شکوہ میں صرف انسان بولتا ہے جواب میں رب جلیل گویا ہوتا ہے۔ 'خضر راہ' میں شاعر اور خضر کا خطاب سوال و جواب کی صورت میں ہے۔ شمع و شاعر کی بھی یہی کیفیت ہے۔

پیر رومی و مرید ہندی سوال و جواب پر ہی مشتمل مکالمہ ہے۔ 'لینن خدا کے حضور میں' ایک نئی صورت کی مثال ہے۔ فارسی شاعری میں تو بہت سی نئی صورتیں ملتی ہیں۔ مکالموں کی کثرت سے اقبال کی صناعی اور پسندیدگی کا اندازہ ہوتا ہے۔ طرح طرح کے مکالمے موجود ہیں۔ خدا اور انسان حور و شاعر، جبریل و ابلیس، پہاڑ اور گلہری، ایک مکڑا اور مکھی، ایک گائے اور بکری، ہمدردی، ماں کا خواب، بچہ شاہیں اور ماہی، ابلیس اور مشیران ابلیس وغیرہ پچاسوں مقامات ہیں اس نظم میں مکالمے کی نوعیت مختلف ہے۔ سوال و جواب نہیں ہے بلکہ خود کلامی ہے جو داستان گو کے بیانیہ حوالوں پر مشتمل ہے۔ اس بیانیہ کا حسین آرٹ یہ بھی ہے کہ منظر و محاکات کی سحر کاری پر سامعین متوجہ ہیں۔ نظم کا لطف دوبالا ہوگیا ہے۔ یہ نظم متحرک اور رواں دواں تصویروں کا ایک مرقع بن گئی ہے۔ واقعہ نگاری کا کمال ہے کہ ہر عمل جیتا جاگتا منظر ہے جو آنکھوں کے سامنے انجام پارہا ہے۔ ان مصرعوں کو دیکھیے۔

لگی نہ میری طبیعت ریاضِ جنت میں
نکالا کعبے سے پتھر کی مورتوں کو کبھی
کبھی میں ذوقِ تکلم میں طور پر پہنچا
کبھی صلیب پہ اپنوں نے مجھ کو لٹکایا
کبھی میں غارِ حرا میں چھپا رہا برسوں

نظم کے تمام اٹھارہ اشعار منظر نمائی یا تصویر کشی کی سحر نگاری سے معمور ہیں۔ ہر شعر ایک طویل کہانی کی روداد پیش کرتا ہے۔ گو مرقع سازی سے معمور یہ تخلیق اقبال کی نظم نگاری میں ایک منفرد مثال ہے اور لطف کی بات ہے کہ ابھی اقبال کی شاعری کا عہد طفلی ہے مگر نظم فن اور وسعت نظر کی پیشکش میں دور شباب کی ترجمان بن گئی ہے۔

اقبال کی داستان سرائی کا یہ حسن بڑی دل کشی کا سبب ہے کہ کرداروں کو لفظوں کے بولتے پیکر کے نفسِ گرم کی تپش بھی محسوس ہوتی ہے۔ محسوسات کا منظر اپنی رعنائیوں کے ساتھ تاثرات کی ایک کیفیت پیدا کرتا ہے۔ دو ایک ایسے منظر ملاحظہ ہوں۔

لہو سے لال کیا سیکڑوں زمینوں کو
ڈرا سکیں نہ کلیسا کی مجھ کو تلواریں
بنا دی غیرتِ جنت یہ سرزمیں میں نے

اس نظم کی ایک اور دل چسپ خوبی ہے کہ داستان کی طوالت یا تفصیل کو صرف ایک شعر کے اختصار میں پیش کرنے کا ہنر فنی معجزہ سے کم نہیں ہے۔ تلمیح کی یہ صورت گری کلام اقبال میں عام ہے۔ کبھی کبھی صرف دو لفظ میں پورے واقعے کی تفصیل کی طرف اشارہ عجیب لطف انگیز ہوتا ہے جیسے آتش نمرود، کشتیِ مسکیں جان پاک دیوار یتیم، تیشۂ فرہاد جیسے سیکڑوں تلمیحاتی اشارے اقبال کے فنی کمالات کے مظہر ہیں۔ تلمیح کے لیے متعین الفاظ ہیں۔ اقبال کی شعری عظمتوں کا یہ اعجاز ہے کہ انھوں نے کئی لفظوں کو پیکر کے اشارات میں تبدیل کیے ہیں۔ وہ اقبال کی ساختہ علامت بن گئے ہیں۔ حضرت جبریل کا ابلیس سے سوال ہے۔

ہمدمِ دیرینہ کیسا ہے جہاں رنگ و بو؟

ابلیس کے جواب میں مستعمل چھ الفاظ میں ارض و سما کی تمام کیفیت سمٹ گئی ہے۔

یہی صورت نظم کے اختصار کو فنی اعجاز سے ہم کنار کرتی ہے۔ صرف اشارے ہیں تفصیل کی تفہیم سامع یا قاری کی صواب دید کے حوالے کر دی گئی ہے۔ ان میں بھی کہیں نام لے کر اور کہیں واقعہ کو کردار کی نشان دہی کے بغیر بیان کر دیا گیا ہے۔ مثلاً

سنایا ہند میں آکر سرودِ ربانی
دیارِ ہند نے جس دم مری صدا نہ سنی
کشش کا راز ہویدا کیا زمانے پر

شاعر نے کمال احتیاط سے نام نہ لے کر قاری کو تلاش و تفصیل کے لیے آمادہ کیا ہے۔ اس مختصر نظم میں تخلیق عالم سے لے کر اٹھارہویں صدی تک کی عظیم داستانوں کو منظوم کرنا آسان نہ تھا۔ مگر اقبال نے صرف تاریخ ساز

اقبال کا مکالماتی اسلوب بیان ان کے شعری اسالیب کا ایک اعجاز ہے۔ وحدت آدم اور اپنے وجود کی آگھی کے تصورات کو حضرت آدم کی تمثیل اور تشبیہ میں بیان کرکے اقبال نے نظم کو فکری آهنگ کے امتزاج سے لافانی شاہ کار بنا دیا ہے۔ قصہ گو اقبال ہیں مگر انہوں نے صیغۂ غائب کے لافانی کردار حضرت آدم کو خوش نوائی کے لیے انتخاب کرکے معنی آفرینی کی دنیا آباد کی ہے کیونکہ ان سے بہتر کائنات میں کوئی دوسرا داستان سرا ممکن نہیں

کرداروں کو منتخب کر کے کائنات کی دراز داستان کو اشاراتی اسلوب دیا ہے۔ یہ واقعات عظیم ہیں جن سے ظہورِ آدم اور بنی نوع انسان کی ہدایت کے سنگِ نشاں نصب ہوئے ہیں۔ ان میں عالمی مذاہب کے پیشوا اور ایجادات کے ماہرین شامل ہیں جنھوں نے انسانی تاریخ کو بڑی فکری اور مادی انقلاب کی رہبری کی ہے۔ کردار حضرت آدم کا ہے جنھوں نے مختلف زمانوں میں اور مقامات پر اپنے نقوش ثبت کیے ہیں۔ حضرت ابراہیم، حضرت موسیٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت محمدؐ، گوتم بدھ کی صف میں عظیم سائنس دانوں کی کہکشاں بھی حضرت انسان کے وجود و نمود کی مختلف صورتیں ہیں جن میں آدم ہی کی جمال آفرینی کے جوہر نمایاں ہیں۔ قصۂ آدم کی صد رنگ تصویروں کا بیان اقبال کی مفکرانہ شاعری کا حاصل ہے۔ روح ارضی کے استقبال سے کار جہاں دراز کا نہ ختم ہونے والا سفر جاری ہے۔ اس نظم میں اقبال کی وسعتِ نظری قابل غور ہے۔ مذہبی رہ نماؤں کے دوش بدوش نیم مذہبی یا غیر مذہبی اولادِ آدم بھی ہم نشین ہیں۔ اس طرح کی اجتماعی تصویر کاری کی دوسری مثال جاوید نامہ بھی ہے جہاں پیغمبروں کے ساتھ دوسرے مفکر اور تخلیق کار بھی صف بستہ ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظم 'جاوید نامہ' کے روحانی سفر کی گزرگاہ کا نقطۂ آغاز بھی ہے۔

فنی اعتبار سے یہ ایک بہت ہی پر اثر تمثیلی تخلیق ہے جسے داستان گوئی کے اسلوب میں بیان کیا گیا ہے۔ کہانی ایک نقطے پر آ کر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کا اختتام بہت معنی خیز ہے۔ حضرت آدم کی بے قرار روح کو جنت میں بھی سکون میسر نہ تھا۔ مختلف صورتوں میں وہ زمین پر تاریخ رقم کرتے رہے۔ پھر بھی اضطرابِ دل کو قرار حاصل نہ ہوا۔ کائنات کی گردش میں سرگرداں رہنے کے باوجود حقیقت کا سراغ نہ ملا تو اپنے وجود کو ٹٹولنا شروع کیا۔ معلوم ہوا کہ جس صداقت کی تلاش میں انسان بے چین تھا۔ وہ خود اپنے ہی دل میں خانہ نشین تھا۔ نظم کا اختتامی نقطہ بہت ہی خیال افروز ہے۔ اسے ذرا وسعت دے کر غور و فکر سے ہم آہنگ کیجیے تو فلسفۂ خودی کا مرکزی خیال کارفرما نظر آئے گا۔ اپنے وجود میں اپنی ذات کا عرفان ہی خودی کا حاصل ہے۔ یہی اس نظم کا اساسی خیال اور بنیادی فکر ہے۔ اس نظم کے اثرات اقبال کی دوسری تخلیقات میں بھی نمایاں ہیں۔ تقریباً تیس سال بعد یہ نکتہ پوری گرمی اور گراں مائگی لے کر 'بال جبریل' کی غزل کا حرف راز بن کر نمودار ہوا اور ضرب المثل کے طور پر مشہور ہوا۔

اپنے من میں ڈوب کر پا جا سراغِ زندگی

یا آدم کا خانۂ دل میں ہم نشین ہونا ہی من میں ڈوب کر سراغ زندگی کا پانا ہے۔ سینہ کائنات کا یہ راز وجود کے اندر پوشیدہ ہے جسے فاش کرنے کی ضرورت ہے۔ اس نظم کا بنیادی خیال وحدت آدم کا عظیم تصور ہے جو وحدت کائنات اور تخلیق عالم کا سبب بھی ہے۔ اقبال اس وحدتِ انسانی کی نغمہ سرائی کے لیے ہمیشہ یاد کیے جائیں گے۔

اقبال نے اپنی فکر کو شعری پیراہن میں جس طرح سجایا ہے وہ بھی ایک مثالی حیثیت ہے۔ لفظوں کی ترکیبیں بڑی حد تک تنوع اور تصویر آفرینی سے آراستہ ہیں جیسے قصۂ پیمانِ اولیں، اوج خیالِ فلک نشیں، حرم نشیں، جام آخریں، خلاف معنی تعلیم اہل دیں چشم مظاہر پرست جیسی اضافت سے بھرپور ترکیبیں نظم کی نغمگی میں مددگار ہوتی ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ یہ نظم نغمہ و آہنگ سے بھرپور خوش آہنگ آوازوں کا مرقع محسوس ہوتی۔ قصہ گوئی اور مختلف کرداروں کی نمایاں تصویریں فکر و نظر کو پرنور کرتی ہیں۔ خیالات کا ہجوم ہماری بشاشتوں کو سرخوشی بخشتا ہے۔ اقبال کا مکالماتی اسلوبِ بیان ان کے شعری اسالیب کا ایک اعجاز ہے۔ وحدتِ آدم اور اپنے وجود کی آگہی کے تصورات کو حضرتِ آدم کی تمثیل اور تشبیہ میں بیان کر کے اقبال نے نظم کو فکری آہنگ کے امتزاج سے لافانی شاہ کار بنا دیا ہے۔ قصہ گو اقبال ہیں مگر انھوں نے صیغۂ غائب کے لافانی کردار حضرت آدم کو خوش نوائی کے لیے انتخاب کر کے معنی آفرینی کی دنیا آباد کی ہے کیونکہ ان سے بہتر کائنات میں کوئی دوسرا داستان سرا ممکن نہیں۔

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

■

Prof. Dr. Abdul Haq
Dept of Urdu
University of Delhi
Delhi - 110007
Mob.:9350461394
Email.: prof.abdul_haq@hotmail.com

مظہر احمد

اردو طنز و مزاح کی روایت اور
نظیر اکبر آبادی

اردو طنز و مزاح کی تاریخ میں جن ابتدائی انفرادی کاوشوں کی نشاندہی کی جاتی ہے، ان میں جعفر زٹلی کے بعد نظیر اکبر آبادی کا نام خاص اہمیت رکھتا ہے۔ نظیر نے عام روش سے ہٹ کر اور رسمِ زمانہ سے دور جا کر ایک ایسی دل آویز شاعری کے نمونے پیش کیے کہ جو منفرد بھی تھے اور نئے بھی۔ نیز شاعری کو درباروں سے اٹھا کر عوام الناس کے درمیان لے جانے میں بھی انھوں نے اہم کردار ادا کیا۔ اسی لیے نظیر کو پہلا عوامی شاعر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ انھوں نے ہمعصر شعرا کے بالمقابل اپنی ایک الگ روش نکالی اور تاحیات اسی پر گامزن رہے۔ پروفیسر محمد حسن فرماتے ہیں کہ:

''نظیر اکبر آبادی شاید وہ واحد شاعر ہیں، جنھوں نے وقت کے تقاضے کے پیشِ نظر نرالے ڈھنگ سے اپنے جگر کو خون کر کے ہمعصر شعرا کے برعکس اظہارِ خیال کیا۔''

(نظیر اکبر آبادی از محمد حسن ص9)

اور چونکہ نظیر کا شعری رویہ اور منصب عام روش سے ہٹ کر تھا اسی لیے عام طور پر نظیر کی شاعری کو بازاری، رکیک، غیر معیاری اور فحش قرار دیا گیا اور اس دور کے تقریباً تمام تذکرہ نگاروں نے یا تو ان کا ذکر ہی نہیں کیا یا پھر انھیں معمولی اور غیر اہم کہہ کر ان کی شاعری سے صرفِ نظر کیا، مگر پھر آہستہ آہستہ ان کی شاعری کے گونا گوں پہلوؤں پر ہماری نظر گئی اور ہم نے ان کی عظمتوں کا اعتراف کرنا شروع کیا۔

دراصل نظیر بازار کے شاعر ہیں مگر بازاری نہیں۔ ان کے مخاطب 'آگرہ بازار' کے عوام الناس ہیں۔ لہٰذا وہ ان کے ساتھ کھیل کھیلتے ہیں، رنگ رلیاں مناتے ہیں اور یوں عوام کے رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔ نظیر کی عوامی شاعری سے متعلق محمد حسن صاحب کی یہ رائے غور طلب ہے:

''نظیر عوامی شاعر ہے۔ اس نے عوام کی باتیں عوام سے کیں۔ اس نے نہ تو مذہب کا پرچار کیا نہ رہبانیت کا۔ اس کو سمجھنے کے لیے ہمیں عوام کو سمجھنا ہوگا..... اس کی نظمیں سیدھے سادے تاج محل ہیں جو عوام کے ساتھ اس کے خلوص کی یادگاریں ہیں اور یہی اس کو امتیازی سلوک عطا کرتی ہیں۔'' (نظیر اکبر آبادی از محمد حسن ص9)

عوامی شاعری کا ایک واضح اور نمایاں اسلوب ظرافت ہے اور یہ ظرافت نظیر کی ذات کا نمایاں حصہ ہے کہ وہ فطرتاً خوش مزاج تھے اور یہی خوش مزاجی ان کی زندگی اور ان کے کلام کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ انھوں نے اپنی شاعری میں عوامی زندگی کے ہر رنگ اور معاشرے کی ہر ترنگ کو موضوع بنایا اور ایک ایسے دور میں جبکہ عام شعرا ہجو گوئی، پھبتی کنائے اور ایہام وغیرہ میں الجھ کر رہ گئے تھے، نظیر نے طنز و مزاح کے اعلیٰ نمونے پیش کیے اور اس کا ایک معیار قائم کیا۔ وزیر آغا لکھتے ہیں:

''نظیر کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری کو ایک اور لحاظ سے بھی اہمیت حاصل ہے۔ وہ اس طرح کہ نظیر نے اردو شاعری کو اس ابتدائی دور میں مزاح اور طنز کا ایک ایسا معیار قائم کیا جو مغربی ادب سے متاثر ہوئے بغیر اس کے جدید تصور سے بہت قریب تھا۔''

(اردو ادب میں طنز و مزاح از وزیر آغا ص98)

نظیر کے طنز میں ذہانت و متانت اور بذلہ سنجی و شوخی کا امتزاج ہے۔ وہ کسی کا دل نہیں دکھاتے بلکہ زندگی کے نہایت عام رویوں اور حالات کی خرابی پر نظر ڈالتے ہیں اور سماج و معاشرے پر طنز کرتے ہیں۔ ان کے طنز میں ذاتی بغض و عناد اور طعن و تشنیع کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ذاتیات تو ان کا موضوع ہی نہیں ہے وہ تو اجتماعی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں، اسی لیے ان کے کلام کا عام انداز ظریفانہ ہے۔ ان کے دیوان میں زندگی اپنی تمام تر شوخیوں اور شرارتوں کے ساتھ بکھری ہوئی ہے۔ اکثر نظموں میں وہ متضاد اشیا اور جذبات کو بروئے کار لا کر ظرافت پیدا کرتے ہیں۔ نیز مضحک واقعہ نگاری اور منظر نگاری سے بھی ظرافت و شوخی کے مواقع حاصل کرتے ہیں۔ نظیر کے مضحک موضوعات سے متعلق فرقت کاکوروی رقمطراز ہیں:

’’ان کی شاعری میں جگہ جگہ ہم کو سماج اور معاشرت پر طنز ملتا ہے۔ چنانچہ روٹی نامہ، پیسہ نامہ، آدمی نامہ، جوگن نامہ، کوڑی نامہ یہ ساری کی ساری طنزیہ نظمیں ہیں، جن میں لطیف طنز ملتا ہے۔ بعض نظمیں انھوں نے اقتصادی نقطۂ نظر سے لکھی ہیں۔ ان میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم پر گہرا طنز ہے کہیں پر یہ طنز بالکنایہ ہے اور کہیں کہیں اس میں اتنی شدت اور تلخی پیدا ہوگئی ہے کہ وہ بیزاری کے حدود میں داخل ہوگیا ہے۔‘‘

(اردو ادب میں طنز و مزاح از فرقت کاکوروی ص 34,35)

طنز و مزاح سے متعلق نظیر کی نظمیں ’آدمی نامہ‘، ’روٹی نامہ‘ اور خوشامد خاص طور پر اہمیت کی حامل ہیں۔ آدمی نامہ میں انھوں نے متضاد اشیا و افراد کا ذکر کرکے اور ان کے تقابل سے انسان کی بے قدری و بے وقعتی پر طنز کیا ہے۔ یہ نظم طبقاتی زندگی میں انسان کی بلندی و پستی کی بھرپور عکاسی کرتی ہے۔ سماجی و اقتصادی نابرابری کا احساس بھی اس میں شامل ہے۔ یہاں دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

دنیا میں بادشاہ ہے سو ہے وہ بھی آدمی   اور مفلس و گدا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
زردار و بے نوا ہے سو ہے وہ بھی آدمی   نعمت جو کھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
ٹکڑے جو مانگتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

مسجد بھی آدمی نے بنائی ہے یاں میاں   بنتے ہیں آدمی ہی امام اور خطبہ خواں
پڑھتے ہیں آدمی ہی قرآں اور نمازیاں   اور آدمی ہی ان کی چراتے ہے جوتیاں
جو ان کو تاڑتا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

’روٹی نامہ‘ دو وقت کی روٹی حاصل کرنے کی تگ و دو میں انسان کی اخلاقی پستی کی داستان سناتی ہے۔ امیر و غریب، ادنیٰ و اعلیٰ سب کی بنیادی ضرورت روٹی ہے مگر اس کی حصولیابی میں جو بے ترتیبی اور چھینا جھپٹی نظیر کو نظر آتی ہے، وہ اسے طنزیہ پیرائے میں بیان کردیتے ہیں۔ نظم کا ہر ہر بند ایک طنزیہ منظر ہمارے روبرو لاتا ہے۔ عام آدمی سے لے کر پیر و فقیر بھی اسی روٹی کے طلبگار ہیں۔ چنانچہ نظیر کامل فقیر کی آڑ میں ایسے ہی نام نہاد صوفیوں پر طنز کے وار کرتے ہیں۔

پوچھا کسی نے یہ کسی کامل فقیر سے   یہ مہر و ماہ حق نے بنائے ہیں کاہے کے
وہ سن کے بولا بابا خدا تجھ کو خیر دے   ہم تو نہ چاند سمجھیں نہ سورج ہیں جانتے
بابا ہمیں تو یہ نظر آتی ہیں روٹیاں

پھر پوچھا اس نے کہیے یہ ہے دل کا نور کیا   اس کے مشاہدے میں ہے کھلتا ظہور کیا
وہ بولا سن کے تیرا گیا ہے شعور کیا   کشف القلوب اور یہ کشف القبور کیا
جتنے ہیں کشف سب یہ دکھاتی ہیں روٹیاں

ان مثالوں کے علاوہ کلیات نظیر میں ایسا کلام بکثرت موجود ہے جس میں نظیر نے طنز و مزاح کے اعلیٰ معیاروں کو بروئے کار لاکر فرد و سماج پر طنزیہ وار کیے ہیں۔ ایسی نظموں میں ’کلجگ‘، ’کوڑی نامہ‘، ’طفلی نامہ‘، ’برسات کی بہاریں‘ اور ’خوشامد‘ خاص ہیں۔

نظیر کے کلام میں خالص مزاح کے پہلو تلاش کرنا نہایت آسان ہے کہ کلام نظیر میں جا بہ جا خالص مزاح کے نمونے بکھرے پڑے ہیں۔ خود نظیر نے خود کو چٹکلے باز کہا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں۔

سب جانتے ہیں چٹکلے بازی نظیر کی   اس کے تو ہر سخن میں ہے اے یار چٹکلا

تہوار ہوں یا میلے ٹھیلے، سیر تماشے ہوں یا بزم آرائیاں نظیر مزاح کے امکانات ہر موقع پر نکال ہی لیتے ہیں۔ واقعات و مناظر سے مزاح پیدا کرنے میں نظیر کو فوقیت حاصل ہے اور یہ اسلوب اس فن کے جدید تصورات سے نزدیک ہے۔ چنانچہ اس کی اہمیت دو چند ہے۔ یہاں نظم ’برسات اور پھسلن‘ کے دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

کوچے میں کوئی اور کوئی بازار میں گرا   کوئی گلی میں گر کے ہے کیچڑ میں لوٹتا
رستے کے بیچ پاؤں کسی کا رپٹ گیا   اس سب جگہ کے گرنے سے آیا جو بچ بچا
وہ اپنے گھر کے صحن میں آکر پھسل پڑا

کرتی ہے گرچہ سب کو پھسلنی زمین خوار   عاشق کو پر دکھاتی ہے کچھ اور ہی بہار
آیا جو سامنے کوئی محبوب گل عذار   گرنے کا مکر کرکے اچھل کود، ایک بار
اس شوخ گلبدن سے لپٹ کر پھسل پڑا

غرض کہ نظیر کا بیشتر کلام نشاطیہ آہنگ کے پہلو بہ پہلو طنز اور مزاح کے امکانات سے بھی آراستہ ہے۔ بقول وزیر آغا

’’نظیر دراصل اس ماحول کو پسند بھی کرتے ہیں جسے وہ مذاق کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس قدر کہ بعض اوقات جب وہ طنزیہ طریق کار بھی اختیار کرتے ہیں تو ناظر کو ان کے ہمدردانہ اندازِ نظر کا احساس برابر رہتا ہے۔‘‘ (اردو ادب میں طنز و مزاح از وزیر آغا ص 97)

یہی ہمدردانہ اندازِ نظر ان کی ظرافت کو رکیک اور غیر شائستہ ہونے سے بچالیتا ہے۔

اردو کی ظریفانہ شاعری کی روایت میں نظیر اکبرآبادی کا فیضان دورِ جدید میں بھی جاری ہے۔ بیسویں صدی کے صفِ اول کے بیشتر شعرا نے کلامِ نظیر سے نہ صرف یہ کہ استفادہ کیا ہے بلکہ تضمین، اقتباس اور پیروڈی کے ذریعے نظیر کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔ اردو میں پیروڈی نگاری کا چلن پچھلی صدی کے اوائل ہی سے موجود ہے۔ شعرائے طنز و مزاح نے میر و غالب اور علامہ اقبال اور دیگر شعرا کے ساتھ ساتھ نظیر کی مشہور و معروف نظموں کو بنیاد بنا کر پیروڈی نگاری کی ہے اور سابقہ متن میں کئی اہم اور بامعنی تبدیلیاں کرکے انھیں نئی معنوی دنیائیں عطا کی ہیں۔ پیروڈی میں معمولی تحریف اور الفاظ کے ردوبدل سے نئے مضامین کی تخلیق اہمیت کی حامل ہے اور ہمارے بیشتر پیروڈی نگار شعرا نے کلامِ نظیر پر تحریفی کارروائی کرکے اسے نئی جہات سے روشناس کیا ہے۔ نظیر کی نظموں کو پیروڈی کا ہدف بنانے کی ایک وجہ کلامِ نظیر کی بے پناہ مقبولیت اور ہردلعزیزی بھی ہے کہ کامیاب پیروڈی کے لیے اصل نظم کا عوام الناس میں مقبول ہونا ضروری ہے۔ آیئے ایسی چند پیروڈیوں کا جائزہ لیں:

نظیر کی نظم ’بنجارہ نامہ‘ انتہائی مشہور و معروف نظم ہے۔ ہمارے پیروڈی نگار شعرا نے اس نظم کی گوناگوں خوبیوں کو دھیان میں رکھتے ہوئے اس پر طبع آزمائی کی ہے۔ دنیا کی بے ثباتی اور موت کی اٹل حقیقت کے پس منظر میں نظیر نے بنجارے کو جو نصیحتیں کی تھیں، جدید شعرا نے اس میں خاطر خواہ اضافہ کیا ہے اور طنز و مزاح کے مزید امکانات روشن کیے ہیں۔ مسٹر دہلوی کے ’ماڈرن بنجارہ نامہ‘ کے دو بند ملاحظہ فرمائیں۔

اے آدم اس سے پنڈ چھڑا یہ نفس ترا ہے امارہ
دیکھے گا اجل کی شکل جونہی ہوگا یہ وہیں نو دو گیارہ
کیا وارے نیارے ہر دم کے ہر آن کی کیا یہ پوبارہ
کیا ہنڈی، چک بک، بونڈ، شیئر، کیا نوٹوں کا یہ پشتارہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

گو چومتے ہیں سب ہاتھ ترے اور تو ہے بڑا ہی مولانا
مت بھول کہ غافل تجھ کو بھی اک روز یہاں سے ہے جانا
کیا بکرے، نقدی، شیرینی، کیا نذر نیاز اور نذرانہ
کیا دعوت صبح و شام تری کیا مرغ مسلم روزانہ
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

سید محمد جعفری کے کلام میں بیشتر پیروڈیاں علامہ اقبال کے کلام سے ماخوذ ہیں مگر انھوں نے بھی نظیر اکبر آبادی کی نظم 'بنجارہ نامہ' کے ایک نہایت کامیاب اور بامعنی پیروڈی تخلیق کی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں بھی بنجارہ نامہ کی مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کے موضوعات کے مزید امکانات کو بروئے کار لاکر ایک عمدہ پیروڈی تخلیق کی گئی ہے۔ یہاں دو بند۔

اس نفع خوری کے چکر میں تو حج کرنے جب جائے گا
پیتل جو پہن کر جائے گا سونے سے بدل کر آئے گا
کسٹم سے تو بچ کر نکلے گا اور حاجی بھی کہلائے گا
قزاق اجل کا رستے میں جب بھالا مار گرائے گا
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

اِن دھندوں میں ان پھندوں میں سب عمر تری کٹ جائے گی
سر پر جو یہ ہن کی بدلی ہے اک بارش میں چھٹ جائے گی
یہ دولت جھٹ پٹ آئی ہے یہ دولت جھپٹ پٹ جائے گی
یہ کھیپ جو تو نے لادی ہے سب حصوں میں بٹ جائے گی
سب ٹھاٹھ پڑا رہ جائے گا جب لاد چلے گا بنجارہ

نظیر اکبر آبادی کی ایک اور معروف نظم ہمارے پیروڈی نگاروں کی منظوم کاوشوں کا محور و مرکز رہی ہے۔ کلیاتِ نظیر میں بھی اس نظم کی خاص اہمیت ہے۔ طنز و مزاح کے علاوہ تقابل و تضاد نیز فلسفیانہ ہمہ گیری نے بھی اس نظم کی اہمیت میں اضافہ کر دیا ہے۔ اور وہ نظم ہے 'آدمی نامہ'۔ قاضی غلام محمد نے 'نیا آدمی نامہ' کے عنوان سے اس نظم کی پیروڈی تخلیق کی ہے اور اسے نئی معنوی جہات عطا کی ہیں۔

چہرے پہ ان کے دبکی ہوئی ایک رات ہے　　ان کے لیے یہ حاصلِ کل کائنات ہے
اس سے زیادہ لطف کی یہ واردات ہے　　اے دل مگر یہ کان میں کہنے کی بات ہے
داڑھی بڑھا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

ان کو نہ لفٹ شعر کی دیوی نے دی کبھی　　ملنے جو یہ گئے تو وہ پردے میں جا چھپی
اللہ رے ان کی دست درازی کی برہمی　　ساڑی ادب کی سات جگہ سے ہے پھاڑ دی
نقاد ان کو کہتے ہیں یہ بھی ہیں آدمی

مجید لاہوری کا 'ماڈرن آدمی نامہ' تقسیم وطن کے فوراً بعد رونما ہونے والے مخصوص حالات کی نقاب کشائی کرتا ہے۔ مزاح کے پس منظر میں انھوں نے تیکھے طنز سے بھی کام لیا ہے۔ نیز نظیر اکبر آبادی کو خراجِ عقیدت بھی پیش کیا ہے۔

وہ بھی ہے آدمی جسے کوٹھی ہوئی الاٹ　　وہ بھی ہے آدمی ملا جس کو نہ گھر نہ گھاٹ
وہ بھی ہے آدمی کہ جو بیٹھا ہے بن کے لاٹ　　وہ بھی ہے آدمی جو اٹھائے ہوئے ہے کھاٹ
موٹر میں جا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی
رکشا چلا رہا ہے سو ہے وہ بھی آدمی

رضا نقوی واہی کی نظم 'پروفیسر نامہ' مضحک موضوعات، متضاد خیالات اور ان تمام خصوصیات کی حامل پیروڈی ہے، جو نظیر اکبر آبادی کے 'آدمی نامہ' کا خاصّہ ہے۔ واہی نے نہایت رواں دواں اسلوب میں اصل نظم کے ماحول اور موضوعات کو نہ صرف یہ کہ قائم رکھا ہے بلکہ اسے آگے بھی بڑھایا ہے۔ نیز کالجوں کے معلموں کی بے راہ روی، بے عملی اور ادبی عیاشیوں پر طنزیہ وار بھی کیے ہیں۔ آدمی نامہ کی پیروڈیوں میں واہی کی یہ پیروڈی خاص اہمیت کی حامل ہے۔ یہاں دو بند ملاحظہ فرمائیں:

طبعاً جو فلسفی ہے سو ہے وہ بھی لکچرر　　ذہناً جو منطقی ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
عقلاً جو مولوی ہے سو ہے وہ بھی لکچرر　　سہواً جو آدمی ہے سو ہے وہ بھی لکچرر
شکلاً جو رو رہا ہے سو ہے وہ بھی لکچرر

وہ بھی کہ جس کے علم کی پونجی قلیل ہے　　وہ بھی جو راہِ علم میں اک سنگِ میل ہے
وہ بھی ہے لکچرر، جو ادیب جلیل ہے　　وہ بھی ہے لکچرر کہ جو خانِ خلیل ہے
جو اس کی فاختہ ہے سو ہے وہ بھی لکچرر

دورِ جدید کی طنزیہ و مزاحیہ شاعری میں نظیر اکبر آبادی کی نظموں کو بروئے کار لا کے نت نئے موضوعات، مضحک صورتِ حال اور مزاحیہ واقعہ نگاری کے ذریعے ان کی فلسفیانہ اور عمومی طور پر سنجیدہ نظموں کو پیروڈی کی شکل میں پیش کرنے کا یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ 'روٹی نامہ' نظیر کی ایک اور معروف نظم ہے۔ مسٹر دہلوی نے اس کی پیروڈی بعنوان 'بیویاں' کی ہے۔ یہ نظم خالص مزاحیہ نوعیت کی ہے اور اس میں موضوع اور لفظی الٹ پھیر سے کام لے کر شاعر نے نت نئے مزاحیہ مرقعے تیار کیے ہیں۔ یہاں صرف ایک بند۔

سسرال میں جو میکے سے آتی ہیں بیویاں　　سو سو طرح سے دھوم مچاتی ہیں بیویاں
کھانے مزے مزے کے پکاتی ہیں بیویاں　　جینے کا جو مزہ ہے، چکھاتی ہیں بیویاں
کچھ دن تو خوب عیش کراتی ہیں بیویاں
پھر اس کے بعد خون رلاتی ہیں بیویاں

ایک اور دلچسپ اور مضحک پیروڈی کا ذکر یہاں ضروری ہے۔ نظیر کی ایک نظم 'عالم پیری' ہے، جس میں بڑھاپے اور اس کی مجبوریوں کا ذکر دلچسپ پیرائے میں کیا گیا ہے۔ مسٹر دہلوی نے اسی نظم کی پیروڈی 'موٹاپا' کے عنوان سے کی ہے ظاہر ہے کہ موضوع یکسر تبدیل ہو گیا ہے۔ مسٹر دہلوی نے ہر ہر بند میں موٹاپے کی مضحکہ خیزی اور فربہ آدمی کی کسمپرسی کی داستان مزاحیہ انداز میں بیان کی ہے۔ کلامِ نظیر سے استفادے کی یہ دلچسپ اور عمدہ مثال ہے۔ دو بند۔

موٹوں کے لبوں پر ہے صدا وائے مٹاپا　　اس فکر میں مرتے ہیں کہ گھٹ جائے مٹاپا
جاتا نہیں اک بار جو آجائے مٹاپا　　اور جائے تو موٹے کو بھی لے جائے مٹاپا
ہر شخص کو ہوتا ہے بُرا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

پتلون نہیں توند پہ ٹکنے ہی کو تیار　　ہر گام پہ کہتی ہے کہ ہشیار، خبر دار
اس سمت سے ٹانگوں کی مسلسل ہے یہ تکرار　　ہم مقبرہ بر دوش کہاں تک رہیں سرکار
ہر شخص کو ہوتا ہے بُرا ہائے مٹاپا
دشمن کو بھی اللہ نہ دکھلائے مٹاپا

مثالیں تو اور بھی ہیں مگر بہ خوف طوالت ان سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے۔ مختصراً عرض ہے کہ شعرائے طنز و مزاح نے از سید محمد جعفری تا پاپولر میرٹھی، نظیر اکبر آبادی کے کلام سے کماحقہٗ فیض اٹھایا ہے اور اپنی پیروڈیوں کے ذریعے ان کی سدا بہار نظموں کی آب و تاب کو ماند نہیں پڑنے دیا ہے۔ چنانچہ نظیر طنزیہ مزاحیہ شاعری کی روایت میں اولاً خود اپنی شعری کاوشوں کے ذریعے اور بعد ازاں پیروڈیوں کی بدولت اپنے وجود کا احساس دلاتے ہیں اور کون جانے اس وقت بھی کتنے ظریف شعرا ان کی نظموں کی تحریف میں مصروف ہوں۔

■

Dr. Mazhar Ahmad
3358, Kucha Jalal Bukhari, Bazar Delhi Gate
Daryaganj, New Delhi - 110002
Mob.:9212089910

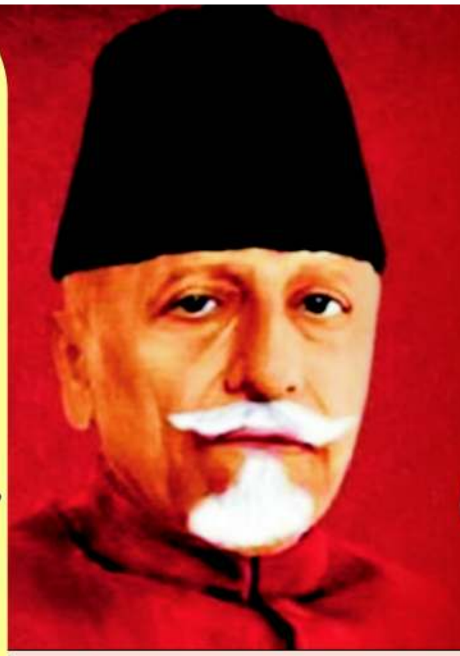

مولانا آزاد اور سائنس وٹکنالوجی

محمد اختر

مولانا ابوالکلام آزاد کی تعلیم وتربیت والد محترم کی نگرانی میں گھر کی چہار دیواری کے اندر ہوئی تھی۔ درس نظامی کی تکمیل کے علاوہ گھر پر فلسفہ، منطق، اقلیدس، الجبرااور ریاضی کے لیے الگ سے اساتذہ متعین کیے گئے تھے۔عربی، فارسی اور ترکی زبان وادب کے ساتھ علم کیمیا اورفلکیات کا علم بھی حاصل کیا تھا۔ بعد میں فرانسیسی اور انگریزی زبان سے بھی واقفیت بہم پہنچائی تھی۔مطالعے کا روگ دس برس کی عمر میں لگ چکا تھا۔ حالات اورعصری تقاضوں کے پیش نظر مولانا آزاد نے مشرقی علوم وفنون کے علاوہ جدید مغربی علوم وفنون کا بھی مطالعہ کثرت سے کیا، اس شوق کی تکمیل کے لیے ہند اور بیرون ہند سے سائنسی علوم کے تراجم حاصل کیےاور اپنی علمی تشنگی بجھائی۔

مولانا آزادکوعلوم جدیدہ کا شوق سرسید کے مضامین اوران کی تصنیفات کے مطالعے سے پیدا ہوا۔سرسید کی تصنیفات کے ذریعے ہی انھیں یہ علم ہوا کہ عصرجدید میں کوئی تعلیم اس وقت تک مکمل تصورنہیں کی جاسکتی ہے، جب تک کہ مغربی دنیا اور جدید علوم وفنون سے براہ راست استفادہ نہ کیا جائے۔اسی ضرورت کے پیش نظر مولانا آزاد نے انگریزی زبان سیکھی تھی،تاکہ براہ راست استفادے کی صورت پیدا ہوسکے۔’آزاد کی کہانی خودآزاد کی زبانی‘ میں عبدالرزاق ملیح آبادی رقم طراز ہیں:

’’سرسید کی تصنیفات کے مطالعے نے علوم جدیدہ سے نہ صرف آشنا، بلکہ شائق وگرویدہ بنا دیا تھا۔اب وہ دن تھا کہ عقائدوافکار میں ایک طوفان اٹھ چکا تھا۔میری زندگی اب چل نہیں رہی تھی، بہہ رہی تھی۔ تمام قدیم چیزیں حقیر وذلیل ہوچکی تھی۔علوم جدیدہ.... اور ہروہ چیز جوان کی طرف منسوب ہو، میرے قلب وذہن کے لیے بمنزلہ معبود کے تھی۔اب شوق ہوا کہ اردو، فارسی اور عربی میں نئے علوم کی جتنی کتابیں ترجمہ ہوئی ہیں، انھیں جمع کیا جائے۔مولوی حالی مرحوم کی کتاب ’جیالوجی‘ جومصر کے ایک عربی ترجمے کا ترجمہ ہے۔پیرزادہ محمد حسین کی ’منطق استقرائی‘ اورٹینسن کے لکچرر کا ترجمہ،لارڈ بیکن کی سوانح عمری، سائنٹیفک سوسائٹی، علی گڑھ کے بعض تراجم..... پنجاب کی لٹریری سوسائٹی کی کتابیں.... مولوی ذکاء اللہ کے بعض ترجمے، مرزاپوراورلکھنؤ چرچ مشن کے ابتدائی عہد کے علمی تراجم،سرکاری یونیورسٹیوں کے تعلیمی اورعلمی سلسلے کی تمام کتابیں منگوائیں اورشوق سے دیکھیں،مگران سے طبیعت کوسیری نہ ہوئی۔اب مصروشام کی کتابوں کا شوق ہوا۔مولانا شبلی کوایک خط لکھااوران سے دریافت کیا کہ علوم جدیدہ کے عربی تراجم کون کون ہیں اور کہاں کہاں ملیں گے؟.... انھوں نے دوسطروں میں جواب دیا کہ مصر وبیروت سے خط وکتابت کیجیے۔ خیر میں نے پہلے وہاں سے فہرستیں منگوائیں اورپھر کتابیں منگواتا رہا۔‘‘

(مولانا ابوالکلام آزاد (بروایت:عبدالرزاق ملیح آبادی) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی،ص 258-257،حالی پبلشنگ ہاوس،دہلی،اپریل 1958)

مولانا ابوالکلام آزاد کا یہ شوق مسلسل پروان چڑھتا رہا،عصری علوم کی کتابیں/تراجم خواہ کسی زبان میں میسر ہوں،انھیں حاصل کرتے اوراپنے ذوق وشوق کی تشنگی بجھاتے۔’احسن الاخبار‘ کے دفتر میں مصروشام اورطرابلس کے اخبارات کے علاوہ ’المنار‘ اور’الہلال‘ بھی دیکھنے کومل جاتے تھے،جن میں نئی نئی عربی کتابوں کی جانکاری ہوتی تھی۔مولانا آزاد ان میں سے کتابوں کا انتخاب کرتے اور منگواتے۔خدا بخش نامی کتابوں کے ایک تاجر کے یہاں سے بھی مولانا کو نادر ونایاب کتابوں کا ایک ذخیرہ ہاتھ لگا تھا، جن کے مطالعے سے ان کی معلومات میں خاطرخواہ اضافہ ہوا۔مولانا کے شوق وجنون کا یہ عالم تھا کہ انھیں جدید علوم اورسائنس سے متعلق کتابیں ہرزبان اورہر قیمت پرقبول تھیں۔ سائنس کی کتابوں سے متعلق استفسار کرتے ہوئے مولانا عبدالرزاق کانپوری کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

’’......دیگر یہ تحریر فرمائیں کہ آج کل سائنس کی جو کتابیں انگریزی میں لکھی جاتی ہیں۔ان کے ترجمے اردو میں بھی دستیاب ہوتے ہیں؟اگر یہ سچ ہے تو کہاں دستیاب ہوتے ہیں؟تحریر کیجیے گا۔‘‘

(مالک رام (مرتب) خطوط ابوالکلام آزاد،ص19،ساہتیہ اکادمی،نئی دہلی 1991)

مولانا آزاد کے والد نے اپنے دونوں بیٹوں کو طب کی تعلیم بھی دلوائی تھی۔مولانا نے اپنے شوق اورذاتی محنت سے نہ صرف قدیم، بلکہ جدید طب میں بھی ایک حد تک مہارت بہم پہنچائی تھی۔اس کا بین ثبوت 1915 میں منعقد ہونے والی طبی کانفرنس پٹنہ ہے،جس کی صدارت حکیم اجمل خاں نے فرمائی تھی۔کلکتہ کے مشہور طبیب حکیم نثاراحمد جواس کانفرنس کا حصہ تھے۔وہ فرماتے ہیں کہ مولانا نے اس موقع پردو گھنٹے تقریر فرمائی۔قدیم وجدید طب کے حوالے سے بہت جامع گفتگو کی اوراس فن کی باریکیاں بیان فرمائیں۔ان میں سے بعض باتیں تو نامور اطبا کو بھی نہیں معلوم تھیں۔دوسری طرف مولانا آزاد کی سائنسی فکر اورسوچ کی گواہی ان کے سائنسی مضامین اوربعض کتابیں ہیں۔مولانا آزاد تقریباًربع صدی تک صحافت سے وابستہ رہے۔اس دوران انھوں نے مختلف رسائل کے لیے نہ صرف سائنسی مضامین قلم بند کیے، بلکہ ’مرقع عالم‘ کے کہنہ مشق ایڈیٹرکوصرف چودہ برس کی عمر میں مشورہ دیتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

’’اس عریضہ کے ہمراہ ایک مضمون ’علوم جدیدہ

اوراسلام' کے عنوان سے ارسال خدمت کرتا ہوں۔ اسے 'مرقع' میں شامل کیجیے...... میں نے اس خیال سے کہ جب 'مرقع عالم' میں سائنس کے تراجم شائع ہورہے ہیں تو ان کی خرابیوں کا انسداد بھی ضرور بالضرور ہونا چاہیے۔ یہ مضمون 'علوم جدیدہ اوراسلام' آپ کے پرچہ کے لیے بھیجا ہے۔

(مالک رام (مرتب) خطوط ابوالکلام آزاد، ص 23-22)

مولانا آزاد نے اردو قارئین کے لیے بکثرت سائنسی مضامین لکھے، تاکہ انھیں جدید سائنسی معلومات اور تحقیقات سے آگاہ کیا جاسکے۔ مولانا آزاد کا پہلا مضمون 'ایکس ریز' پر تھا۔ اردو میں یہ اولین مضمون تھا۔ مولانا آزاد کے سائنسی مضامین مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہتے تھے۔ اس مسئلے پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاب قیصر رقم طراز ہیں:

''مولانا آزاد نے اردو پڑھنے والوں کو سائنسی علوم سے واقفیت حاصل کرنے کے لیے اور انھیں سائنسی تحقیقات سے آگاہ کرنے کی خاطر اچھوتے اور نت نئے موضوعات پر بے شمار مضامین لکھے اور اپنے دور کے سب ہی اخبارات اور رسائل میں انھیں شائع کرایا..... سائنس کے تمام شعبوں پر مولانا کی نظر تھی اور ان میں سائنسی علوم کا ادراک تھا۔ ادراک بھی ایسا کہ سائنس کے جس کسی موضوع پر وہ رقم طراز ہوئے، گویا ایسا معلوم ہوا کہ وہ اس شعبے کے ماہر ہیں۔ مضمون لکھنے کے لیے مواد تو وہ کسی نہ کسی انگریزی ماخذ سے لیتے تھے، لیکن سب سے پہلے اس موضوع پر تمہید باندھتے اور مضمون کے متن میں حسب ضرورت مثالوں، احادیث، اور قرآنی آیتوں کا حوالہ دیتے اور اپنے فہم وادراک سے اور خوبصورت طرز تحریر سے اس کو اتنا سہل بنادیتے تھے کہ پڑھنے والا شروع سے آخر تک پڑھتا اور لطف اندوز ہوتا تھا۔ وہ اتنے پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے، بلکہ آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے سائنسی اصولوں کی وضاحت کو، سائنس کی انگریزی اصطلاحات کی تشریح کو اور اردو میں ان اصطلاحات کے متبادلات کو اکثر اوقات مضمون کے فٹ نوٹ میں بیان کردیتے تھے۔''

(وہاب قیصر، مولانا ابوالکلام آزاد کی سائنسی بصیرت، ص 20-19، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی 2004)

جدید سائنسی علوم سے مولانا آزاد کو خاص شغف تھا اور مشرقی علوم وفنون ان کے رگ وریشے میں خون کی طرح دوڑ رہے تھے۔ وہ زمانے کے بدلتے ہوئے تیور کو سمجھ رہے تھے۔ ''بیسویں صدی کے عالمی تمدن کی پیچیدہ کیفیات پر ان کی نظر تھی..... جدید معاشرت ومعیشت کے تقاضوں کو وہ سمجھ رہے تھے..... انیسویں صدی کے مغربی سائنس، فلسفہ اور صنعت نے اپنی مادہ پرستانہ ترقیات کے نتیجے میں بیسویں صدی کے انسانی سماج کو جس استعماری واستحصالی سیاست کا شکار بنایا۔ اس کی ہمہ گیر تباہی پر مولانا آزاد کو سخت تشویش تھی۔ لہٰذا وہ اپنے ماحول میں مکمل انقلاب چاہتے تھے، تاکہ انسانیت کی تجدید، اصلاح اور ترقی نئی بنیادوں پر تازگی اور مضبوطی کے ساتھ ہو۔ آزادی، مساوات اور اخوت کے نعرے معاشرے کی ٹھوس حقیقت بن جائیں، دنیا کا کھویا ہوا توازن بحال ہوجائے، زندگی راہ راست پر آجائے اور انسان اپنے مقدر کی تعمیر وتکمیل کے لیے آزاد ہو۔''

(عبدالمغنی، مولانا ابوالکلام آزاد: ذہن وکردار، ص 19-18، انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی 2011)

مولانا آزاد ان مقاصد کو تعلیمی بیداری کے ذریعے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ جدید سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم کے بغیر ملک کی ضروریات اور حالات کے تقاضوں کو پورا نہیں کرسکتے اور نہ ہی ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں جگہ پاسکتے ہیں۔ مولانا آزاد ہندوستان کو ایک ایسے تعلیمی مرکز کے طور پر دیکھنا چاہتے تھے، جہاں غیر ممالک کے طلبا بھی سائنس وٹکنالوجی کی تعلیم کے حصول کے لیے آئیں۔ اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہوئے مولانا آزاد نے ایک موقعے پر فرمایا تھا:

''وزارت تعلیمات کا جائزہ حاصل کرتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلا فنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں، تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اعلا تعلیم کے حصول کے لیے جو ملک سے باہر جاتی تھی، خود ملک میں یہ تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ میں اس دن کا منتظر تھا اور اب بھی ہوں جب ہندوستان میں فنی تعلیم کی سطح اتنی بلند ہوجائے گی کہ باہر سے لوگ ہندوستان اس غرض سے آئیں گے کہ یہاں اعلا سائنسی اور فنی تعلیم وتربیت حاصل کریں۔''

وزارت تعلیمات کا جائزہ حاصل کرتے ہی پہلا فیصلہ جو میں نے کیا وہ یہ تھا کہ ملک میں اعلا فنی تعلیم کے حصول کے لیے سہولتیں فراہم کی جائیں، تاکہ خود ہم اپنی اکثر ضرورتوں کو پورا کرسکیں۔ ہمارے نوجوانوں کی ایک بڑی تعداد اعلا تعلیم کے حصول کے لیے جو ملک سے باہر جاتی تھی، خود ملک میں یہ تعلیم حاصل کرسکتی ہے۔ میں اس دن کا منتظر تھا اور اب بھی ہوں جب ہندوستان میں فنی تعلیم کی سطح اتنی بلند ہوجائے گی کہ باہر سے لوگ ہندوستان اس غرض سے آئیں گے کہ یہاں اعلا سائنسی اور فنی تعلیم وتربیت حاصل کریں۔

(ہمایوں کبیر (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: کتاب التذکرہ ص 32-131، مولانا ابوالکلام آزاد، اورینٹل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ، حیدرآباد 1961)

سائنس اور ٹکنالوجی کے فروغ کے لیے حکومت ہند نے 1947 میں ایک کمیٹی بنام 'سائنٹیفک مین پاور کمیٹی' تشکیل دی۔ اس کا سربراہ ڈاکٹر ایس بھٹناگر کو مقرر کیا اور ان کو دس سالہ منصوبہ (57-1947) تیار کرنے کی ذمے داری دی گئی۔ اس کمیٹی کے پنج سالہ منصوبے اور اس کی اہم تجاویز کو مختصراً جے۔ سی۔ گھوش نے یوں بیان کیا ہے:

''1 سائنس اور حرفیات کے بعض شعبوں میں جن پر اب تک کام نہیں ہوا۔ مخصوص نصاب تعلیم اور تحقیق کا انتظام۔

2 موجودہ اداروں میں اگر گنجائش ہو تو تعلیم وتحقیقات کے کاموں میں توسیع۔

3 ملک میں موجود پالی ٹکنکس (کثیر الفنی اداروں) میں اعلا تعلیم کا انتظام۔

4 بعض موجودہ اداروں میں مختلف نصاب کی تعلیم پانے والے طلبا کے داخلوں میں اضافہ۔

5 فنی عملے کے نگراں کاروں کی تربیت صنعت وحرفت کے ساتھ۔

6 چند منتخب اداروں میں منطقہ واری اساس پر پروڈکشن انجینئرنگ اور ڈیزائن انجینئرنگ کی تعلیم کے لیے سہولتوں کا فراہم کرنا۔

7 ادارے کی تعلیم کے ختم کرنے کے بعد وظیفے دے کر عملی تعلیم کے حصول کا انتظام۔''

(ہمایوں کبیر (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: کتاب التذکرہ ص 270)

ان تجاویز کو بہت حد تک عملی صورت دی گئی، جس کے نتیجے میں سائنس اور ٹکنالوجی کی تعلیم میں سہولیات اور وسائل کا گراں قدر اضافہ ہوا۔ مولانا آزاد نے حسن تدبیر سے قلیل مدت میں کئی اہم سائنسی وتکنیکی ادارے قائم کیے، جن میں چند یہ ہیں:

- آل انڈیا کونسل فار ٹیکنیکل ایجوکیشن
- انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی، کھڑک پور (جو آج 'انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی' کھڑک پور کے نام سے پوری دنیا میں مشہور ہے۔)
- انڈین کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ
- انڈین کونسل فار ایگریکلچر اینڈ سائنٹیفک ریسرچ
- انڈین کونسل فار میڈیکل ریسرچ سینٹر

یہ ادارے مولانا آزاد کی دوراندیشی اور مستقبل شناسی کی روشن مثال ہیں۔ انھوں نے ممتاز ماہرین تعلیم کی مدد سے سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں دن دونی رات چوگنی ترقی کا ایک جامع منصوبہ بنایا تھا۔ 1950 میں 'سینٹرل ایڈوائزری بورڈ' کے اجلاس میں صدارتی تقریر کرتے ہوئے مولانا آزاد نے فرمایا تھا:

''فنی تعلیم کے معیار کو بہتر بنانے کے لیے جو لائحہ عمل ہمارے پیش نظر تھا۔ وہ چار اعلا حرفیاتی اداروں کا قیام نیز موجودہ اداروں کی تقویت تھی۔ مالیہ نے اجازت نہیں دی کہ ہم چاروں کا ایک ساتھ قیام عمل میں لائیں، لیکن ہم نے سوچا کہ کام کی ابتدا تو کی جانی ضروری ہے۔ اس لیے بغیر تمام ضروری عمارتوں کی تعمیر کا انتظار کیے کلکتہ سے قریب مشرق میں اعلا حرفیاتی ادارہ قائم کیا گیا۔ ابھی کام ہو رہا ہے اور مجھے امید ہے کہ آئندہ تعلیمی سال میں ہم اساتذہ و طلبا کے پہلے گروہ کو اس ادارہ میں کام کرتا پائیں گے۔ ساتھ ساتھ ہمارا مقصد یہ بھی ہے کہ موجودہ اداروں کی حالت کو بہتر بنائیں اور ان کی کارکردگی کی صلاحیت میں اضافہ کریں۔''

(ہمایوں کبیر (مرتب) مولانا ابوالکلام آزاد: کتاب التذکرہ، ص 127)

جدید ٹکنالوجی میں اعلا فنی تعلیم اور طلبا کی استعداد میں اضافے کے لیے 'انسٹی ٹیوٹ آف ہائر ٹکنالوجی' کھڑک پور کا قیام عمل میں آیا۔ یہ ادارہ 1951 میں تعمیر ہوا اور بعد میں 'انڈین انسٹی ٹیوٹ آف ٹکنالوجی' کھڑک پور کے نام سے پوری دنیا میں شہرت پائی۔ انجینئرنگ کے ابتدائی اور بنیادی کورسز کے ساتھ، نیول آرکیٹکچر، اگریکلچرل انجینئرنگ، آرکیٹکچر کی ڈگریوں کے علاوہ پروڈکشن انجینئرنگ کے کئی شعبوں میں پوسٹ گریجویشن، اور مینجمنٹ اسٹڈیز کے قلیل مدتی پروگرام شروع ہوئے اور طلبا کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ آج یہ ادارہ اپنی ایک الگ شناخت رکھتا ہے۔ یہ اعلا فنی تعلیم و تربیت کا ادارہ مولانا آزاد کا ایک تاریخی کارنامہ ہے۔

اسی طرح کونسل فار سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ (CSIR) کا قیام 1942 میں عمل میں آچکا تھا۔ 1949 میں اس ادارے کی توسیع کی طرف مولانا آزاد نے خصوصی توجہ دی۔ مولانا آزاد نے بحیثیت وزیر تعلیم CSIR کو ہمہ جہت ترقی دی۔ مولانا آزاد کی کاوشوں پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاب قیصر لکھتے ہیں:

''مولانا نے CSIR کے لیے سائنس انفرااسٹرکچر کی ترقی کو جو سمت بخشی تھی، وہ لائق تحسین ہے۔ بقول مولانا آزاد: ''وہ CSIR کے امور میں بحیثیت وزیر نہیں، بلکہ آفس بیرر شامل رہتے تھے۔'' قوم کی ترقی میں سائنس کے اہم رول کے بارے میں مولانا آزاد کے خیالات واضح تھے۔ وہ اپنے ملک کے سائنسی ماہرین کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ سائنسی علوم کو سماجی ترقی کے لیے بروئے کار لائیں اور اس بات کا انتباہ دیتے ہیں کہ وہ سائنس اور ٹکنالوجی کی دریافتوں اور ایجادوں کے انسانیت سوز استعمال سے باز رہیں۔''

(وہاب قیصر، مولانا ابوالکلام آزاد کی سائنسی بصیرت، ص 173)

مولانا آزاد سائنس اور ٹکنالوجی کے تعمیری اور تخریبی دونوں پہلوؤں سے بخوبی واقف تھے۔ اسی لیے انھوں نے سائنس اور دیگر مغربی علوم وفنون کے ساتھ مذہبی تعلیم اور اخلاقی پہلو پر خاصا زور دیا ہے۔ مولانا آزاد ایک خاموش طبع شخص اور عملی زندگی کے پیکر تھے۔ ان کا فلسفۂ حیات اور فلسفۂ تعلیم بہت واضح تھا، وہ تعلیم کو زندگی کی تیاری سے تعبیر کرتے تھے اور ایک ایسے نظام تعلیم کے خواہاں تھے، جس میں عقائد کی پختگی، سچی دین داری، انسان دوستی اور عدل وضبط جیسی اقدار شامل ہوں، تاکہ سیرت کی تعمیر میں کوئی کجی نہ رہ جائے اور طلبا جدید سائنس اور ٹکنالوجی کے تخریبی پہلو سے خود کو بچالے جائیں۔

ابتدائی پانچ برس کے منصوبہ کے تحت 'کونسل آف سائنٹیفک اینڈ انڈسٹریل ریسرچ' کا قیام عمل میں آیا، جس کا خاص مقصد جنگ کے وسائل کی فراہمی اور قومی زندگی کی ترقی کے لیے دوسرے مفید عناصر کی فراوانی تھی۔

آمد و رفت اور نقل وحمل کے ذرائع کو بڑھانے کے لیے (CRRI) سینٹرل روڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کا قیام 1952 میں عمل میں آیا، تاکہ زراعت، کامرس اور انڈسٹریز میں ترقی کے مواقع زیادہ پیدا ہوں۔ اس ادارے کا افتتاح مولانا آزاد نے 16 جولائی 1952 میں کیا اور سائنس وٹکنالوجی کے میدان میں ہو رہی تعمیر و ترقی کو تفصیل سے بیان فرمایا۔ اس کے علاوہ تعمیری اور تحقیقی ضرورتوں کے پیش نظر 'سینٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' (CBRI) کا تشکیل عمل میں آیا، تاکہ عمارتوں کی تعمیر، تحقیق اور حفاظت کا مناسب انتظام ہوسکے۔ یہ ادارہ 1953 میں قائم ہوا تھا۔ اس ادارے پر روشنی ڈالتے ہوئے وہاب قیصر لکھتے ہیں:

''سینٹرل بلڈنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کو 1953 میں روڑکی میں قائم کیا گیا۔ اس ادارے کا افتتاح مولانا آزاد کے ہاتھوں 12/اپریل 1953 کو عمل میں آیا، جو CSIR کے تحت پنچ سالہ منصوبہ میں قائم ہونے والی گیارہ قومی لیباریٹریوں میں سے آخری لیبارٹری تھی۔ آزادی کے ابتدائی پانچ سال میں ان لیباریٹریوں کا قیام ہندوستان کی صنعتی ترقی کی راہ میں سنگ میل ثابت ہوا۔ ہمارے ملک کی قومی صنعتوں کے ارتقا اور فروغ میں سائنس اور ٹکنالوجی کو بروئے کار لانے کی یہ پہلی باقاعدہ اور منصوبہ بند کوشش تھی۔''

(وہاب قیصر، مولانا ابوالکلام آزاد کی سائنسی بصیرت، ص 175)

مولانا آزاد نے سائنسی علوم اور جدید ٹکنالوجی کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مسلسل تگ و دو کی تھی۔ انھوں نے کئی اہم سائنس وٹکنالوجی اور میڈیکل سائنس کے ادارے قائم کیے، اور جدید سائنسی تحقیقات کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا۔ تاکہ ہمارا ملک اس میدان میں ترقی یافتہ ممالک کی ہمسری کرسکے۔

اس ادارے کے ذمے چار اہم کام تھے، جن میں بلڈنگ میٹریل کی جانچ، تعمیر کے طریقے، عمارتوں کی دیرپائی سروے اور اطلاعات کے ڈویژن بھی بنائے گئے تھے، تاکہ وہ عمارتوں کے میٹریلس اور مضبوطی کو جانچ پرکھ سکیں۔

جدید سائنس اور میڈیکل کے فروغ کے لیے مولانا آزاد کی کاوشیں ہمیشہ یاد رکھی جائیں گی۔ انھوں نے جدید سائنسی تحقیقات کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر بہت زور دیا تھا۔ اسی سمت میں ایک عملی قدم اٹھاتے ہوئے مولانا آزاد نے 'الکٹرانک انجینئرنگ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ' قائم کیا تھا، جو CSIR کے ماتحت تھا۔ مولانا آزاد کی موجودگی میں جواہر لال نہرو نے 21/ستمبر 1953 کو اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس ادارے کے قیام کے ساتھ قومی اداروں کی تعداد اکیس تک پہنچ گئی تھی۔ اس موقع پر الکٹرانکس کے شعبوں میں جو نمایاں کام ہوئے تھے، اس پر مولانا آزاد نے روشنی ڈالی۔ آگے چل کر الکٹرانکس کی یہ تحقیق رڈار کی دریافت کا باعث ہوئی۔

مولانا آزاد نے سائنسی علوم اور جدید ٹکنالوجی کی ہمہ جہت ترقی کے لیے مسلسل تگ و دو کی تھی۔ انھوں نے کئی اہم سائنس وٹکنالوجی اور میڈیکل سائنس کے ادارے قائم کیے، اور جدید سائنسی تحقیقات کو عصری تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے پر زور دیا۔ تاکہ ہمارا ملک اس میدان میں ترقی یافتہ ممالک کی ہمسری کرسکے۔

■

Dr. Mohd Akhtar
Vasanta College for Women
Rajghat, Varanasi- 221001
Mo.: 9793857521
Email.: akhtarvcr@gmail.com

فاروق بخشی

جانے والے کو کہیں روک سکا ہے کوئی

پروفیسر فضل امام کی یاد میں

عصر حاضر کے ممتاز ادیب، نقاد، دانشور اور شاعر پروفیسر فضل امام رضوی بھی اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ وہ عرصۂ دراز سے صاحب فراش تھے اور علالت کے دور سے گزر رہے تھے۔ جو اس جہان فانی میں آیا ہے وہ یقیناً یہاں سے جائے گا اس سنگین حقیقت کے باوجود کئی شخصیتوں کا محفل جہاں سے یوں چلے جانا دلوں پر شاق گزرتا ہے۔ فضل امام صاحب جنھیں اب مرحوم لکھنا ہی پڑے گا ایسی شخصیات میں شامل تھے جن کے بغیر بزم علم وادب عرصۂ دراز تک سونی سونی نظر آئے گی۔ ان کی تحریر ان کی تقریر اور ان کی بذلہ سنجی سے پر نکتہ سنجی ایسے اوصاف تھے جو ہر محفل کو زعفران زار بنا دیتے تھے۔ ان کی باغ و بہار شخصیت اور ان کے نپے تلے تیز طرار جملے اچھے اچھوں کو سنبھلنے کا موقع نہیں دیتے تھے جو ان کے دوست بھی تھے اور دشمن بھی مگر فضل امام ہمیشہ اپنی کج کلاہی کے بھرم کو قائم رکھتے تھے۔ ترقی پسند فکر کے حامل تھے اور پھر جو شخص کربلا کو حرز جاں بنائے ہوئے ہو وہ حسین کے ساتھ ساتھ احتجاج اور انقلاب کو بھی سمجھتا ہے۔

میری ان کی پہلی ملاقات 1979 کی جاتی ہوئی سردیوں کے دنوں میں جے پور کے ایک مشاعرے میں ہوئی۔ میں ان دنوں اجمیر میں تھا۔ میرٹھ سے قبلہ حفیظ میرٹھی کا خط آیا کہ جے پور میں فلاں تاریخ کو مشاعرہ ہے۔ میں اجمیر آجاتا ہوں وہاں سے دونوں جے پور چلیں گے۔ حفیظ صاحب صبح سویرے اجمیر پہنچ گئے۔ دوپہر والی ٹرین سے ہم دونوں جے پور پہنچ گئے۔ رات کو مشاعرے میں میرٹھ کے پدم شری حکیم سیف الدین بھی مجلس صدارت پر جلوہ افروز تھے۔ غالباً سیف صاحب کے ایک عزیز نصر بھائی مشاعرے کی انتظامیہ کمیٹی سے متعلق تھے۔ میرے ایک عزیز دوست اختر عادل جو شعبہ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف میں انجینئر تھے ان دنوں وہیں تعینات تھے۔ معروف جدید شاعر ممتاز شکیب بھی وہاں آل انڈیا ریڈیو کے عہدے دار تھے اور میرٹھ ان کی سسرال تھی۔ یوں اس مشاعرے میں میرٹھ والوں کا بول بالا تھا۔ فضل امام صاحب کو وہیں پہلی مرتبہ شعر پڑھتے ہوئے دیکھا بھی اور سنا بھی۔ آواز بڑی کڑک دار اور گھن گرج والی تھی، لہجہ کچھ پوربی انداز لیے ہوئے ضرور تھا مگر ذہن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ پتہ چلا ڈاکٹر فضل امام راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی میں صدر شعبہ ہیں۔ ہماری تو طالب علمی کا زمانہ تھا اور ہماری خو بو بھی فدویانہ تھی۔ اگلے روز ممتاز شکیب صاحب نے مجھے حفیظ میرٹھی اور فضل امام صاحب کو ریڈیو کی ادبی نشست کہکشاں کے لیے مدعو کر لیا۔ کیا تو وسیم بریلوی کو بھی تھا مگر انھیں کسی دوسرے مشاعرے کے لیے نکلنا تھا سو معذرت کر لی۔ فضل امام صاحب کا رویہ اپنے خوردوں کے ساتھ عام طور پر دوستانہ ہوا کرتا تھا۔ ممتاز شکیب یونیورسٹی میں ان کے طالب علم رہے تھے مگر یہ تعلق بے تکلف دوستی میں تبدیل ہو گیا تھا اور وہ شکیب صاحب کو بڑی بے تکلفی سے ''شکیبا'' کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔

ریڈیو کی نشست کے بعد آکاش وانی کی کینٹین میں کافی کے لیے گئے۔ وہ اپنی گل افشانیِ گفتار سے سب کو محظوظ کرتے رہے۔ میری طرف دیکھ کر کہنے لگے میاں اچھا پڑھتے ہو۔ میں سمجھ گیا یہ ایسی ہی تعریف تھی جیسے مولانا ابو الکلام آزاد کی تقریر سن کر حالی نے کہا تھا۔ میاں اچھا بول لیتے ہو۔ جی میں تو آئی کہہ دوں حضور اچھا کہنے کی کوشش بھی کرتا ہوں مگر خاموشی کو ہی اپنی عافیت جانا کیونکہ میں آئندہ کے امکانات کو محدود نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پھر تو ان سے خط و کتابت کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ دسمبر 1980 میں دہلی منتقل ہو گیا تو وہ جب بھی دہلی آتے پہلے سے اپنی آمد سے مطلع کرتے اور میں ان کی قیام گاہ پر حاضر ہوتا۔ دوسری اور یادگار ملاقات راشٹرپتی بھون کے مشاعرے میں ہوئی۔ گیانی ذیل سنگھ ان دنوں صدر جمہوریہ تھے۔ اردو ان کی زبان تھی۔ شعر و شاعری کے رسیا۔ مجھے دیکھتے ہی زور سے بولے اے بخشی یہاں بھی !دم ہے بھئی دم ہے۔ مشاعرے میں انھوں نے اپنی پاٹ دار آواز میں کوئی نظم سنائی ان کا خطیبانہ انداز ذاکری کا

تجربہ کل مجمع پر چھا گئے۔ اس دن میں نے ترنم سے غزل پڑھی۔ داد دیتے ہوئے بولے اچھی آواز ہے میں نے کہا امام صاحب کبھی شعر کی تعریف بھی کیجیے تو مسکرا کر رہ گئے۔ میں نے یہ واقعات اس لیے بیان کیے کہ زیادہ تر احباب ان کی شعری شخصیت سے ناآشنا ہیں بالکل ان کے استاد پروفیسر محمود الٰہی کی شخصیت کی طرح۔ کتنے لوگ واقف ہیں کہ وہ ایک زمانے میں محمود الٰہی زخمی ہوا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں فضل امام صاحب کو مشاعروں میں نظامت کرنے کا شوق ہوا۔ اللہ نے شخصیت اور آواز میں دم دیا تھا اور سونے پر سہاگہ ان کے استاد بھائی ڈاکٹر ملک زادہ منظور احمد اس میدان کے مرد کامل تھے۔ کچھ احباب کے اصرار پر وہ اس میدان میں بھی اتر آئے۔ میرٹھ، بلند شہر اور دوسرے کئی شہروں میں ہم نے بھی انھیں شاعر کے علاوہ بحیثیت ناظم بھی مدعو کیا۔ ان دنوں لکھنؤ میں والی آسی نے کچھ پاکستانی شاعروں کے مجموعے شائع کیے تھے۔ شکیب جلالی ان کے پسندیدہ شاعر تھے ان کا تقریباً تمام مجموعہ انھیں ازبر تھا۔ دوران نظامت شکیب جلالی کے اشعار بے دریغ سنایا کرتے تھے۔ مگر دو چار مشاعروں کی نظامت کے بعد ہی انھیں اندازہ ہوگیا تھا کہ ذاکری الگ شعبہ ہے اور مشاعرے کی نظامت ایک بالکل ہی الگ دنیا ہے اس میں تحکم سے زیادہ تکلم کا کمال دکھانا ہوتا ہے اور سچ پوچھیے تو ان کے علمی و ادبی کاموں اور تنقیدی و تحقیقی کارناموں کے بوجھ تلے ان کا شاعر دبتا ہی چلا گیا۔ ایسے ہی ناجانے کتنے نام ہیں آل احمد سرور، محمود الٰہی، قمر رئیس۔ اس لیے شاعری بقول گوپال متل پورے مرد کی متقاضی ہوتی ہے۔

جنوری 1986 میں راجستھان ہایر ایجوکیشن سروسز کے تحت میرا تقرر بحیثیت لیکچرر وہاں ہوگیا۔ میں نے انھیں خط لکھ کر مشورہ چاہا کہ مجھے راجستھان کے کس شہر کا انتخاب کرنا چاہیے۔ ان کا تفصیلی جواب آیا لکھا کہ ویسے تو راجستھان کا ہر ذرہ اپنی مثال آپ ہے مگر آپ کے لیے کوٹہ بہتر رہے گا اس لیے کہ کوٹہ سے دہرہ دون ایکسپریس اور فرنٹیر میل ہر دن میرٹھ کے لیے جاتی ہیں اور اس طرح تم اپنے والد کی خبر گیری کا فریضہ بھی ادا کر سکو گے۔ میں نے ان کے مشورے پر لبیک کہا اور کوٹہ کے پوسٹ گریجویٹ شعبۂ اردو کو جوائن کرلیا۔ پورے چھبیس برس کوٹہ میں بسر ہوئے، پوری جوانی کوٹہ میں گزری مگر وطن مالوف سے بھی تعلق برقرار رہا۔ فضل امام صاحب کا مشورہ بہت سودمند ثابت ہوا۔

1986 میں انجمن کل ہند ترقی پسند مصنفین کی گولڈن جوبلی کا سال تھا۔ دہلی میں قمر رئیس صاحب کی سرپرستی میں سہ روزہ عالمی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ قمر رئیس صاحب کا خیال تھا کہ صوبائی انجمنوں کو بھی اپنے یہاں کانفرنسوں کا انعقاد کرنا چاہیے۔ راجستھان انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کی جانب سے اس بارگراں کو اٹھانے کی ذمے داری انھوں نے اپنے سر لے لی۔ وہ صوبائی شاخ کے صدر تھے۔ پروفیسر فیروز احمد جنرل سکریٹری اور میں سکریٹری۔

انھوں نے راجستھان کے تمام سرکردہ ادیبوں اور شاعروں کو انجمن ترقی پسند مصنفین سے جوڑ لیا تھا۔ 18,19 اکتوبر 1986 کو جے پور میں راجستھان انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کا انعقاد عمل میں آیا۔ قمر رئیس صاحب کا حکم تھا کہ میں 17 اکتوبر کو ہی جے پور پہنچ جاؤں تاکہ فضل امام صاحب اور فیروز صاحب کا ہاتھ بٹا سکوں۔ میں مسلم مسافر خانے میں مقیم تھا۔ جہاں اس زمانے میں راجستھان کے تمام ادبا و شعرا قیام کیا کرتے تھے، ایک طرح سے وہ راجستھان کے ادبا و شعرا کا میٹنگ پوائنٹ تھا۔ قمر رئیس صاحب نے یہ بھی لکھا تھا کہ ہم سب دہلی سے احمد آباد میل سے جے پور کے لیے روانہ ہوں گے۔ مجھے علم تھا کہ احمد آباد میل صبح سویرے جے پور پہنچ جاتی ہے۔ میں بروقت اسٹیشن پہنچ گیا مجھ سے پہلے وہاں پروفیسر فیروز احمد صاحب مہمانوں کے استقبال کے لیے موجود تھے۔ دہلی سے قمر رئیس صاحب کے ہمراہ پروفیسر عتیق اللہ اور پروفیسر صادق بھی ٹرین سے برآمد ہوئے۔ یہ قمر رئیس صاحب کا کمال تھا کہ وہ لوگوں کو جوڑنا جانتے تھے۔ ان کی شخصیت کی سادگی سب کا من موہ لیتی تھی۔ نوجوانوں میں ارتضیٰ کریم اور ابن کنول اور کئی دوسرے بھی آئے تھے۔ فیروز احمد صاحب کچھ متفکر سے تھے۔ استفسار پر انھوں نے بتایا کہ ترقی پسندوں کی اس کانفرنس کے مخالفین نے شہر میں پمفلٹ بٹوائے ہیں اور یہ پرچار کیا جا رہا ہے کہ منکرین خدا اور اسلام مخالف لوگوں کی کانفرنس ہے ان کا فکرمند ہونا بجا تھا۔ تھوڑی دیر میں فضل امام صاحب بھی تشریف لے آئے دوران گفتگو انھوں نے تمام مسائل کو اپنے قہقہوں میں اڑا دیا۔ بولتے وقت انھیں الفاظ دہرانے کی عادت تھی۔ کہنے لگے ہم کربلائی ہیں انقلاب کے جویا اور حسین کے پرستار ہیں۔ ہم کسی سے ڈرنے دبنے والے نہیں ہیں۔ ان کی دیکھ ریکھ میں دو روزہ یادگار کانفرنس منعقد ہوئی۔ تمام سرمائے کا بندوبست بھی انھوں نے کیا تھا۔ اس کانفرنس میں مذکورہ بالا احباب کے علاوہ سردار جعفری جیسی عظیم المرتبت شخصیت بھی موجود تھی۔ علی احمد فاطمی، پروفیسر افتخار ظفر، پروفیسر محمود الحسن بھی تشریف لائے تھے۔ راجستھان کے ادیبوں میں ڈاکٹر حبیب الرحمٰن نیازی، ڈاکٹر رفعت اختر خاں، سید معظم علی، ممتاز شکیب، ڈاکٹر روشن اختر کاظمی، ڈاکٹر مدبر علی زیدی، ڈاکٹر ابوالفیض عثمانی جے پور کی سرکردہ علمی اور ادبی شخصیت انعام الحق سے بھی ان کا یارانہ تھا اور اس کانفرنس میں انعام الحق صاحب نے بہت کلیدی کردار ادا کیا تھا۔ کانفرنس کے تمام شرکاء اور مندوبین کی ضیافت کا اہتمام انعام الحق صاحب کی کوٹھی پر ہوا تھا۔ جس میں کئی سو لوگوں نے شرکت کی تھی۔ رات کو ان کی کوٹھی کے وسیع صحن میں محفل مشاعرہ بھی سجائی گئی تھی۔ انعام الحق صاحب کے انتقال کے بعد اب جے پور میں اردو کا ایسا شیدائی ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملے گا۔ فضل امام صاحب کی سرگرمی، سرکردگی اور سربراہی قدم قدم پر جلوہ گر ہو رہی تھی۔ سب ان کے حسن انتظام کی داد دے رہے تھے دوسرے دن شام کو تمام مہمان رخصت ہوگئے۔ ابن کنول اور ارتضیٰ کریم کہنے لگے ہم کل جائیں گے۔ آج تم ہمیں جے پور سیر کے لیے لے چلو۔ رات کا وقت تھا ہم سب پیدل ہی مرزا اسماعیل روڈ پر چلے جاتے تھے کہ سامنے سے شیروانی میں ملبوس ایک صاحب کو برقعہ پوش خاتون کے ساتھ ایک رکشا پر آتے ہوئے دیکھا۔ دل کو یقین نہیں ہوتا تھا کہ دن میں جس شخص کو سوٹ اور ٹائی میں دیکھا تھا وہ اب رات کو شیروانی میں۔ رکشا قریب آیا تو یقین پختہ ہوا کہ فضل امام صاحب ہی ہیں۔ وہیں رکشا پر سے زور سے بولے اے بخشی! دن میں ہوگئی ترقی پسندی، اب ہم مجلس میں جا رہے ہیں، حسین کی بارگاہ میں۔ یہ تھے ہمارے فضل امام صاحب۔ اسی سال انھوں نے الٰہ آباد کے لیے رخت سفر باندھا۔ وہاں پہلے ریڈر اور بعد میں پروفیسر مقرر ہوئے۔ مگر ان کی شخصیت پر جو بہار راجستھان کے صحراؤں میں آئی تھی وہ گنگا جمنا کے سرسبز و شاداب علاقوں میں میسر نہ ہوسکی۔ حالانکہ اترپردیش ان کے بزرگوں کی سرزمین تھی بعد میں وہ اترپردیش کے چیف منسٹر ملائم سنگھ سے قربت کے سبب اترپردیش بورڈ آف سکینڈری ایجوکیشن کے چیرمین بھی مقرر ہوئے اور انھیں وزیر کا درجہ دیا گیا تھا۔ لیکن ان کے جانے سے راجستھان ایک جوہر قابل سے محروم ہوگیا۔ جس سے لوگوں کو بہت امیدیں تھیں۔ راجستھان یونیورسٹی کا شعبۂ اردو اور فارسی ان کے بعد اس ادبی گہما گہمی سے محروم ہوگیا جس کی ضرورت اردو والوں کے لیے ازحد ضروری ہے۔ مگر راجستھان ان کے دل میں بسا ہوا تھا اس رشتے کو مزید مضبوط کرنے کے لیے انھوں نے اپنی

ایک بیٹی کی شادی جے پور میں کی۔ ان کے داماد ڈاکٹر علی حسن بہت خوش مذاق اور قابل انسان ہیں۔ انگریزی ادب کے لیکچرر ہیں اور میرے حلقۂ احباب میں شامل ہیں۔

پروفیسر فضل امام کی پیدائش 7 اگست 1940 کو ضلع اعظم گڑھ کے موضع بہاء الدین پور میں ہوئی تھی۔ یہ ایک علمی و ادبی خانوادہ تھا۔ ان کے والد سید مشتاق حسین رضوی جو ریل کے محکمے میں ملازم تھے اردو و فارسی ادب سے واقفیت رکھتے تھے۔ ان کی ابتدائی تعلیم اس زمانے کے رواج کے مطابق مدارس میں ہوئی۔ ایم اے کی ڈگری آگرہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ اور پی ایچ۔ ڈی کے لیے اردو کے نام ور ادیب اور نقاد پروفیسر محمود الٰہی کی نگرانی میں تحقیقی مقالہ قلم بند کیا۔ ان کے مقالے کا موضوع امیر اللہ تسلیم حیات اور کارنامے تھا۔ ایک تو محمود الٰہی جیسے صاحب فہم و فراست کی نگرانی، دوم فضل امام جیسا زیرک ریسرچ اسکالر۔ اس تحقیقی مقالے نے جہاں امیر اللہ تسلیم کی شخصیت اور ان کے شعری محاسن کی بازیافت کی وہیں فضل امام صاحب کی قدر و قیمت میں بھی اضافہ ہوا اور وہ ادبی حلقوں میں ایک بالغ نظر نقاد تسلیم کیے جانے لگے۔ اس کے بعد تو ان کے قلم سے ایک سے بڑھ کر ایک ادبی کارنامے منظر عام پر آئے جس کی بدولت ان کی شہرت میں اضافے کے ساتھ اردو کا دامن بھی ان کی علمی و ادبی فتوحات سے بھرنے لگا۔

مرحوم کی تدریسی زندگی کا آغاز بلرام پور مہاراجہ کی یاد میں قائم شدہ کالج سے ہوا۔ وہ وہاں کئی برس تک اردو زبان و ادب کی تدریس سے وابستہ رہے۔ ان کی زندگی میں ایک زبردست تبدیلی اس وقت آئی جب انھوں نے راجستھان یونیورسٹی کے شعبۂ اردو و فارسی سے وابستگی اختیار کرلی۔ راجستھان میں ان کا قیام دو دہائی سے کچھ کم برس تک رہا۔ مگر یہ عرصے ان کے لیے بھی اور اہل راجستھان کے لیے بھی اردو زبان و ادب کی تدریس کے ساتھ ساتھ اس کی ترویج کے لیے بھی بہت سود مند ثابت ہوا۔ راجستھان میں ان کی آمد تازہ ہوا کے اس جھونکے کی طرح تھی جیسے پژمردہ کونپلوں میں جان پڑگئی ہو۔ راجستھان یونیورسٹی کی راہ داریاں اردو کے طلبہ و طالبات سے پر ہوگئیں۔ مذاکروں، مباحثوں، مشاعروں اور سمیناروں کی ایک نئی دنیا آباد ہوئی۔ 1986 کی گرمیوں میں انھیں الہ آباد یونیورسٹی سے بلاوا آیا اور وہ وہاں کے شعبۂ اردو میں پہلے ریڈر اور بعدہ پروفیسر مقرر ہوئے۔ وہاں کے ادبی حلقوں میں بھی ان کی خوب پذیرائی ہوئی۔ ہندی اور اردو دونوں زبانوں کے ادیبوں نے انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا۔ مگر وہ چمک کہیں کھوگئی تھی جس کی بدولت راجستھان کے ادبی صحراؤں میں بہار آگئی تھی۔ اس ویران میکدے کا نصیبا بھی سنورنے لگا تھا، جو انھوں نے الہ آباد جا کر حاصل کیا دیر سویر وہ انھیں یہاں بھی حاصل ہو جاتا مگر کئی فیصلوں کی نفسیاتی تہہ میں اترنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ حالانکہ جانے سے قبل وہ یہاں کے شعبۂ اردو و فارسی کو پوری طرح ایک مخصوص علمی و ادبی رنگ میں ڈھال چکے تھے۔ اداروں اور تنظیموں کی اہمیت اپنی جگہ مگر کئی مرتبہ ان کی شناخت اشخاص سے ہوتی ہے۔ جے پور سے ان کے جانے کے بعد پروفیسر فیروز احمد نے بہت سنبھالا۔ تنقید و تحقیق کے میدان میں شعبے کی شناخت کل ہند سطح پر ہوئی۔ مگر پروفیسر فیروز احمد کی سبکدوشی کے بعد وہاں راہ داریاں سونی پڑی ہیں۔ یہی حال اودے پور یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا ہے۔ جہاں پروفیسر ثاقب رضوی جیسا جید عالم شعبۂ اردو سے وابستہ تھا۔ صوبے کے پہلے وزیر اعلیٰ موہن لال سکھاڑیا بھی ان کے قدردانوں میں تھے۔ وہ خوبصورت شہر اردو کی مٹھاس سے خالی سا ہوگیا ہے۔ یہی حال جے پور کا ہے۔ زیادہ لکھوں گا تو لوگ ناگواری کا احساس کریں گے۔

شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد فضل امام صاحب لکھنؤ منتقل ہوگئے تھے۔ بہت پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ دمہ کا مرض تو انھیں پہلے سے تھا۔ شوگر کی زیادتی البتہ بہت پریشان کرتی تھی مگر ایسا کچھ نہیں تھا کہ یوں رخت سفر باندھ لیں گے۔ چند روز قبل ہی لکھنؤ کے کسی اسپتال میں داخل ہوئے اور کچھ روز کی علالت کے بعد ہی 13 اگست 2020 کو داعیِ اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اگست میں ہی وہ اس جہان فانی میں وارد ہوئے تھے اور اگست ہی میں اس دنیا کو خیر آباد کہہ دیا۔ کل اسی برس کی عمر پائی۔ اپنے پیچھے چار بیٹوں اور تین بیٹیوں نیز نواسی اور نواسوں پر مشتمل ایک بھرا پرا خاندان چھوڑ گئے۔ رہے نام اللہ کا... اپنے ایک قطعہ میں انھوں نے خود ہی اعتراف کیا تھا۔

جانے والے کو کہیں روک سکا ہے کوئی
پھول برساؤگے کیا آگ لگا کر جاؤ
مجھ سے مانگے نہ کہیں میری تمنا تجھ کو
اپنے دامن سے چراغوں کو بجھا کر جاؤ

پروفیسر فضل امام رضوی کے علمی و ادبی کارناموں کی فہرست خاصی طویل ہے۔ مگر ان کی جن تصانیف نے مجھے بے انتہا متاثر کیا ان میں امیر اللہ تسلیم پر تحریر کردہ ان کا تحقیقی مقالہ بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا طرز استدلال ان کے تحقیقی مرتبے کو بلند و بالا قرار دینے کے لیے کافی ہے۔ ان کے اس تحقیقی کارنامے سے امیر اللہ

> **شعبۂ اردو الہ آباد یونیورسٹی سے سبکدوشی کے بعد فضل امام صاحب لکھنؤ منتقل ہوگئے تھے۔ بہت پر سکون زندگی گزار رہے تھے۔ دمہ کا مرض تو انہیں پہلے سے تھا۔ شوگر کی زیادتی البتہ بہت پریشان کرتی تھی مگر ایسا کچھ نہیں تھا کہ یوں رخت سفر باندھ لیں گے۔ چند روز قبل ہی لکھنؤ کے کسی اسپتال میں داخل ہوئے اور کچھ روز کی علالت کے بعد ہی 13 اگست 2020 کو داعی اجل کو لبیک کہہ دیا۔ اگست میں ہی وہ اس جہان فانی میں وارد ہوئے تھے اور اگست ہی میں اس دنیا کو خیر آباد کہہ دیا۔**

تسلیم کی شخصیت اور کلام پر پڑا ہوا گرد و غبار اس طرح صاف ہوا کہ لوگ تسلیم کے مرتبے سے واقف ہوئے۔ ان کے اس کام کا اعتراف اتر پردیش اردو اکادمی نے انعام سے نواز کر کیا۔ میر انیس کی شخصیت اور ان کے فن کے تعین قدر میں ان کا ڈی لٹ کا مقالہ انیس شخصیت اور فن بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ انھیں یہ بھی اعزاز حاصل ہے کہ راجستھان کے اردو والوں میں وہ پہلے ڈی لٹ ہیں۔ جوش ملیح آبادی پر ان کی تصنیف شاعر آخر الزماں ان کی جوش کے تئیں عقیدت کی مظہر بھی ہے اور عصر حاضر میں جوش شناسی کے میدان میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ میرے نزدیک بھوج پوری زبان و ادب کا تعارف، تاریخ اور اردو سے اس کے لسانی رشتے کی اہمیت پر اس سے قبل اس طرح غور و فکر نہیں کیا گیا تھا۔ راجستھانی زبان و ادب کی تاریخ لکھ کر انھوں نے دوسروں کے لیے راستہ ہموار کیا۔ مجھے کہنے دیجیے کہ پروفیسر فیروز احمد کو راجستھان اور اردو کے لسانی روابط پر غور و فکر کرنے کی تحریک شاید ان کی اس تصنیف سے ہی ملی ہو۔ یقیناً پروفیسر فیروز احمد نے ایک ضخیم کتاب اس موضوع پر لکھ کر ماہرین لسانیات کو اردو کی ابتدا کے مختلف نظریات پر غور و فکر کی دعوت دی ہے۔ پروفیسر فضل امام کے جانے سے راجستھان اور اتر پردیش دونوں صوبوں کے علمی و ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھی ہوئی ہے۔

■

Prof. Farooque Bakhshi
Dept. of Urdu
Maulana Azad National Urdu University
Hyderabad - 500032 (Telangana)
Mob.:9829808782

موجودہ عہد کے بچوں کا ادب

صادقہ نواب سحر

ہم بڑے جو کچھ بچوں کے لیے لکھتے ہیں، وہ اکثر بچوں کی ذہن سازی کے لیے لکھتے ہیں۔ زمانے کے ساتھ ساتھ ادب بھی بدلتا گیا، بدلتا جاتا ہے، سوچ بدلتی جاتی ہے، قدریں بدلتی جاتی ہیں۔ 1894 میں Rudyard نے 'جنگل بک' لکھی تھی۔ اس کتاب میں ہندوستانی سماج کو دکھایا گیا ہے۔ بہترین منظر نگاری ہے۔ لیکن برٹش راج کے لیے محبت، عقیدت اور ان کی خدمت کے جذبے بھی دکھائے گئے ہیں۔ انگریز ایسی کتابیں لکھتے تھے اور نرم مٹی میں ایسے جذبات کے بیج بوتے تھے۔

پھر 1943 میں آر کے نارائن آئے۔ 'مال گڑی ڈیز' بچوں کے لیے لکھا۔ اس میں ہندوستانی تہذیب وثقافت کو اچھا اور قابلِ قدر دکھایا۔ اسے قبولیت دی۔ اس میں انگریزوں کے خلاف میٹنگیں لی جارہی ہیں۔ آزادی کے لیے جذبات پنپ رہے ہیں۔ ظلم کے خلاف اور آزادی کے لیے احتجاج کیا جارہا ہے۔

کہنے کا مطلب یہ ہے کہ زمانے کے لحاظ سے بچوں کی ذہن سازی کا کام چلتا رہتا ہے، بدلتا رہتا ہے۔

اکیسویں صدی انٹرنیٹ کا زمانہ ہے۔ ہتھیلی پر کتابیں، فلمیں اور نہ جانے کیا کیا آگیا ہے۔ بچوں کے ہاتھوں میں موبائل آگیا ہے۔ اگر ان کا ذاتی نہیں تو گھر والوں کا، دوستوں کا موبائل دستیاب ہے۔ ایک ویب سائٹ ہے جس پر 'ایسی ہندستانی کتابیں جو ہر ہندستانی بچے کو پڑھنا ہی چاہیے' مضمون دستیاب ہے۔ ان کتابوں کے موضوعات دیکھیے:

ایک کتاب ہے، نام ہے، 'دی بھیمایانا'۔ 'سری ودیا نٹراجن' اور 'ایس آنند' ان دو مصنفوں نے لکھی ہے۔ یہ دلتوں کو مرکز میں رکھ کر لکھی گئی ہے۔ اس میں اچھوت ہونے کے تجربے ہیں۔ قانون کہتا ہے کہ اونچ نیچ نہ کرو۔ پھر بھی دلتوں کو برا محسوس ہوتا ہے۔ شاید جانے انجانے ایسا محسوس کرایا جاتا ہو۔

'جے شری کلا تھل' کی ذہنی بیماریوں پر کتاب ہے، نام ہے، Sack cloth man (ٹاٹ کا کپڑا پہنا ہوا آدمی) اس میں دکھایا گیا ہے کہ ایک بچے کی راستے میں ایک پاگل آدمی سے دوستی ہو جاتی ہے۔ اس کتاب میں ان دو کرداروں کے علاوہ بچے کی ماں کی نفسیات کی عکاسی ملتی ہے۔

Flat Track Bullies (غنڈا گردی کرنے والے)، یہ 'بالا جی وینکٹ رمن' کی کتاب ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہر بچے کو انگریزی آنی چاہیے۔ یہ خیال بچوں میں احساس کمتری پیدا کرتا ہے۔ اسی complex کے بارے میں یہ کتاب لکھی گئی ہے۔

What Happend to Ragina that Night? (ریجینا کے ساتھ اس رات کیا ہوا؟) 'رائل شریواستو' نے لکھی ہے۔ اس میں ایک Nun کا خون ہو جاتا ہے اور بچے اس میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ اس کتاب میں تشدد بہت ہے اور سیاست بھی۔ یہاں سیاسی شناخت political identity کو سوال کیا گیا ہے۔

Slightly Burnt (ذرا سا جلا ہوا)۔ 'پایل دھر' کی تصنیف کردہ کتاب ہے۔ یہ 13 سے 19 سال کے بچوں کے لیے ہے۔ تھیم ہے، نئی دوستیوں کی تلاش اور خاص طور پر ہم جنسوں سے۔

ایک اور کتاب ہے، 'سدھارتھ شرما' کی کتاب The Grasshoppers' run (ٹڈے کی دوڑ)۔ ایسا مانا جاتا ہے کہ جنگ بچوں کے لیے نہیں ہوتی۔ جنگ میں انھیں کا نقصان سب سے زیادہ ہوتا ہے۔ اس کتاب میں جنگ موضوع ہے۔ بچے ہیں جو ناگا لینڈ میں جاپانی فوجیوں کے خلاف انھیں زیر کرنے کے کام میں ملوث ہیں۔

Queen of Ice (برف کی ملکہ) دیویکا رنگا چاری نے بچوں کے لیے لکھی ہے۔ یہ ایک تاریخی فکشن ہے۔ ایک شہزادی کشمیر کی ملکہ بن جاتی ہے۔ اور ظالم بن جاتی ہے۔

رنجیت لال کی ایک کتاب فرقہ وارنہ فساد پر مبنی ہے۔ نام ہے، 'Battle No.9' متوسط طبقے میں لڑکا، لڑکی میں تفریق کرنا عام سی بات ہے اسی کی نفسیات سے متعلق ہے۔

اسی طرح ریوتھی سریش نے Jobless, Clueless, Reckless' (بے خبر، لاپروا، مکار) نامی کتاب لکھی ہے، پارٹی میں جانے کے لیے جھوٹ بولنا۔ جھوٹی قسمیں کھانا۔ نشہ بازی، teenage pregnancies خاندانی زندگی کی مشکلیں اس ناول کے مسائل ہیں۔

کہنے کا مدعا یہ ہے کہ بڑوں کی کتاب پر تو خوب ہنگامہ مچایا جاتا ہے۔ لیکن بچوں کی کتاب یا ادب پر دھیان نہیں دیا جاتا۔ ان سے بچے کیا حاصل کر رہے ہیں، اس کا خیال نہیں۔ آخر یہ ساری کتابیں ہندوستانی ادیبوں ہی کی ہیں۔ ہندوستانی ادب کا حصہ ہیں۔ بچوں کے ذہنوں پر کیا اثر ڈالیں گی! دوسری زبانوں میں ترجمہ ہو کر قارئین کا بڑا حلقہ بھی بنائیں گی۔

ترجموں نے زبانوں کو علاقائیت سے نکال کر عالمگیریت کی راہ دکھائی ہے۔ عربی زبان کی مشہور داستان 'الف لیلیٰ' ترجمے کے ذریعے انگریزی میں رچرڈ فرانسس برٹن کے ذریعے پہنچی اور وہاں سے دنیا کی ساری زبانوں میں پہنچ گئی۔

دوسری زبانوں کے بچوں کو اپنی انگریزی بہتر کرنے کے لیے 'سنڈریلا' اور 'ریپنزیل' کہانیاں دی جاتی ہیں۔ انگریزی ذریعہ تعلیم والے بچے تو پڑھتے ہی ہیں۔ بتائیے کس بچے نے یہ کہانیاں نہیں پڑھی ہوں۔ چاہے وہ انگریزی کا ہو یا غیر انگریزی ذریعہ تعلیم کے لیے ترجمہ۔

سنڈریلا آدھی رات، کو بارہ بجے بغیر کسی کو بتائے گھر سے نکل کر لڑکے یعنی شہزادے سے ملنے جاتی ہے۔ ایسا ارادہ کرتے ہی غیب سے اس کے لیے مدد بھی آجاتی ہے۔ سلیپنگ بیوٹی، دی فراگ پرنس، سنو وائٹ، جیسی کہانیوں میں شہزادے کے ایک بوسے سے لمبے عرصے سے سوئی ہوئی شہزادی جاگ جاتی ہے۔ 'ریپنزیل' نظر بچا کر اپنی لمبی چوٹی قلعے کی دیوار سے لٹکا کر شہزادے کو اوپر بلا لیتی ہے۔

'پنچ تنتر' وغیرہ لوک کہانیوں میں سے بدلے اور مکاری جیسے جذبات بھی پیدا کر سکتے ہیں۔ اونٹ اور لومڑی جیسی کہانیوں کو سنانے یا بچوں کو یہ کتابیں ان کے ہاتھ میں دینے سے پہلے ایک بار ان پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان کہانیوں سے بچوں کے ذہن پر کیا اثر ہوتا ہوگا! یقیناً یہ سوچنے والی بات ہے۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ اسٹیریو ٹائپ یا روایتی انداز کے کرداروں کا بچوں کی کتاب میں در آنا عام سی بات ہے جیسے سوتیلی ماں اور لڑکی کی خوش دامن کے کردار۔ یہ برائی ظلم کی علامت بن گئی ہے۔ جبکہ یہ غلط ہے۔ لڑکیاں ساس کے اور بچے سوتیلی ماں کے تصور سے بھی کانپتے ہیں۔

نفرت کرتے ہیں۔ مسلمان اکثر غریب اوران پڑھ دکھائے جاتے ہیں۔ کبھی کوئی عقلمند ثروت مند کامیاب مسلمان ہیرو کا دوست تک نہیں ہوتا۔ اس کالباس زبان وغیرہ کا تصور منفی محسوس کروایا جاتا ہے۔

پھر ایسا ادب ہم بچوں کے آگے پروستے کیوں ہیں؟ اپنے بچے کیا پڑھ رہے ہیں، کیا دیکھ رہے ہیں، ہمیں پڑھ کر دیکھنا ہوگا۔ ہم صرف کتاب کی باہری خوبصورتی دیکھتے ہیں۔ اس کا سرورق دیکھتے ہیں۔ ادبی ہی نہیں مذہبی کتابوں میں بھی یہ خطرہ بنا رہتا ہے۔ بچوں کی اسلامی کتاب کے نام پر فروخت ہونے والی ایک مقبول عام کتاب کو پڑھتے ہوئے ایک دس سال کے بچے نے اپنی امی سے پوچھا، ''یہ بچہ کتنی خوشی سے اپنے دوستوں رشتہ داروں کے ساتھ سالگرہ منا رہا ہے۔ امی ہماری سالگرہ بھی کیوں نہیں مناتیں!''

پرنٹ میڈیا ہو یا الیکٹرانک میڈیا، یہ بات سب پر لاحق ہوتی ہے۔ کارٹون میں بھی بدتمیز بچے دکھائے جاتے ہیں۔ وہ لطف اندوز ہو رہا ہے۔ بچہ اس کی خرابی پکڑ لیتا ہے۔ سارے غلط کاموں کے بعد کردار کو سمجھ آتا ہے کہ اس کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ بعد میں افسوس اور احساس گناہ اور شرمندگی دکھائی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر گھر سے بھاگا ہوا بچہ پہلے مزے کرتا ہے۔ بعد میں پریشان ہوتا ہے۔ آخر میں کسی طرح گھر پہنچ جاتا ہے۔ جب کوئی بچہ ایسا پڑھے گا یا دیکھے گا تو ایسے کام کے لیے اس کی حوصلہ شکنی تو نہیں ہوگی۔ یہ خیال ضرور پیدا ہو سکتا ہے کہ چلو ہم بھی نکل جائیں۔ دنیا دیکھ لیں۔ ماں باپ تو کہیں گم ہونے والے نہیں۔

کہنا یہ ہے کہ غلط کاموں کو Adventurous نہیں دکھانا چاہیے۔ برائی کا صرف بیان کافی نہیں ہے۔ اس کی مذمت کرنا ضروری ہے۔ مثال کے طور پر فلموں میں چور کے پاس بنگلہ گاڑی ہے۔ لوگ اس کے آگے پیچھے پھرتے ہیں۔ اس طرح تو جو کوئی پیسہ کمانے پر مرکوز کرنے والا ہوگا۔ اس کو اچھا لگے گا۔ اس لیے برے کردار کو Glorify نہ کریں۔ انجام اچھا ہی ہوتا ہے نا۔ یہ سوچ کر کردار Adventure کے لیے قدم اٹھا رہا ہے۔ ایسا نہ دکھائیں کہ کچھ بھی کریں آخر میں ماں باپ کی گود میں بیٹھ جائیں گے۔ Reality سے بچتے نہیں نا بچے!

ڈرانے دھمکانے یا داداگری کرنے والا کردار پڑھنے دیکھنے والوں کو اچھا لگتا ہے۔ اگر اسے دکھائیں تو یہ ضرور دکھائیں کہ پیچھے لوگ کیا سوچتے ہیں۔ ڈرتے ہیں تو نفرت بھی تو کرتے ہیں چڑھتے ہیں۔ پیچھے سازش بھی تو کی جاتی ہیں۔ یہ دکھانا بھی تو ضروری ہے۔

یورپ میں بچوں کا ادب پہلے ہی تیزی سے تبدیل ہوتا آرہا ہے۔ اس کا اثر دوسرے ملکوں پر بھی تو پڑتا ہے۔ لیکن وہاں کی اخلاقی قدریں، وہاں کی تاریخ، جغرافیہ، نفسیات سب مختلف ہیں۔ وہاں عورتوں کے کپڑے پہننے والے مردوں کو مقرر کے طور پر اسکول میں مدعو کیا جاتا ہے۔ وقت اور جگہ کے لحاظ سے ادب تبدیل ہوتا رہتا ہے۔ یورپ میں انگریزوں کو ادب میں ہیرو بتایا بنایا جاتا ہے۔ ہم جسے جنگ آزادی کہتے ہیں وہ اسے غدر کہتے ہیں۔ ہمارے لیے مجاہدین جنگ آزادی ہیں وہ ان کے لیے نفرت کے قابل ہیں۔

اور زبانوں کی طرح اردو کے کچھ عمدہ نثر نگاروں اور شاعروں کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو اس سلسلے میں زبردست محنت کر رہے ہیں۔ بچوں کے لیے ادب کی مختلف اصناف کی تخلیق ان کی کوششوں کا ثمر ہیں۔ یہ یاد رکھنے کی ضرورت ہے کہ ادب تخلیق کرتے ہوئے اس خیال کا ذہن میں آنا کہ ہم لافانی ادب تخلیق کر رہے ہیں، ایک مضحکہ خیز سی بات محسوس ہوتی ہے۔ کیا کل چمکتے ہوئے کچھ ستارے آج ادب کے آسمان سے غائب نہیں ہو گئے ہیں۔ ان کا نام لیوا تک باقی نہیں ہیں۔ اور کیا کل دھول مٹی میں روندی ہوئی تخلیق یا ادب پارہ آج ادب کے فلک پر بہت احترام کے ساتھ روشن نہیں ہیں! ادب کو لکھنے کے بعد اپنی تخلیق سے بے نیاز ہو جانا ضروری ہے۔

Swift نے Gulliver'sTravel ایک سیاسی طنز کے طور پر لکھا تھا جس میں سیاح 'گلی وَر' کو بالشتیوں کی دنیا سے نپٹنا ہوتا ہے اور جو آج بہترین کہانیوں میں شامل ہے۔ کسی کو اس کے مقصد کا گمان تک نہیں ہوتا۔

نئی صلاحیتوں کی تلاش کرنا ضروری ہے بلکہ میں سمجھتی ہوں یہ تلاش ہر انسان کو اپنے آپ میں بھی ضروری ہے۔ پہلی کوشش بہت اہم ہوتی ہے۔ Starting problem میں الجھے رہنے سے بات نہیں بنتی۔ اس Barrier سے نکلنا ہوگا۔ کم سے کم بچوں کو احساس دلانا ہی ہوگا کہ وہ اچھا لکھ سکتے ہیں۔ اسکول کالج کے زمانے میں امتحانوں اور تقریری مقابلوں کے لیے ہی سہی ہر بچہ تخلیقی ادب رچتا ہے۔ بس یہی ہے کہ وہ جانتا نہیں کہ ادب تخلیق کر رہا ہے۔ یہ بات وہ جانتا اس لیے نہیں کہ رسالے پڑھنے کا رواج کم ہو گیا ہے۔ لکھنے کے لیے پڑھنا اور سننا یعنی جاننا ضروری ہے۔ جب وہ امتحان لکھ رہا ہوتا ہے، تب بھی وہ کسی ادب پارے پر اپنے خیالات کا اظہار کر رہا ہوتا ہے۔ تاریخ، سماجیات وغیرہ پر اس کی سوچ بن اور پنپ رہی ہے جس کو وہ تحریر تقریر کی شکل میں ڈھال رہا ہے۔ میں یہ بات اس لیے وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ رسالے کے لیے اپنی شاعری، مضمون، افسانہ، سفرنامہ، خاکہ یا کسی پینٹنگ پر شعر یا نثر میں کچھ لکھنے کے لیے کہا تو بچوں نے زیادہ ساتھ نہیں دیا۔ یعنی رسالے کی فائل دبلی پتلی رہی۔ تحریری، تقریری مقابلوں میں حصہ لینے والوں کے نام بھی بہت کم آئے۔ اس کے لیے میں نے ایک ترکیب نکالی۔ کلاس شروع ہوتے ہی جوابی پرچے طلبا میں تقسیم کر دئے۔ انھیں عنوان اور وقت دے کر لکھنے کے لیے تحریک دی۔

آج بچے بھی اپنا ادب خود تخلیق کر کے اپنے بڑوں کی مدد سے اس کی اشاعت کروا رہے ہیں۔ ایک بچی کی لکھی ہوئی ایک خوبصورت کتاب 'SUSHI' ہے۔ بہت مشہور ہوئی۔ Sushi کے گھر میں ایک کتا ہے۔ وہ تصور کرتی ہے کہ اس کے ساتھ وہ اڑتی ہے لوگوں کو بچاتی ہے وغیرہ۔ یعنی بچے اگر اپنے تجربات اور احساسات کو قلم بند کریں تو کیا غضب کا خوبصورت اور کارآمد ادب تخلیق ہوگا۔ بس ضرورت ہے تو صحیح رہنمائی کی۔

روکھی سوکھی تحریریں بچوں کو نصیحتوں جیسی لگتی ہیں۔ گھر کے بڑوں اور استادوں کی بالراست نصیحتوں، پھٹکار کو تو وہ سن لیتے ہیں، پچا لیتے ہیں لیکن زیادہ اثر تو دلچسپ تفریحی فلموں، کارٹونوں کا ہوتا ہے۔ ان سے وہ زیادہ سیکھتے بھی ہیں۔ اسی کو دلچسپ تفریحی انداز کو فرد اور سماج کی اصلاح اور ترقی کے لیے فکشن کا حصہ بنا دیا جائے، یعنی بچوں کے ادب کا طرز تحریر شگفتہ اور رنگین ہونا چاہیے۔ اسی لیے آج سائنس فکشن میں جدید انکشافات اور ایجادات کو شامل کرنے کی ضرورت ہے۔ انھیں عصری ٹیکنالوجی کے فائدے اور نقصانات سے روبرو کروانا ادیب کی ذمے داری ہے۔ تصوراتی اور حقیقی زندگی دونوں کی ملی جلی تحریریں پسند کی جاتی ہیں۔ کون کہتا ہے کہ بچے نصابی کتابوں کے علاوہ دوسری کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتے! اگر ایسا ہے تو 'ہیری پاٹر' سیریز کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں کیوں ہوتا ہے!

آج کا بچہ جادوٹونوں کی نہیں بلکہ حقیقت کی دنیا میں جینا چاہتا ہے۔ ایک ہی نسل میں زمین آسمان کا فرق ہو جاتا ہے۔

ڈرامے، لطیفے، منظوم پہیلیاں اساطیری اور اخلاقی ادب کے ذریعے بچوں تک پہنچائی جانی چاہیے۔ بچوں کے لیے سائنسی اور زمینی حقیقتوں سے لبریز موضوعات اور مضامین کی تلاش میں سرگرداں رہنا چاہیے۔ تبھی تو مزے مزے سے پڑھے جائیں گے۔

■

Sadiqa Nawab Sahar
301, Sadiqa Mension
Axex Bank ke Uper
Shastri Nagar
Dist: Raigarh - 410203 (MS)

محمد جہانگیر وارثی

بچوں کے رسائل اور موجودہ صورتِ حال

بچوں کا ادب تخلیق کرنا بچوں کا کھیل نہیں ہے اور نہ ہی بڑوں کے لیے بے کاری کا کوئی شوق ہو سکتا ہے کیونکہ ادب اطفال پر لکھتے وقت ہمیں اپنی ذہنی سطح سے سمجھوتا کرنا ہوتا ہے۔ بچوں کی نفسیات کو ٹٹولنا ہوتا ہے۔ ان کی ذہنی ساخت کو مدنظر رکھنا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر لکھنے والا اس معیار و منہاج کی پاسداری نہیں کر سکتا ہے۔

ادب اطفال سے راست طور پر دو کام لیے جاتے ہیں۔ اول، بچوں کی ذہنی نشو و نما کی ترکیب نکالی جاتی ہے۔ دوم، نئے لکھنے والوں کی نئی پود تیار کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے ان دونوں مقاصد میں کامیابی کے لیے رسالوں اور جریدوں کا اہم کردار ہوگا۔ کیونکہ لکھنے والے بھی اس میں مشق و مزاولت کر سکتے ہیں اور رسالوں تک بچوں کی رسائی نسبتاً آسان ہے۔ اگر اردو میں بچوں کے ادبی رسالے کی بات کریں تو بڑی مایوسی ہاتھ آتی ہے۔ کیونکہ اردو میں قابل ذکر بہت ہی کم رسالے نکل رہے ہیں اور جو نکل بھی رہے ہیں، ان میں بچوں پر لکھنے والے کم جگہ پاتے ہیں اور بچوں کے جز وقتی ادیبوں کا اس پر دبدبہ رہتا ہے۔ اس لیے ان رسالوں سے مذکورہ دونوں مقاصد میں کامیابی کم ہی مل پاتی ہے۔

اپنے مقالے میں بنیادی طور پر تین باتوں پر توجہ مبذول کروں گا۔

(1) آخر بچوں کے رسائل کم کیوں نکلتے ہیں۔

(2) اس میں بچوں کے کل وقتی ادیب کثرت سے کیوں نہیں چھپ پاتے ہیں۔

(3) پٹنہ سے شایع ہونے والے 'مسرت' اور دہلی سے شایع ہونے والے 'کھلونا' اور لکھنؤ سے شائع ہونے والے 'ٹافی' پر روشنی ڈالی جائے گی۔

ان بند ہو جانے والے رسائل کے جائزہ سے ایک طرف جہاں یہ معلوم ہوگا کہ ان کا مشن کیا تھا اور کیسے کیسے لوگوں نے ان رسائل کے ذریعہ ادب کو پڑھا اور ادیب بن گئے۔ وہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ بچوں کے رسائل کا بند ہو جانا ہمارے لیے نیک شگون نہیں ہے۔ کیونکہ ان کے بند ہو جانے سے ایک نسل کی ذہنی نشو و نما کی رفتار دھیمی ہو جاتی ہے اور لکھنے والوں کی نئی کھیپ تیار نہیں ہو جاتی ہے۔

این سی ای آر ٹی نے ادب اطفال پر توجہ دے کر ایک بہتر مکالمہ کے لیے راہ ہموار کیا ہے۔ امید ہے کہ اس موضوع پر گفت و شنید سے بچوں کے ادیب فعال ہوں گے اور بچوں کی نفسیات کے مدنظر ادب تخلیق کیا جائے گا۔

☆

ادب اطفال کا جو مقام شاید تقریباً نصف صدی پہلے تھا وہ اب نہیں ہے۔ اب اردو میں بچوں کے ادب کی صورتِ حال تشویشناک ہے، جو لوگ کسی حد تک مورچہ سنبھالے ہوئے ہیں، ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ اب سے چالیس برس قبل کا موازنہ کیا جائے تو یہ سامنے آئے گا کہ اردو کا وہی زریں دور تھا، اسی زمانہ میں بچوں کے معیاری رسالے نکلتے تھے۔ بچوں پر لکھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔

اب اور پہلے کے معیاری رسائل کا موازنہ کیا جائے تو یہ کہنا ذرا بھی مبالغہ نہیں ہوگا کہ ماہنامہ 'ٹافی' اور 'کھلونا' کا بھی ہم پلہ آج کوئی رسالہ نہیں ہے، ٹافی جس کی شروعات 1961 میں ہوئی تھی، نے بہت سے ایسے لکھنے والے پیدا کر دیے، جن کا آج بھی شہرہ ہے، 'ٹافی' نے جہاں بچوں پر مثبت اثرات مرتب کیے وہیں بہت سے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی اور انھیں لکھنا سکھایا۔ 1967 سے 1972 تک ماہنامہ 'ٹافی' کی ادارت سنبھالنے والے احمد مشکور نے چند برس قبل راشٹریہ سہارا دہلی میں کچھ یوں لکھا تھا:

''ماہنامہ 'ٹافی' لکھنو میں 1967 سے 1972 کے پانچ سال کے دوران جن بچوں نے معیاری کہانیاں، خوبصورت نظمیں اور اعلی ترین مضامین تحریر کیے آج وہ اللہ کا شکر ہے کہ اردو کے چمکتے ستارے ہیں، مناظر عاشق ہرگانوی نے 'ٹافی' میں مستقل معیاری مضمون 'ملا نابالغ' لکھا، آج وہ ڈاکٹر مناظر ہرگانوی ہیں۔ بھاگلپور یونیورسٹی کے ڈپارٹمنٹ آف اردو کے صدر ہیں۔ رئیس صدیقی 'ٹافی' میں 'جان پہچان' کے عنوان سے ملک کے مشہور و معروف شعرا اور ادبا کے انٹرویو لکھتے تھے۔ آج وہ آل انڈیا ریڈیو، دہلی کے پروگرام ایگزیکیٹیو اور پروگرام 'ادبی محفل' کے انچارج ہیں۔ رضوان احمد مستقل 'ٹافی' میں شائع ہوئے۔ وہ ڈاکٹر رضوان احمد پٹنہ میں حکومت بہار کے پبلک ریلیشن آفیسر ہیں۔ عدیل عباس جامی چریا کوٹی میرے عزیز تھے اور شمس الرحمٰن فاروقی کے وطن چریا کوٹ اعظم گڑھ سے تعلق تھا، ان سے میں نے بڑی

پیاری سی نظمیں لکھوائیں۔ سیتاپور کے مرحوم کیف احمد صدیقی اور ناوک حمزہ پوری کا 'ٹافی' سے خاص تعلق تھا۔''

(روزنامہ راشٹریہ سہارا، دہلی 18 مارچ 2010)

ماہنامہ 'کھلونا' کی اپنی ایک خصوصیت تھی، جس سے چھوٹے بڑے ہر عمر کے لوگ مستفید ہوتے تھے، کھلونا کے تعلق سے فیروز بخت احمد جو آج بھی ادب اطفال کے تعلق سے کچھ نہ کچھ لکھتے رہتے ہیں، لکھتے ہیں:

''مطالعہ انسان کی ذہنی نشو ونما کے لیے ہمیشہ ٹانک کا کام کرتا ہے۔ میرے لیے یہ کام پیارا رسالہ ماہنامہ 'کھلونا' کیا کرتا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ 'کھلونا' ہم سے روٹھ گیا، ٹوٹ گیا، بکھر گیا۔ ماہنامہ 'کھلونا' اپنے دعوی کے عین مطابق 8 سے 80 سال کے بچوں کا رسالہ ہوا کرتا تھا۔ حاجی یوسف دہلوی کے تین فرزند، یونس دہلوی، ادریس دہلوی اور الیاس دہلوی نے اسے دنیا کی کسی بھی زبان کے بچوں کے رسالے سے بہتر و برتر بنا دیا تھا۔''

(ماجد کی عقلمندی اور بچوں کی دیگر کہانیاں صفحہ 5)

ان دونوں رسالوں پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہم یہاں مسرت پر تفصیلی نگاہ ڈال رہے ہیں، تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ بچوں کا رسالہ نکالنے کی کس قدر حوصلہ افزائی ہوتی تھی۔

دربھنگہ کی صحافت یہ خوش آئند پہلو کہ وہاں کے صحافیوں نے دربھنگہ سے باہر بھی اپنی صلاحیت کا پرچم لہرا یا ہے۔ یوں تو 'مسرت' کی اشاعت پٹنہ سے ہوئی، تا ہم اس کے مدیر محترم کا تعلق دربھنگہ کی سرزمین سے ہی ہے۔ مسرت کی پہلی اشاعت دسمبر 1966 میں ہوئی اور آخری شمارہ غالباً جنوری 1969 میں منظر عام پر آیا۔ 'مسرت' کی اشاعت پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے اس وقت کے نائب صدر جمہوریہ ہند، ڈاکٹر ذاکر حسین نے ایڈیٹر کے نام 24 اکتوبر 1966 کو ایک مکتوب ارسال کیا تھا، جس میں بچوں کی ذہنی تربیت اور فکری نشو ونما کے لیے مخصوص اس رسالہ کی تحسین کی تھی۔ جب کہ پہلے شمارہ کے صفحہ تین پر کلیم الدین احمد کے جملے یوں مرقوم ہیں:

''بچوں کے ادب کی اردو ادب میں بڑی کمی ہے۔ 'مسرت' کو اس طرح بچوں کے درمیان پیش کیجیے کہ وہ حقیقی طور پر باعث مسرت ہو۔ امید ہے کہ ''مسرت' بچوں کے ادب میں ایک گرانقدر اضافہ ہوگا''۔

(ماہنامہ مسرت، پٹنہ، جلد اور شمارہ 1، ص 3)

پہلے شمارہ میں ادب اطفال پر آسی رام نگری 'پنگھٹ پر'، زکی انور 'ایک بہت بڑا گدھا'، ظفر اوگانوی 'پاندان'، طلعت فاطمہ 'خواب یا پیغام'، رحمت آرا اشرف 'رہبر' کی کہانیاں شامل ہیں، جب کہ اطہر شیر نے 'خدا بخش خان اوران کی لائبریری' کے عنوان سے بچوں کے ذہنی مذاق کو سامنے رکھتے ہوئے انتہائی آسان لفظوں میں ایک مضمون لکھا ہے۔ پروفیسر عبدالمغنی نے 'ہے دیکھنے کی چیز اسے بار بار دیکھیے' کے تحت ناصحانہ انداز میں انسانی معاشرت اور نعت خداوندی پر عمدہ مضمون لکھا ہے۔ ظہیر صدیقی نے کولمبس اور اس کی سیاحت کے متعلق معلومات افزا مواد پیش کیا ہے۔ 'مسرت' نے چاچا نہرو پر بھی ایک قابل مطالعہ شمارہ نومبر 1967 میں شائع کیا تھا، جو کہ 80 صفحات پر مشتمل تھا۔ ورنہ تو عموماً یہ 48 صفحات میں شائع ہوتا تھا اور قیمت فی پرچہ 50 پیسے ہوتی تھی۔ ایک موقعہ پر اس کی قیمت بڑھا کر 75 پیسے کرنے کا اعلان کیا گیا، لیکن مارچ 1968 میں چند لوگوں کی درخواست پر قیمت نہیں بڑھائی گئی ''لیکن کچھ، بہن بھائیوں کا مشورہ ہوا کہ ابھی کم از کم ایک سال تک قیمت نہ بڑھائی جائے۔ چنانچہ فی الحال مسرت کی قیمت پہلے ہی کی طرح فی کاپی پچاس پیسے اور سالانہ چھ روپے رہے گی۔ کہیے اب تو آپ خوش ہیں نا؟''۔ جنوری 1969 میں شائع ہونے والے شمارہ پر بھی قیمت 50 پیسے ہی درج تھی۔

چاچا نہرو والے شمارہ میں اختر اورینوی، صالحہ عابد حسین، زکی انور، مظہر امام، سہیل عظیم آبادی، شہاب دائروی، شبنم کمالی، ڈاکٹر کیول دھیر، مناظر عاشق ہرگانوی کے علاوہ شین مظفر پوری (مزاحیہ) کے مضامین قابل ذکر ہیں۔

ماہنامہ 'مسرت' میں لکھنے والوں کے نام کچھ اس طرح ہیں: عبدالمغنی، علقمہ شبلی، زکی انور، سلطان احمد، واہی، آسی رام نگری، رمز عظیم آبادی، وفا ملک پوری، مظہر امام، حضرت صفیر بلگرامی، پروفیسر علیم اللہ حالی، ڈاکٹر ارمان نجمی، طلعت فاطمہ، مناظر عاشق ہرگانوی وغیرہ۔

مسرت کے مشمولات سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے ذہنی مزاج اور ذوق وشوق کو سامنے رکھتے ہوئے مضامین اور ایسی کہانیاں پیش کی جاتی تھیں، جو بچوں کی ذہنی نشو ونما کے ساتھ ساتھ معلومات میں بھی اضافہ کریں۔ موضوع چاہے کچھ بھی ہو ہر ایک میں بچوں کی علمی سطح کا خیال رکھا جاتا تھا۔ مثلاً، چاچا نہرو کے شمارہ میں نہ جانے کیا کچھ شائع نہیں کیا جا سکتا تھا اور اس کی گنجائش بھی ہوتی، تا ہم اس میں بھی ایڈیٹر نے ایسے ہی مواد کو شامل کیا، جس سے بچوں کی معلومات میں اضافہ ہو اور رسالہ سے دلچسپی بھی قائم رہے۔ میگزین سائز کے ماہنامہ 'مسرت' کے مشمولات میں اُس زمانے کے معتبر و نامور قلمکاروں کی شمولیت ہوتی تھی اور ایسے بھی بے شمار نام نظر آتے ہیں، جو آج علم وادب کے لحاظ سے معتبریت کی سند رکھتے ہیں۔ رسالہ کی کامیابی میں جہاں دیگر پالیسیوں کا عمل دخل ہوتا ہے، وہیں انتخاب مضامین میں اعتدال پسندی کا بھی کرشمہ ہوتا ہے۔ ایڈیٹر ضیاء الرحمٰن غوثی نے مسرت کے ہر شمارہ میں اس بات کا خاص خیال رکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا معیار نہ صرف پر بلند نظر آتا ہے، بلکہ اول تا آخر ہر شمارے میں مدیرانہ صلاحیت کی جھلکیاں ملتی ہیں اور رسالہ کا معیار اول شمارہ سے ہی بلند نظر آتا ہے۔

'مسرت' کی مسلسل اشاعت اور ہر شمارہ میں چند صفحات کی رنگین طباعت سے ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ یہ کوئی نصف صدی قبل کا رسالہ ہے۔ طباعت کی عمدگی اسے آج کے قابل ذکر رسالوں کی صف میں لا کھڑا کرتی ہے۔ رہی بات موضوعات ومواد کی آج بچوں کے لیے اکا دُکا شائع ہونے والے رسائل سے کہیں زیادہ اس کے مواد عمدہ قابل ذکر ہیں۔ ''مسرت کی باتیں'' نامی چند سطری اداریہ میں بچوں سے تخاطب کا انداز انتہائی دلکش ہے، کیونکہ اس میں نہ کوئی غیر ضروری اطلاع دی جاتی تھی اور نہ ہی بچوں کے سامنے فلسفہ بگھارنے کی کوشش ہوتی تھی۔ کاش 'مسرت' جیسی کوئی خوشی آج بچوں کو نصیب ہو جائے۔ اخیر میں پہلے شمارہ کے صفحہ پانچ سے واہی کی نظم سے چند مصرعے۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی صورتِ لیڈر ہو خدایا میری
مجھ سے اسکول میں ہو شورش وشر کی رونق
ایک ہنگامے پہ موقوف ہو گھر کی رونق
لیڈرانہ مرا آہنگ طبیعت ہوجائے
سچ سے نفرت ہو مجھے، جھوٹ کی عادت ہوجائے
الغرض مجھ کو وہ اوصاف عطا کر یارب
آگے چل کر جو بنادے مجھے لیڈر یارب
پھر تو قسمت کا ہر اک بند دریچہ کھل جائے
پھر تو کم مائگی علم کا دھبہ دھل جائے

بچوں کے ادب پر مطالعہ کے لیے ماقبل اور مابعد آزادی کی تقسیم انتہائی دشوار گزار ہے۔ کیونکہ بچوں کے ایسے بہت سے رسالے رہے ہیں، جو آزادی سے قبل بھی نکلتے تھے اور مابعد آزادی بھی، بس اتنا کہا جا سکتا ہے کہ اب سے کوئی 30-25 برس قبل بچوں کے معیاری رسالے نکلتے تھے، جواب ندارد ہیں۔ مثلاً ماہنامہ 'کھلونا'، ماہنامہ 'ٹافی'، ماہنامہ 'چندانگری'، ماہنامہ 'غنچہ'، ماہنامہ 'شریر'، ماہنامہ 'جنت کا پھول'، ماہنامہ 'پریم' ماہنامہ 'پھلواری' وغیرہ اب بس

بچوں کو معیار ی ادب سے جوڑنے کے لیے این سی پی یو ایل نے 'بچوں کی دنیا' نامی رسالہ کی جوشروعات کی ہے، شاید اسی طرز پر بچوں کے دیگر رسائل کو دیدہ زیب اور پر کشش بنانے کی کوشش جائے گی۔ کیونکہ یہ رسالہ نہ صرف ادبی معیار کے اعتبار سے بلند ہے بلکہ بچوں کے لیے جس طرح پرکشش رنگین رسالہ ہونا چاہیے، اس لحاظ سے بھی انتہائی موزوں ہے۔

تاریخ کا حصہ بن کر رہ گئے ہیں۔ آج بچوں کے لیے ماہنامہ 'نورؔ' 'حجاب' رام پور، ماہنامہ 'امنگ'، دہلی، ماہنامہ 'سائنس کی دنیا' دہلی، ماہنامہ 'سائنس'، ماہنامہ 'گل بوٹے' ممبئی، ماہنامہ 'بچوں کی دنیا' دہلی، شائع ہو رہے ہیں۔

بچوں کو معیاری ادب سے جوڑنے کے لیے این سی پی یو ایل نے 'بچوں کی دنیا' نامی رسالہ کی جو شروعات کی ہے، شاید اسی طرز پر بچوں کے دیگر رسائل کو دیدہ زیب اور پرکشش بنانے کی کوشش جائے گی۔ کیونکہ یہ رسالہ نہ صرف ادبی معیار کے اعتبار سے بلند ہے بلکہ بچوں کے لیے جس طرح پرکشش رنگین رسالہ ہونا چاہیے، اس لحاظ سے بھی انتہائی موزوں ہے۔

رسائل وجرائد سے قطع نظر اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ کتنے قلم کاروں نے اپنے شعر وادب سے بچوں کی کردار سازی اور تربیت میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ اس تعلق سے نظر ڈالتے ہیں تو تلوک چند محروم، حامد اللہ افسر میرٹھی، سعادت نظیر، ابوالمجاہد زاہد، ظفر گورکھپوری، سیدہ فرحت، ابرار کرتپوری، وقار خلیل، بدیع الزماں خاور، بزمی بھارتی، خضر برنی، ذاکر حسین، ڈاکٹر صالحہ عابدہ حسین، شفیع الدین نیر وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں، آیئے ان میں سے چند ادیبوں اور شاعروں کے سرمایے پر سرسری نظر ڈالتے ہیں۔ حامد اللہ افسر میرٹھی اور تلوک چند محروم یہ دونوں ایسے شاعر ہیں، جن کی زندگی بچوں کے لیے معلم کی سی حیثیت رکھتی۔ ان دونوں نے اپنی شاعری سے بچوں کے اندر حب الوطنی، جذبہ ایثار اور اخلاقی تربیت کی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے۔ تلوک چند محروم کی نظموں کے دو مجموعے 'بہار طفلی'، 'بچوں کی دنیا' علی الترتیب 1961-64 میں شائع ہوئے، ان کی نظم محنت کے ایک ٹکڑے پر ایک نظر:

گر چاہتے ہو عزت، محنت سے وہ ملے گی
درکار اگر ہے شہرت، محنت سے وہ ملے گی
ہے جس کا نام دولت، محنت سے وہ ملے گی
کہتے ہیں جس کو قسمت، محنت سے وہ ملے گی
محنت کرو عزیزو، محنت سے کام ہوگا

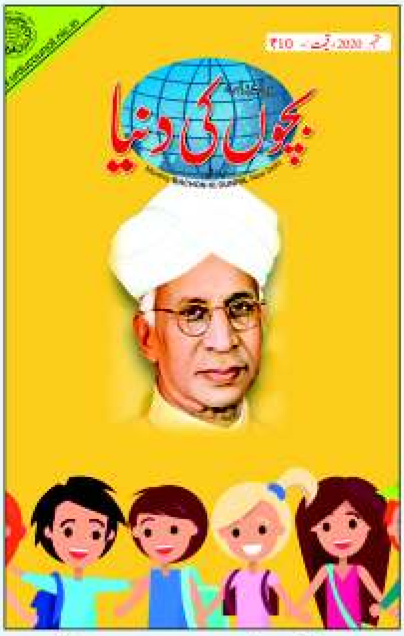

نظم کا یہ ٹکڑا دراصل ان کے مجموعہ نظم 'بہار طفلی' سے ماخوذ ہے، جس میں انھوں نے بچوں کے ذہن ودماغ میں یہ بٹھانے کی کوشش کی ہے کہ ہر کام کے لیے محنت درکار ہے۔ عزت چاہیے، شہرت چاہیے، دولت چاہے، سب کے لیے محنت اولین شرط ہے۔

حامد اللہ افسر میرٹھی نے بچوں کے اندر بالخصوص حب الوطنی کی روح پھونکنے کی کوشش کی ہے، انھوں نے بچوں کے لیے بے شمار نظمیں اور کہانیاں لکھیں، ان کی نظموں کے دو مجموعے 'بچوں کے افسر' اور 'گہوارے گیت' کے' شائع ہوئے۔

محمد اسحاق مائل خیر آبادی، بزمی بھارتی اور بدیع الزماں خاور نے بھی بچوں کے لیے بہت سی نظمیں کہیں۔ بدیع الزماں کی نظموں کا مجموعہ 'ننھی کلیاں' 1938، مائل خیر آبادی کی چودہ نظموں کا مجموعہ 'گڈو کے گیت' 1973 میں اور بزمی بھارتی کا مجموعہ 'دھنک' بھی اس کے آس پاس زمانہ میں شائع ہوئے۔ بدیع الزماں خاور اور بزمی کی نظموں سے مائل خیر آبادی کی نظمیں ذرا مختلف ہوتی ہیں۔ کیونکہ بالعموم ان کی نظموں پر اسلامیات کا گہرا رنگ چڑھا ہوتا ہے۔ اسی طرح خضر برنی کا مجموعہ 'مہکتی کلیاں' 1987، سطوت رسول کا مجموعہ 'کھیل سنسار' وقار خلیل کا مجموعہ 'حرف حرف نظم' کے نام سے شائع ہوا۔

اگر نثری ادب کی بات کریں تو کرشن چندر نے 1957 میں ستاروں کی سیر اور 1965 میں خرگوش کا سپنا جیسی تخلیقات پیش کیں۔ عصمت چغتائی نے ''تین اناڑی'' جیسا قابل قدر ناول دیا۔ ڈاکٹر ذاکر حسین نے بھی بچوں کے لیے بہت سی کہانیاں لکھیں۔ نظمیں اور ڈرامے لکھے، ان کی کہانیوں کا مجموعہ 'ابو خان کی بکری اور چودہ کہانیاں' 1963 میں شائع ہوا، اسی طرح پروفیسر محمد مجیب اور حامد اللہ افسر میرٹھی نے بھی علی الترتیب 'شیلا، آؤ ڈرامہ کریں' اور 'چار چاند، جانوروں کی کہانی' لکھ کر بچوں کے ادب میں اضافہ کیا ہے۔ ان کے علاوہ بچوں کے نثری ادب میں گرانقدر اضافہ کرنے والوں میں وکیل نجیب، ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی، ڈاکٹر خوشحال زیدی، ڈاکٹر مظفر حسین غزالی، محمد خلیل، غلام حیدر، یوسف انصاری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔

قابل غور پہلو یہ ہے کہ ادب اطفال کے تعلق سے صورتحال ناگفتہ بہ ہے، اگر واقعی اردو کا فروغ ہو رہا ہے تو ادب اطفال کا بھی فروغ ہوتا، کھلونا اور ٹافی جیسے بچوں کے معیاری رسالوں کا اضافہ ہوتا۔ ڈاکٹر سید عبدالباری لکھتے ہیں:

''اگر حصول آزادی کے پچاس سال کے عرصہ کا موازنہ اس سے عین قبل کے دور غلامی کے پچاس سالوں سے کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ ان بعد کے پچاس سالوں میں بچوں کا ادب نسبتاً کم تخلیق ہوا ہے''۔

(آزادی کے بعد اردو زبان وادب، صفحہ 156)

انصاف پسندی سے جائزہ لینے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ بچوں کے کل وقتی ادیب، بچوں کے بے شمار جز وقتی ادیبوں سے مات کھا جاتے ہیں۔ بچوں کے جز وقتی ادیب عام طور سے ادب کے دوسرے شعبہ میں زیادہ عمل دخل رکھتے ہیں۔ مثلاً ناول نگاری، افسانہ نگاری میں شہرت رکھنے والے ادیب بچوں کے لیے بھی لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ ان کی شہرت تو دراصل دوسری اصناف ادب میں ہوتی ہے، مگر وہ بچوں کے لیے بھی دو چار مضامین لکھ لیتے ہیں۔ اس کا نقصان یہ سامنے آتا ہے کہ بچوں پر لکھنے والے کل وقتی ادیب، جز وقتی ادیبوں کے سامنے شہرت میں بونے بن جاتے ہیں۔ اس لیے خالص بچوں پر لکھنے والوں کی خاطر خواہ پذیرائی ہونی چاہیے، ایسا نہ ہو کہ کل وقتی ادیب کی مراعات بھی جز وقتی بچوں کے ادیبوں کے لیے مختص ہو جائیں۔

■

Prof. M. J Warsi
Dept of Linguistics
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:09068771999

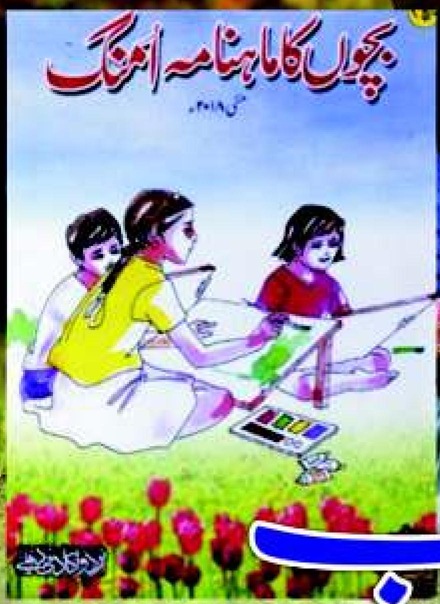

اردو میں بچوں کا تحریر کردہ ادب

آفاق عالم صدیقی

کچھ بچوں میں تخلیقی قوت زیادہ ہوتی ہے کچھ میں کم۔ لیکن ہوتی تمام بچوں میں ہے۔ بچے چونکہ کائنات کی تخلیق نو اور تسلسل کا دائمی حصہ ہوتے ہیں، اس لیے اس کی سرشت میں وہ سب کچھ شامل ہوتا ہے جو کائنات کی حس کہلانے کی مجاز ہوتی ہے۔ مگر ان چیزوں کو پہچاننا ان کی نشاندہی کرنا اور ان سے فائدہ اٹھانا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہ بات اب صاف ہو چکی ہے کہ بچے ناسمجھ اور نافہم نہیں ہوتے ہیں۔ ہاں ان میں اظہار کی طاقت کم ہوتی ہے اور ان کے پاس ایسے ذرائع نہیں ہوتے ہیں جن سے وہ اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کر سکیں کہ بڑے انھیں آسانی سے سمجھ لیں۔ یہی وجہ ہے کہ بسا اوقات جب بچے بہت ہی سنجیدہ اظہار کی کوشش میں سرگرداں رہتے ہیں تب بھی بزرگ انھیں شرارت پر آمادہ سمجھتے ہیں۔ یا اسے بچوں کی چہل سمجھ کر ٹال جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی صورت حال سے بچوں کے حوصلے اور تخیل کی پرواز پر برا اثر پڑتا ہے۔ مگر وہ اس کا بھی معقول ڈھنگ سے اظہار نہیں کر پاتے ہیں۔ اور اگر اپنے ہی ممکنہ ذرائع اور شعور سے کرتے ہیں تو بڑے اسے بھی غلط سمجھتے ہیں۔ اس کے باوجود بچے اپنی اختراعی صلاحیت کو پروان چڑھاتے رہتے ہیں۔ بچوں کو حوصلہ افزا ماحول نہیں ملتا ہے۔ کوئی اس کے اظہار کے کرب کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتا ہے۔ اس کی خواہش اور تڑپ کو سمجھنے پر آمادہ نہیں ہوتا ہے۔ اس کے باوجود بعض بچے اپنے آپ کو منوا لیتے ہیں، کچھ ایسا کر جاتے ہیں کہ حیرت انگیز ہو جاتا ہے۔ علی سردار جعفری کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ قدرت نے انھیں بڑا موزوں ذہن عطا کیا تھا، شاعری کا مادہ ان کی رگ رگ میں رواں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے صرف دو سال کی عمر میں شعر کہا تھا۔ رفیعہ شبنم عابدی لکھتی ہیں:

''سردار جعفری بچپن ہی سے شعر گوئی کا ملکہ لے کر آئے تھے۔ جب وہ دو سال کے تھے تو ان کی دوسری بہن پیدا ہوئی اور انھیں ماں کی گود سے ہٹا کر بڑی بہن زبیدہ کے سپرد کر دیا گیا۔ وہ اپنی ماں سے بہت مانوس تھے اس لیے ماں سے جدائی انھیں بہت ناگوار محسوس ہوئی۔ فوراً انھوں نے اپنی توتلائی زبان میں یہ شعر پڑھا۔

اوپل سے گلی ٹھیکری بادام چھوالا اس منی نے بھابھی کی گودی سے نکالا

(بچوں کے سردار: رفیعہ شبنم عابدی، ناشر مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، 2003، ص 6)

رفیعہ شبنم عابدی صاحبہ نے سردار جعفری کا ایک اور واقعہ لکھا ہے کہ:

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ سردار جعفری اپنے ہم جولیوں کے ساتھ ٹینس کھیل رہے تھے، اچانک کسی کام سے بڑے بھیا کے ایک خاص دوست تشریف لائے۔ انھیں دیکھ کر تمام بچوں نے احتراماً کھیل چھوڑ کر ان کے پاس جا کر سلام کیا۔ مگر سردار جعفری نے دور ہی سے سلام پر اکتفا کیا۔ جب بھیا کے دوست نے وجہ پوچھی تو سردار جعفری نے فوراً یہ شعر پڑھا۔

محروم میں نہیں ہوں سلام حضور سے پاس ادب یہی ہے کہ مجرا ہو دور سے

یہ واقعات محض اس لیے نقل کیے گئے ہیں کہ اندازہ ہو سکے کہ بچوں میں تحریر و تقریر اور گفتار کی کتنی صلاحیت ہوتی ہے۔ اور یہ بھی کہ وہ اپنے ماحول اور حالات اور آس پاس کے ماحول سے کس حد تک متاثر ہوتے ہیں۔

بہت ممکن ہے کہ بعض لوگوں کو یہ بات ہضم نہ ہو کہ سردار جعفری نے محض دو سال کی عمر میں اپنی بات کو کلام موزوں کی شکل میں کیوں کر پیش کیا۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کیا واقعی دو سال کا بچہ اپنی ماں کی گود سے محروم ہو کر دکھ محسوس کرتا ہے یا نہیں۔ اگر ہم یہ بات مان لیتے ہیں اور ہمارا تجربہ ہمیں یقین دلاتا دیتا ہے کہ ماں کی گود سے محروم ہونے کا دکھ ایک سال کا بچہ بلکہ ایک مہینے کا بچہ بھی محسوس کر لیتا ہے تو ہمیں یہ ماننے میں زیادہ وقت نہیں ہوگی کہ دو سال کا بچہ اپنی بات کو موزوں کلام کی شکل بھی دے سکتا ہے۔

یہ تو محض ایک مثال ہے۔ اس طرح کے ہزاروں واقعات تو محض اردو شعر و ادب میں بکھرے پڑے ہیں کہ فلاں شاعر نے پانچ سال کی عمر میں فلاں شعر کہا تو فلاں مصنف نے اسکول کی تعلیمی زندگی کے دوران فلاں کتاب کا دوسری زبان سے ترجمہ کیا۔ اور فلاں فلاں کہانیاں لکھیں وغیرہ۔ ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ ہم اردو زبان و ادب کی تاریخ اور عالمی ادب کی تاریخ سے چن چن کر وہ واقعات، اشعار، افسانے، اور دوسری چیزیں جمع کر کے پیش کریں جنھیں دنیا کے اہم مصنفین نے اپنے لڑکپن میں لکھا تھا، ہماری غرض یہاں پر یہ ہے کہ ہم بچوں کے ذریعے لکھے گئے ادب کا کسی حد تک جائزہ لیں۔ اور دیکھیں کہ اردو زبان و ادب میں بچوں کے ذریعے لکھا گیا ادب کتنا محفوظ اور کس پایہ کا ہے۔

اردو زبان و ادب کا یہ بڑا المیہ کہا جائے گا کہ یہاں بچوں کے ذریعے لکھے گئے

ہماری غرض یہ نہیں ہے کہ ہم اردو زبان و ادب کی تاریخ اور عالمی ادب کی تاریخ سے چن چن کر وہ واقعات، اشعار، افسانے، اور دوسری چیزیں جمع کر کے پیش کریں جنہیں دنیا کے اہم مصنّفین نے اپنے لڑکپن میں لکھا تھا، ہماری غرض یہاں پر یہ ہے کہ ہم بچوں کے ذریعے لکھے گئے ادب کا کسی حد تک جائزہ لیں۔ اور دیکھیں کہ اردو زبان و ادب میں بچوں کے ذریعے لکھا گیا ادب کتنا محفوظ اور کس پایہ کا ہے۔

ادب پر کبھی خاص توجہ نہیں دی گئی۔ اور نہ ان کے ادب کو اس قابل سمجھا گیا کہ اس کا باضابطہ طور پر مطالعہ کیا جائے اور اس کی قدر و قیمت کے تعین کی کوشش کی جائے۔ ایسا نہیں ہے کہ اردو میں بچوں کے رسالے اور بچوں کے ناشرین سرے سے پائے ہی نہیں جاتے ہیں۔ اردو میں آج بھی بچوں کے تقریباً ایک درجن رسالے نکلتے ہیں تو کئی اخبارات اور رسالے بچوں کے لیے صفحات مختص کرتے ہیں۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ ان رسالوں اور بچوں کے مخصوص صفحات پر بھی بڑوں ہی کی ادبی کدوکاوش نظر آتی ہے۔

کیا اردو کی جو نئی نسل ہے یا جو نئی پود ہے اس میں تخلیقی مادہ نہیں پایا جاتا ہے، یا یہ کہ نئی پود کی تخلیق کردہ چیزوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر ہے تو اس کے لیے مخصوص قسم کا رسالہ کیوں نہیں نکلتا ہے۔ ہر رسالہ اس کی کدوکاوش کو شائع کرنے کے لیے کچھ صفحے کیوں مختص نہیں کرتا ہے۔ اس طرح کے سیکڑوں سوالات قائم کیے جاسکتے ہیں مگر صرف سوال اٹھانے سے ہی مسئلہ حل نہیں ہوتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ پیام تعلیم ہلال، کھلونا، اور امنگ میں بچوں کی چیزیں شائع ہوا کرتی تھیں۔ پھر وہ وقت بھی آیا کہ ''مستقبل کے فنکار'' کا باب سمٹ کر صرف ماہنامہ امنگ تک رہ گیا۔ اور پھر رفتہ رفتہ وہاں بھی یہ سلسلہ بند ہوگیا۔ میں نے بچوں کے ذریعے لکھا گیا ادب کا بیشتر مواد ماہنامہ 'امنگ' دہلی سے ہی لیا۔ اس سلسلے میں 'پیام تعلیم' بھی کافی کارآمد ثابت ہوسکتا تھا مگر وقت کی تنگی کی وجہ سے اس کی فائلیں نہیں دیکھ پایا۔ ویسے اب وہاں بھی بچوں کی تحریریں خال خال ہی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین رہنی چاہیے کہ بچے بھی بڑوں کی طرح اپنے ماحول اور اپنے معاشرے سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور اس کی اچھی اور بری چیزوں اور رویوں سے بہت حد تک آگاہ ہوتے ہیں اس لیے جب وہ نظم کہانی یا مضمون لکھتے ہیں تو ان تمام چیزوں کا اثر ان کی تحریر پر صاف نظر آتا ہے۔ کبھی اشارے کنائے میں تو کبھی علامت اور تخیل کی شکل میں، مگر مزے کی بات یہ ہے کہ بچے جو اس وقت نظم یا کہانی لکھ رہے ہوتے ہیں، وہ نظم اور افسانے کے فن سے یکسر انجان ہوتے ہیں۔ وہ علامت و استعارے کے استعمال کی بات تو دور اس کی شناخت کی قابلیت سے بھی عام طور پر محروم ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود یہ ساری چیزیں یا ان میں سے بیشتر چیزیں ان کی نظم و نثر میں پیدا ہوجاتی ہیں اور ان کی نظم و نثر ان کے اظہار کا عمدہ پیمانہ بن جاتی ہیں۔ جس سے نہ صرف یہ کہ ان کے ذہن و فکر کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے بلکہ ماحول اور معاشرے کے تئیں ان کے رویوں سے بھی واقفیت حاصل ہوجاتی ہے۔ سب سے پہلے میں شگفتہ پروین شگفتہ جو مدرسہ ناصر العلوم میں چوتھی جماعت کی طالبہ ہیں کی یہ نظم پیش کرنا چاہوں گا، نظم دیکھیے۔

گڑیا رانی! گڑیا رانی! کیوں ہو اتنی پانی پانی
کیا کرتی ہو گڑیارانی! اتنا چاول اتنا پانی!
چاول سے ہوں کھیر پکاتی پانی پیتی اور پلاتی
وہ جو ہیں نا ان کی نانی مجھ پر کرتی حکمرانی
مجھ سے سارا کام کراتی
میرا گڈا تو ہے نکما کرتا رہتا ہے من مانی
مجھ کو ملتی سوکھی روٹی مرغ مسلم کھاتی نانی
دن بھر پنگھٹ جاتے جاتے ہوجاتی ہوں پانی پانی
اس پر بھی میں خوش رہتی ہوں سن لو اے گڈو کی ممانی
صبر کرو اے گڑیا رانی سچ مچ بن جاؤ گی رانی

(ماہنامہ امنگ: مدیر مخمور سعیدی: شریف الحسن، ص 39، دہلی اردو اکادمی)

اس نظم کے چار بنیادی کردار ہیں، گڑیا، گڈا، نانی، گڈو کی ممانی، اور ان چار کرداروں کی گفتگو سے نظم ایک مکمل گھریلو اور معاشرتی ماحول کی عکاس بن جاتی ہے۔ جس میں معاشرتی زندگی کا ایک اہم پہلو پوری طرح جلوہ گر ہوجاتا ہے۔

ظاہر ہے کہ چوتھی جماعت کی طالبہ نے اپنے گھریلو ماحول، سماجی زندگی، اور معاشرتی رکھ رکھاؤ پر بہت سنجیدگی سے غور و فکر نہیں کیا ہوگا۔ اور نہ وہ فن شاعری اور نظم نگاری کی جملہ خوبیوں سے ہی واقف ہے۔ نہ وہ علامت و استعارے کی اہمیت کو سمجھتی ہے۔ اور غالباً وہ جانتی بھی نہیں ہے کہ لوازمات شعری اور فصاحت زبان کی باریکیاں کیا کیا ہیں۔ اس کے باوجود اس نے کھیل کھیل میں ایک ایسی نظم تخلیق کردی جس میں گھریلو زندگی کا ایک پہلو پوری طرح منور ہوگیا ہے۔ نانی اپنے نواسے کے ساتھ رہتی ہے جس کا صاف مطلب ہے کہ اپنے بیٹے اور بہو سے اس کی نہیں بنی، اس لیے وہ نانی سے الگ ہوگئے۔ بیٹی نے بھی بڑھیا (نانی) کو اپنے ساتھ رکھنا گوارہ نہیں کیا۔ مگر نواسے نے نانی کا ساتھ نہیں چھوڑا۔ کہنے کی ضرورت نہیں رہ جاتی ہے کہ نانی کو اپنے نواسے اور نواسیوں سے بہت محبت ہوتی ہے۔ بڑھیا نے گڈے (نواسے) کی شادی کردی کہ شاید اس طرح وہ سدھر جائے گا۔ اور کام کاج میں لگ جائے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ گڑیا رانی نوکرانی کی سی زندگی گزارنے پر مجبور ہوگئی ہے۔ وہ دن رات کام کرتی ہے۔ سوکھی روٹی کھاتی ہے۔ پھٹا پرانا پہنتی ہے۔ اس کے باوجود زندگی سے مایوس نہیں ہے۔ پڑوسن گڑیا رانی کا دکھ سمجھتی ہے۔ وہ اس کے دل کا بھید لے کر اسے نانی کے خلاف بھڑکانا چاہتی ہے۔ بطور خاص بڑھیا کی بہو نہیں چاہتی ہے کہ گڑیا رانی اور نانی امن و سکون سے زندگی گزاریں۔ اگر وہ لوگ امن و امان سے زندگی گزارنے میں کامیاب ہوجائیں گی تو پڑوسنیں انھیں برا بھلا کہیں گی۔ اور سارا الزام بہو پر آئے گا۔ کہنے والے کہیں گے کہ اگر بڑھیا خراب ہوتی تو گڑیا رانی اس کے ساتھ کیوں کر گزر بسر کرپاتی۔ اس لیے وہ راہ میں روک کر گڑیا رانی کا احوال پوچھتی ہے۔ گڑیا رانی اپنی پریشانی کا ذکر کرتی ہے۔ مگر اخیر میں ایسی بات کہتی ہے جس سے گڈو کی ممانی لاجواب ہوجاتی ہے اور وہ گڑیا رانی کو دعا دینے پر مجبور ہوجاتی ہے۔ آخری حصہ دیکھیے۔

دن بھر پنگھٹ جاتے جاتے ہوجاتی ہوں پانی پانی
اس پر بھی میں خوش رہتی ہوں سن لو اے گڈو کی ممانی
صبر کرو اے گڑیا رانی سچ مچ بن جاؤ گی رانی

ہم نے دیکھا کہ ایک بچی کی بظاہر بے ضرر اور نہایت ہی ہلکی پھلکی نظم میں زندگی کی مثبت قدروں کو بحال رکھنے اور منفی رویوں کو رد کرنے کی کتنی زبردست بصیرت پائی جاتی ہے۔ اور یہ بھی کہ اس چھوٹی سی نظم میں سماجی اور گھریلو تعلقات و تضادات کی کتنی تصویریں بکھری پڑی ہیں۔ مگر ہم اپنی ہمہ دانی کے زعم میں بچوں کے لکھے ادب کو کسی بھی طرح

زیادہ اہمیت دینے پر راضی نہیں ہیں۔ بچے بڑوں کی طرح ہی اپنے ماحول سے اثر لیتے ہیں۔ اور سماجی شعور حاصل کرتے ہیں۔ بچے جس ماحول میں رہتے سہتے ہیں اس کے تمام تر اچھے برے پہلوؤں پر نظر رکھتے ہیں۔ اور حتی المقدور اس سے متعلق رائے بھی قائم کرلیتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ لوگ ان سے ان کی رائے جاننا ضروری نہیں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ اکثر بچوں کو اچھا ماحول اور اچھی تربیت نہیں مل پاتی ہے۔ مائل خیرآبادی لکھتے ہیں:

''ہمارے معاشرے میں مائیں تعلیم یافتہ نہیں ہیں اور جو کچھ شد بد رکھتی بھی ہیں تو انھیں بچوں کی تربیت کا سلیقہ نہیں ہے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ بچے وہ کچھ سنتے اور سیکھتے ہیں جو انھیں ماحول سکھاتا ہے۔'' (تربیتی کہانیاں: مائل خیرآبادی، ناشر مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی، ص 3)

ماحول سے بچوں کو جو کچھ ملتا ہے اسے وہ اپنے شعور اور ادراک کے مطابق جذب کرلیتے ہیں۔ یا پھر رد کردیتے ہیں۔ آج بھی گاؤں گھر کا ماحول پہلے ہی کی طرح گھٹا ہوا ہے۔ بچوں کو آج بھی مائیں دادیاں اس طرح کی باتیں اور واقعات سناتی رہتی ہیں جس سے بچوں کی ذہن سازی بہتر طریقے سے نہیں ہو پاتی ہے۔ بالخصوص گھر کی عورتیں بچوں کو بھوت، چڑیل کے قصے اور سوتیلی ماں کے ظلم کے واقعات سنایا کرتی ہیں۔ جس سے بچوں کا ذہن خراب ہوتا ہے۔

زمانہ بدل چکا ہے۔ بچے پہلے کی بہ نسبت زیادہ باشعور ہو چکے ہیں۔ اب وہ خود بھی ماحول، سماج، تفریح، خوشی، غم، موسم اور مناظر سے متعلق خیالات کا اظہار کرنے لگے ہیں۔

ماہنامہ امنگ دہلی فروری 1990 میں شمع پروین کی دو نظمیں ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئی ہیں۔ پہلے نوٹ ملاحظہ کیجیے پھر نظم دیکھیے:

''شمع پروین کا تعلق دلی کے پسماندہ علاقے شکور پور سے ہے۔ زندگی کی کئی سہولیات سے محروم اس بچی کو خدا نے شاعری کی بے پناہ صلاحیت سے مالا مال کیا ہے۔ بارہ سالہ پروین جب تیسری جماعت میں تھی تبھی سے شاعری کر رہی ہے چوں کہ اس کی تعلیم ہندی میں ہو رہی ہے، اس لیے اسی زبان میں شاعری کرتی ہے۔''

شاعری سے اس بچی کی رغبت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ فی البدیہہ موضوع پر یہ فرفر نظمیں لکھ سکتی ہیں پیش ہیں اس کی دو ایسی ہی نظمیں''

(شریف الحسن نقوی: مخمور سعیدی: مدیر ماہنامہ امنگ۔ فروری 1990، دہلی اردو اکادمی)

نظم دیکھیے۔

نظم (1) تارے بھائی تارے

تارے بھائی تارے   کھیلو سنگ ہمارے
پھولوں کے باغوں میں آؤ   تم اپنا کھیل دکھاؤ
تھوڑا ہم کو سکھلاؤ   آسمان میں چمکتے ہو
ہیرے جیسے لگتے ہو   چندا کو بھی سنگ میں لاؤ
تم ہم کو خوش کرجاؤ   تارے بھائی تارے

نظم (2) سہانا موسم

کلی کلی کھل اٹھی   ہر چمن سگندھت ہوا
مست پون چلی تو   ساگر بھی جاگ اٹھا
چھائیں کالی گھٹائیں   چلنے لگیں ہوائیں
کوئل بولی کوک کر   مور ناچا جھوم جھوم کر
ایسا کون ہے ویکتی   جو یہ دیکھ کر نہ جھوم اٹھے

بظاہر بڑی سادہ سی نظمیں ہیں یہ دونوں مگر غور کیجیے تو محسوس ہوگا کہ ایک بارہ سال

ماحول سے بچوں کو جو کچھ ملتا ہے اسے وہ اپنے شعور اور ادراک کے مطابق جذب کرلیتے ہیں۔ یا پھر رد کردیتے ہیں۔ آج بھی گاؤں گھر کا ماحول پہلے ہی کی طرح گھٹا ہوا ہے۔ بچوں کو آج بھی مائیں دادیاں اس طرح کی باتیں اور واقعات سناتی رہتی ہیں جس سے بچوں کی ذہن سازی بہتر طریقے سے نہیں ہو پاتی ہے۔ بالخصوص گھر کی عورتیں بچوں کو بھوت، چڑیل کے قصے اور سوتیلی ماں کے ظلم کے واقعات سنایا کرتی ہیں۔ جس سے بچوں کا ذہن خراب ہوتا ہے۔

کی لڑکی فطرت کے حسن سے کتنے گہرے طور پر وابستہ ہے اور اس سے کس طرح زندگی کا رس اور جس حاصل کر رہی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ اپنی کیفیت کے اظہار پر بھی قدرت رکھتی ہے۔ اور ہلکے پھلکے الفاظ کو استعارے کے طور پر استعمال کرکے زندگی کے نغمہ جانفزا میں ڈھال دیتی ہے۔

اسی طرح کی ایک نظم صفیہ بانو سبطین کی ہے۔ نظم دیکھیے۔

چلیں ہم چلیں اب   ندی کے کنارے
بلاتے ہیں ہم کو   یہ دلکش نظارے
یہ پھولوں کے پودے   بڑے دل ربا ہیں
یہ گاتے پرندے   بہت خوشنما ہیں
یہ موسم سہانا   دلوں کو لبھائے
یہ منظر سہانا   ہمیں گدگدائے
چلو ہم چلیں اب   ندی کے کنارے
بلاتے ہیں ہم کو   یہ دلکش نظارے

(ماہنامہ امنگ، جولائی 1991، ص 4، دہلی اردو اکادمی دہلی، مدیر شریف الحسن نقوی)

یہ بچی جو اپنی عمر کے تیرہویں سال میں داخل ہو رہی ہے، فطرت کی آواز سننے کی صلاحیت رکھتی ہے اور اپنے آس پاس کے ماحول اور مناظر کی لفظوں میں تصویر اتار سکتی ہے۔

ماہنامہ امنگ میں فارحہ رضوی کی دو نظمیں ادارتی نوٹ کے ساتھ شائع ہوئیں تھی۔ ملاحظہ ہو:

''فارحہ رضوی معروف اردو شاعر جناب زبیر رضوی کی دختر ہیں، یہ ان دنوں لیڈی ارون ہائر سکنڈری اسکول نئی دہلی میں نویں جماعت کی طالبہ ہیں۔ بہت چھوٹی عمر سے سات آٹھ سال کی رہی ہوں گی۔ شاعری سے رغبت ہوگئی۔ شروع میں انگریزی نظموں کا ترجمہ کرکے گھر میں سنا کر خوش ہو لیتی تھی۔ اس طرح ان کے پہلے سامع ماں باپ ہیں۔ اب طبع زاد نظمیں بھی کہہ لیتی ہیں، انھوں نے ہماری گزارش پر یہ دو نظمیں اشاعت کے لیے دی ہیں۔''

نظم (1) ہمارے دوست

ملتا نہیں سکوں   کرتے ہیں آرام
ہل چل سی رہتی ہے   دل میں صبح و شام
خوابوں میں بس یہی   اس کے سوا کام نہیں
پا لیا اگر اسے تو   بڑھ کے اس سے
اور کوئی انعام نہیں   یہ ہے تو مستقبل

راہیں ہیں منزل ہے   کہتے ہیں سب جس کو
ہوم ورک اور پڑھائی   لگتی ہے اس کے بنا
عجب ہم کو تنہائی

نظم (2) میری گڑیا

ننھی منی گڑیا میری   رنگ برنگے کپڑے پہنے
سونے اور چاندی کے گہنے   پہنے ناچے گائے گڑیا
میری گڑیا بڑی سیانی   اصلی گھی کی چیزیں کھاتی
نقلی گھی کے پاس نہ آتی   ہے چنچل سی میری گڑیا
بڑی بڑی سی آنکھوں والی   چھوٹے چھوٹے دانتوں والی
گورے گورے گالوں والی   جب چاہوں وہ بن جاتی ہے
میرے کہنے سے اک بڑھیا   پیاری پیاری میری گڑیا

(فارحہ رضوی، ماہنامہ امنگ، فروری 1990، ص 38، دہلی اردو اکیڈمی، مدیر مخمور سعیدی، شریف الحسن نقوی)

ان دونوں نظموں سے جہاں فارحہ رضوی کے تخلیقی وفور اور زندگی سے متعلق گہرے شعور کا پتہ چلتا ہے وہیں نظم کی شاعرانہ فضا سے ان کی فنکارانہ ہنرمندی کا بھی پتہ چلتا ہے۔ انھوں نے جس خوبی اور بصیرت سے نظم کی تعمیر کی ہے اور اسے انجام تک پہنچایا ہے اس سے ان کے فن شناس ہونے کا بھی پتہ چلتا ہے۔ ان کی ایک اور نظم ہے 'سنہرا سپنا' جو اپنے موضوع، مواد اور معنویت کے اعتبار سے ان دونوں نظموں سے زیادہ قابل توجہ ہے۔ نظم دیکھیے۔

آئی پیاری پیاری رات   لائی تاروں کی بارات
لے کے چندا ماما ساتھ   لائیں نیندیں خواب سنہرے
میں نے دیکھا خواب سنہرا   میں گئی امریکہ افریقہ
دیکھے کالے گورے بچے   مل کر سب نے گیت یہ گایا
دھرتی پر یوں جئیں مہکے   ڈالی ڈالی پنچھی چہکے
ہم سب امریکی افریقی   ہندوستانی ہوں یا روسی
بچے ایک ہیں سب دیشوں کے   میرا خواب اچانک ٹوٹا
آیا سورج لے کے سویرا

(فارحہ رضوی، ماہنامہ امنگ، ستمبر 1988، ص 95، دہلی اردو اکیڈمی، مدیر مخمور سعیدی، شریف الحسن نقوی)

اس نظم میں آدمیت اور انسانیت و مساوات کا جو پیغام ہے وہ اظہر من الشمس ہے۔

طارق ضیا صدیقی جے ڈی ٹائٹلر اسکول دہلی کے نویں جماعت کے طالب علم ہیں۔ انھوں نے انگریزی نظم If I Knew The Box سے متاثر ہو کر ایک نظم لکھی ہے جو امنگ اکتوبر 1988 کے شمارے میں شائع ہوئی ہے۔ نظم دیکھیے۔

کاش کبھی سچ ہو یہ سپنا

آؤ ساتھی ہم تم مل کر   ڈھونڈھ نکالیں آج وہ ڈبہ
جس میں خوشیاں اور مسکانیں   قہقہے اور سکھ بند پڑے ہیں
بکس ہو چاہے کتنا ہی بھاری   اور تالا کتنا ہی بڑا ہو
توڑ کے ہم اس بکس کا تالا   ساری خوشیاں اور مسکانیں
بانٹ دیں سارے جگ والوں کو   سکھ سے سب کی جھولی بھر دیں
دے دیں ہنسی سب کے چہروں کو   اور اگر ممکن ہو تو ساتھی
سب کے دکھوں اور سب کے اشکوں کو   بھر دیں ہم اس بکس میں لا کر
ایک بڑا سا تالا ڈالیں   اور اس تالے کی کنجی کو
جا کر ہم دریا میں بہا دیں   تاکہ کبھی پھر کوئی اس کو
جتنا بھی چاہے کھول نہ پائے   جگ میں پھر کوئی نہ دکھی ہو
کوئی انسان رہے نہ بھوکا   کوئی کسی سے بھیک نہ مانگے
کوئی ہو نوکر کوئی نہ آقا   کوئی نہ ہو بے گھر اور مفلس
اور نہ کسی کے خون کا پیاسا   کوئی نہ جاڑے سے مرتا ہو
کوئی پھرے نہ سڑکوں پہ ننگا   ہر اک کے چہرے پہ ہنسی ہو
خوشیوں میں ہو سب کا حصہ   کاش کبھی ایسا ہو ساتھی
سچ نکلے اپنا یہ سپنا

افسوس کی بات یہ ہے کہ پہلے ماہنامہ امنگ میں بچوں کی چیزیں اہتمام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔ مدیران ان پر نوٹ لگایا کرتے تھے۔ نیز محنت کر کے بچوں کی چیزوں کی نوک پلک درست کرتے تھے اور اس کی اشاعت کا اہتمام کرتے تھے۔ مگر اب وہاں بھی بچوں کی چیزیں خال خال ہی نظر آتی ہیں۔ ماہنامہ ''ھلال'' میں اب بھی سال دو سال میں 'نئے قلمکار، یا ننھے منے قلمکار، کے عنوان سے چند چیزیں شائع ہوتی ہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ اس قسم کی اشاعت آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ ماہنامہ 'گلشن اطفال' نے بھی اس روایت کو زندہ کرنے کی کوشش کی مگر وہ بھی اس میں کامیاب نہیں ہو سکا۔ ہاں کبھی کبھی اس رسالے میں بھی ننھے منے قلمکاروں کی اکا دکا چیزیں دیکھنے کو مل جاتی ہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ بچے صرف نظمیں لکھتے ہیں۔ کہانیاں نہیں لکھتے ہیں۔ یا یہ کہ کہانیوں سے ان کی دلچسپی ختم ہو گئی ہے۔ وہ کہانیاں بھی لکھتے ہیں، مگر ان کی کہانیاں کم چھپتی ہیں۔ اس کی وجہ غالباً مدیروں کی مصلحت ہے کہ کہانی زیادہ جگہ گھیرتی ہے جب کہ نظمیں کم جگہ لیتی ہیں۔ اس کے باوجود بچوں کی کہانیاں 'امنگ'، 'پیام تعلیم' اور 'ہلال' میں بکھری پڑی ہیں۔ شگفتہ عارفین کی کہانی ''عقل مند کون'' محمد فیض احمد عارف کی کہانی، لالچ کا پھل، سمیرہ حسن کی کہانی 'شامت اعمال' زین العابدین کی کہانی 'غرور کا انجام' اور نصر عزیز انجم کی کہانی 'اصلی رشتے دار' ماہنامہ امنگ کے مختلف شماروں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ماہنامہ گلشن اطفال بھی وقتاً فوقتاً نئے قلمکار کے تحت نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لیے کچھ چیزیں چھاپتا ہے مگر تسلسل کے ساتھ نہیں۔

تلاش بسیار کے بعد مجھے ایک کتاب ایسی ملی جو آٹھویں جماعت کے بچے کے ذریعے لکھے گئے واقعات اور کہانیوں کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب ''اچھا سلوک'' کو کلاسک آرٹس آزاد مارکیٹ دہلی نے شائع کیا ہے۔ امتیاز علی صاحب اس کے مصنف ہیں، کتاب کی ابتدا میں ''پہلے اسے پڑھیے'' کے عنوان سے وہ لکھتے ہیں کہ:

''روزنامہ مشرق، لاہور میں بچوں کے صفحے کے لیے اسلامی و تاریخی کہانیاں لکھنے کا سلسلہ میں نے 1974 میں شروع کیا تھا اس وقت میں بھی بچہ تھا۔ اور آٹھویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ 1974 سے 1978 تک یہ سلسلہ جاری رہا اور اس عرصے میں سیکڑوں کہانیاں لکھیں۔ اس کتاب میں شامل تمام کہانیاں انھیں میں سے چند ایک ہیں ان کی زبان و بیان میں ذرا بھی تبدیلی نہیں کی گئی کہ یہ ایک بچے نے اپنے ساتھی بچوں کے لیے لکھی تھیں۔'' (امتیاز علی: اچھا سلوک، ص 3، 1994 کلاسک آرٹس آزاد مارکیٹ دہلی)

بچوں میں تخلیقی اظہار کی بڑی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ ضرورت بس اس بات کی ہے کہ بچوں کو اظہار کا اور تقریر و تحریر کا موقع فراہم کیا جائے۔ تاکہ ان کے اندر کی صلاحیت نکھر سکے۔

■

Dr. Afaque Alam Siddiqui
Zubaida Degree College, Jai Nagar, Post Box No:6, Shikaripur
Shimoga - 577427 (Karnataka)   Mob.: 9945462187

سید اسرار الحق سبیلی

جنوبی ہند میں بچوں کی نظمیں

اردو زبان کی پیدائش کا شرف جس طرح شمالی ہندوستان کو حاصل ہے، اسی طرح جنوبی ہندوستان کو اردو ادب کی ابتدا کا شرف حاصل ہے۔ محققین کا اس بات پر تقریباً اتفاق ہے کہ اردو زبان کی پیدائش شمالی ہند میں ہوئی اور اس کا بچپن دکن کی آزاد فضا میں گزرا، اور اس نے دکن کے علاقوں پر بہت جلد عوامی اور ادبی زبان کی شکل اختیار کر لی۔ حافظ محمود شیرانی کو چھوڑ کر بیش تر محققین نے حضرت یمین الدین امیر خسرو (1253-1325) کو بچوں کا پہلا شاعر اور ان کی منظوم کتاب 'خالق باری' کو جو بچوں کو ذخیرۂ الفاظ سکھانے کے لیے ترتیب دی گئی تھی، بچوں کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر سیدہ مشہدی نے امیر خسرو کے بعد محمد قلی قطب شاہ معانی (1565-1611) کو بچوں کا دوسرا شاعر قرار دیا ہے۔ بچوں کی نظموں میں موسموں، تہواروں اور کھیل کود وغیرہ کو اہمیت دی جاتی ہے، اس اعتبار سے محمد قلی قطب شاہ کی شاعری کا وہ حصہ جس میں اس نے ہندو مسلم تہوار، موسم اور کھیل کود وغیرہ سے متعلق اظہار خیال کیا ہے، جیسے: عید بقرعید، نوروز، بسنت، شب برات، سال گرہ، بارش، ٹھنڈ کالا، برسات اور سرما، چوگان، پھوکڑی پھو اور کھنڈی وغیرہ کو بچوں کے ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے، جیسے بقرعید کے عنوان سے اس کی نظم ہے:

خوشی خبراں سنیا عید بکرید — کہ قرباں ہونے آیا عید بکرید
کھلکتا مرغِ دل کے بوستاں میں — طرب مطرب کو لیایا عید بکرید

اسی طرح قطب شاہی دور کی مثنویوں میں شاہ راجو کی مثنوی 'تحفۃ النصائح' اور سید بلاقی کی 'معراج نامہ' اور عادل شاہی دور کی مثنویوں میں محمد امین ایاغی کی مثنوی 'نجات نامہ' شغلی کی مثنوی 'پند نامہ' اور مختار کی مثنوی 'معراج نامہ' اور 'مولود نامہ' کو بچوں کے اولین ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر خوشحال زیدی، ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی اور ڈاکٹر سیدہ مشہدی نے دکنی دور (مغلیہ دور) کے ادب اطفال میں شاہ حسین ذوقی اور ان کی مثنوی 'ماں باپ نامہ' کا ذکر کیا ہے کہ یہ ایک طویل نظم ہے، جس میں انھوں نے بچوں کو والدین کی عزت، مقام و مرتبہ اور ان کی عظمت واہمیت بیان کی ہے، ڈاکٹر سیدہ مشہدی کے بقول:

''اس مثنوی میں ایسے مسئلے کو چھیڑا گیا ہے جس کا تعلق اخلاق اور مذہب سے ہے، اس سے بچوں کی کردار سازی میں مدد مل سکتی ہے، اور ان کے اندر والدین کے لیے عزت و احترام کا جذبہ ابھارا جا سکتا ہے۔''

(اردو میں بچوں کا ادب: 102-103، ایمن پبلی کیشنز رانچی)

اسی طرح آصف جاہی دور میں شیر محمد خاں ایمان کی مثنوی 'برق تاب' اور نوازش علی خان بہادر شیدا کی مثنوی 'اعجاز احمد' کو بچوں کے ادب میں شمار کیا جا سکتا ہے، نیز ریاست مدراس کے کثیر التصانیف بزرگ مولوی محمد باقر آگاہ (1158-1220) ہجری نے کئی ضخیم مثنویاں لکھیں، جیسے: ہشت بہشت، محبوب القلوب، ریاض الجنان، تحفۂ احباب اور تحفۃ النساء وغیرہ

آزادی کے بعد جنوبی ہند میں بچوں کے نظم گو شاعروں میں خورشید احمد جامی، سعادت نذیر اور وقار خلیل کا نام تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا، خورشید احمد جامی جس طرح جدیدیت کے ممتاز اور منفرد شاعر شمار کیے جاتے تھے، اسی طرح اپنے دور میں بچوں کے لیے لکھنے والوں میں ممتاز تھے، ان کی نظموں کے مجموعے: شمعِ حیات (1947)، نشانِ راہ (1948) اور تاروں کی دنیا (1952) شائع ہو چکے ہیں۔

سعادت نظیر بچوں کے شاعر کی حیثیت سے حیدرآباد میں مشہور تھے، ان کی نظموں کا مجموعہ 'پھول مالا' کے نام سے موجود ہے، اس مجموعے میں انھوں نے قومی، وطنی اخلاقی اور عصری ایجادات پر بڑی پر اثر نظمیں لکھی ہیں، انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے دردمندی اور پیار کے ساتھ بچوں کے مستقبل کو سنوارنے کی کوشش کی ہے۔

حیدرآباد کے مشہور شاعر اور ادبی صحافی وقار خلیل نے بچوں کے لیے آسان اور دل کش زبان میں شاعری کی ہے، ان کی نظمیں آندھرا پردیش کے سرکاری نصاب میں شامل رہی ہیں، 1979 میں بچوں کے لیے ان کی چھوٹی چھوٹی نظموں کا مجموعہ 'ڈالی ڈالی پھول' شائع ہوا تھا، ان نظموں میں وطن سے محبت، بڑوں کا احترام، چھوٹوں پر شفقت، انسانیت کی حرمت اور مذاہبِ عالم کی تقدیس وغیرہ پر اظہار خیال کیا گیا ہے، کتاب، مکتب کی طرف دوڑ، نیا گیت، علم و عمل، میری امی گلاب، نمائش اور پتنگوں کے دن ان کی کامیاب نظمیں ہیں، ان کی (35) نظموں کا

مجموعہ 'حرف حرف نظم' کے نام سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی سے شائع ہوا ہے،ان کی زبان سادہ، سلیس اور رواں ہے،تراکیب اور اضافتوں سے خالی ہے،ان کی بیش تر نظموں میں اخلاقی اقدار،محبت اور خدمت کا پیغام ملتا ہے۔

دورِ حاضر میں جنوبی ہند میں بچوں کے شاعروں اور ادیبوں کی تعداد میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے،اس دور میں بعض شاعر کی شناخت بچوں کے شاعر و ادیب کی حیثیت سے ہو چکی ہے، جیسے: حافظ کرناٹکی،ان کے علاوہ تلنگانہ، آندھرا پردیش، کرناٹک اور تمل ناڈو میں کئی شاعر اپنی نظموں کے ذریعے بچوں کے اخلاق و کردار اور سیرت سازی کا مقدس فریضہ انجام دے رہے ہیں۔

ادب اسلامی کے بزرگ شاعر مسعود جاوید ہاشمی نے بچوں کے شاعر،ادیب، مضمون نگار اور صحافی کی حیثیت سے بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہے،ابوالفہیم وحید علی خان کے ساتھ مل کر آپ بچوں کا اہم رسالہ 'ہمارے نونہال' نکالا کرتے تھے،ان کے انتقال کے بعد 2010 سے بچوں کا دو لسانی اردو و انگریزی میں ماہ نامہ 'فنکار نو' کے نام سے نکالا، جو حال ہی میں بند ہو گیا،ان کی نظمیں فنکار نو کے علاوہ ضمیمہ گلدستہ روز نامہ منصف حیدر آباد میں شائع ہوئی ہیں،انھوں نے بچوں کے لیے حمد،نعت، دعا،عیدین اور موسم وغیرہ سے متعلق دل چسپ نظمیں لکھی ہیں۔

بزرگ اور استاد شاعر عبدالرحمٰن جامی نے بچوں کے لیے بھی خاصی تعداد میں نظمیں لکھی ہیں،انھوں نے بچوں کی دل چسپی ،رجحان اور ضرورت کو مد نظر رکھتے ہوئے بچوں کے کھیل کود اور تعلیمی امور پر بے شمار نظمیں لکھی ہیں۔ ان کے علاوہ مزاحیہ، آدابِ زندگی، اخلاقیات اور مذہبی معلومات پر بھی کئی نظمیں کہی ہیں، جو ضمیمہ روز نامہ سیاست حیدر آباد میں شائع ہوتی ہیں۔جامی صاحب نے جدید طریقۂ تدریس اور جدید سائنسی ایجادات پر نظمیں لکھ کر اپنی انفرادیت کا ثبوت دیا ہے،اس سلسلے میں ان کی مندرجہ ذیل نظمیں قابلِ ذکر ہیں: ٹی وی، ہوائی جہاز، کمپیوٹر، انٹرنیٹ،عصری ٹکنالوجی اور سیل فون وغیرہ۔ان کی نظموں کا مجموعہ 'جہانِ اطفال' ڈاکٹر عبدالقدوس نے مرتّب کیا ہے، جو عنقریب شائع ہونے والا ہے۔

پروفیسر ایس اے مجید بیدار ایک زمانے سے بچوں کے لیے نظمیں اور کہانیاں لکھ رہے ہیں،آپ بچوں کی ذہنی و علمی سطح کا خاص خیال رکھتے ہیں،ان کی نظموں کی زبان بڑی آسان، ہلکی پھلکی، شیریں اور موسیقی آمیز ہوتی ہے،قومی نظموں میں ان کی زبان ہندی کی آمیزش سے بہت سبک اور ترنم ریز ہو گئی ہے،ان کی نظمیں زیادہ تر بچوں کا ماہ نامہ امنگ دہلی اور دو ماہی 'غبارہ' بنگلور میں شائع ہوتی رہتی ہیں، 'پیاری اماں'، 'بچے بھارت کی شان' اور 'بھارت کو ہم سورگ بنائیں گے' ان کی شاہ کار نظمیں ہیں۔

فارسی اور اردو کے شاعر،ادیب، خاکہ نگار اور کالم نویس ڈاکٹر سید عباس متقی پوری زندگی درس و تدریس سے وابستہ رہے ہیں،اور سرکاری مدارس کی اردو نصابی کتب کی تدوین و ترتیب میں برابر حصہ لیتے رہے ہیں،انھوں نے بہت چھوٹے بچوں کے لیے بھی نظمیں کہی ہیں جو ایک مشکل کام ہے،ان کی ایک نظم: 'چڑیا گھر کی سیر' بہت عرصے تک آندھرا پردیش سرکاری مدارس کی پہلی جماعت کی درسی کتاب میں شامل رہی ہے،ان کی نظمیں بچوں کا ضمیمہ 'گلدستہ' روز نامہ منصف میں گاہے بگاہے شائع ہوتی ہیں،ان کی نظمیں بچوں کو ذہنی تفریح اور رومان پرور ماحول سے ہم کنار کرتی ہیں، خالص تفریحی نظموں میں بھی وہ سبق آموز پہلو کشید کر لیتے ہیں۔

تتلی سے چپ رہنا سیکھو   خاموشی سکھائے تتلی
چڑیا گھر میں سب حیواں ہیں   شکر خدا کا ہم انساں ہیں

مشہور شاعر، مصنف، محقق اور نقاد ڈاکٹر عبدالرؤف خیر 1960 سے تا حال بچوں اور بڑوں کے لیے لکھ رہے ہیں،ان کی ایک نظم: 'جب میں اسکول جانے لگتا ہوں' (کھلونا مارچ 1972) حکومت مہاراشٹرا کی چوتھی جماعت کے نصاب میں 1983 تا 1993 شامل رہی ہے،اور ایک نظم 'ہمالہ' آندھرا پردیش میں دوسری جماعت کے سرکاری نصاب میں برسوں شامل رہی ہے،ادھر چند سالوں سے ان کی نظمیں ماہ نامہ امنگ کے شماروں میں جا بجا نظر آتی ہیں،اپنی نظموں میں وہ کبھی کوّے کی ہوشیاری بیان کرتے ہیں، پانی اور ہوا کی افادیت و ضرورت پر روشنی ڈالتے ہیں، کبھی مزدور بچہ کی حالتِ زار بیان کرتے ہیں جو اسکول جانے سے محروم رہتا ہے۔

'دشتِ آرزو' کے شاعر لطیف آرزو کوہیری بچوں کے رسائل: امنگ، نور، اور فنکار نو وغیرہ میں لکھتے رہے ہیں، 1980 سے وہ بچوں کے لیے نظمیں وغیرہ لکھ رہے ہیں، 'لطیف نظمیں' کے نام سے انھوں نے مختصر و منتخب مجموعہ ترتیب دیا ہے،۔لطیف آرزو ایک مخلص اور خدا ترس مومن ہیں،ان کی نظموں میں بچوں کو محبت، خلوص، امن، حسنِ عمل، نیکیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کا پیغام ہے،انھوں نے بچوں کو گندے ناول اور رسائل سے دور رہنے کا مشورہ دیا ہے، نمونۂ کلام ملاحظہ ہو

مہر و وفا کے پھول کھلاتے رہیں گے ہم
حسنِ عمل کے موتی لٹاتے رہیں گے ہم
امن واماں کی بچو! دنیا ہے پیاسی کب سے
دنیا کو تم بچاؤ اللہ کے غضب سے

ذکیہ تجلّی (م: 2013) بچوں کے ماہ نامہ فنکار نو اور گلدستہ ضمیمہ روز نامہ منصف میں ادھر پابندی سے لکھ رہی تھیں، وہ بچوں کے لیے مختصر، دل چسپ اور سبق آموز کہانیوں اور مضامین کے علاوہ نظمیں اور حمد و دعا وغیرہ لکھتی تھیں،ان کی نظمیں 'اماں' اور 'میری پوتی منال' بہ طور خاص قابلِ ذکر ہیں۔

اماں، اماں، اماں، اماں   میں ہوں جان ودل سے قرباں
خدمت کروں گا تیری اماں   قدموں تلے ہے جنت تیرے
جنت ہے تو میری اماں   اماں، اماں، اماں، اماں

بچوں کے کل وقتی شاعر، ادیب اور مضمون نگار حافظ امجد حسین امجد کرناٹکی (پ: 1964) بچوں کے حالیہ دور میں نہایت ممتاز مقام رکھتے ہیں، انھوں نے بچوں کے لیے کافی تعداد میں حمد، نعت، منظوم سیرت پاک، رباعیات، قطعات، گیت، ترانے، غزلیں اور لوریاں وغیرہ لکھی ہیں، کثرت تصانیف کی بنا پر افتخار امام صدیقی اور محمد فرحت حسین خوشدل نے آپ کو بچوں کی شاعری کا امام قرار دیا ہے، بچوں کی شاعری سے متعلق ان کی کتابوں کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

نور وحدت، شمع ہدیٰ، ہمارے نبیؐ، موج تسنیم، طفلستان، معصوم ترانے، چاند گگن، مہکتی کلیاں، گلشن گلشن۔ شبنم شبنم، بلبلوں کے گیت، زمزمے، چمکتے ستارے، صحن مسرت، ہندوستان، لوریاں، معصوم غزلیں، ننھی منی غزلیں، صبامستان، فانوسِ حرم، اشک و رشک، رباعیاتِ امجد حصۂ اول، دوم، سوم، لحن، گلپوش جھروکے، آسان بیت بازی وغیرہ۔

حافظ صاحب نے بچوں کے اسلامی ادب میں قابلِ رشک خدمات انجام دی ہیں، یہی وجہ ہے کہ ریاست کرناٹکا اور مہاراشٹرا کے تقریباً دس دینی مدارس میں آپ کی دس دینی کتابیں داخلِ نصاب ہیں۔ منظوم سیرتِ نبویؐ پر مشتمل آپ کی کتاب 'ہمارے نبیؐ' لکھ کر آپ نے بچوں کی اہم ضرورت کی تکمیل کی ہے، اس ضخیم مجموعے میں آپ نے سیرتِ نبویؐ کے تمام اہم واقعات کو آسان اور رواں اسلوب میں قلم بند کیا ہے، آپ کی شاعری حفیظ جالندھری، مولانا حالی، عزیز بگھروی اور ابوالمجاہد زاہد حسین کی یاددلاتی ہے۔ مذہبی و اخلاقی موضوعات کے علاوہ آپ نے بچوں کے لیے سائنس، جغرافیہ، عمرانیات، ماحولیات اور حفظانِ صحت وغیرہ پر بڑی اچھی اور پیاری نظمیں لکھی ہیں۔

حافظ کرناٹکی کے بعد ریاست کرناٹک میں بچوں کے شاعر کی حیثیت سے ایک اہم اور معتبر نام ظہیر رانی بنوری کا ہے، بچوں کے لیے ان کی شاعری کے چار مجموعے شائع ہو چکے ہیں: کلیاں (1976)، گلاب (1992)، گلستاں (2003)، گلشن ظہیر (2011) پہلے تینوں مجموعے کرناٹکا اردو اکیڈمی سے شائع ہوئے ہیں، جب کہ آخری مجموعہ قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے شائع ہوا ہے، ان کی نظمیں بچوں کے تمام رسائل میں پڑھنے کو

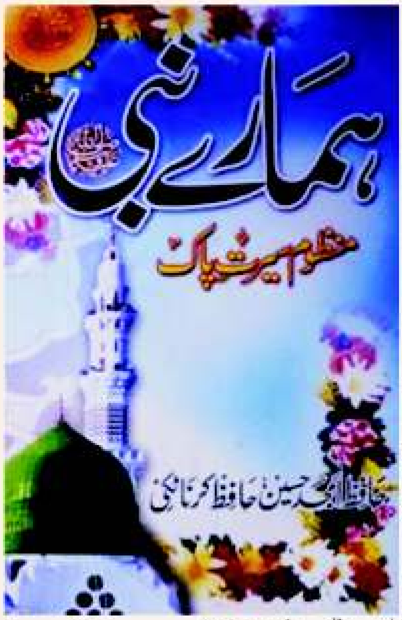

ملتی ہیں، ظہیر رانی بنوری کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے چھوٹے چھوٹے، آسان اور ہلکے پھلکے مصرعوں میں زیادہ تر نظمیں کہی ہیں۔ سبک اور آسان لفظوں پر مشتمل ان کی نظمیں بچوں کے لیے ہرگز گراں بار نہیں ہوتیں، بچے انھیں آسانی سے مزے لے لے کر پڑھتے اور یاد کر سکتے ہیں، انھوں نے کافی مقدار میں حمد، نعت، فرائضِ اسلام، عبادات، مذہبی، قومی، وطنی، اخلاقی، تاریخی اور جدید موضوعات پر نظمیں لکھی ہیں، نظم 'کمپیوٹر' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

کمپیوٹر ہے چیز نرالی   حیرت والی، جادو والی
روپ ہے اس کا ٹی وی جیسا   کام ہے اس کا بڑا انوکھا
بٹن دبا کر حرف بناؤ   بنا قلم کے لکھتے جاؤ
لوگوں کو خبریں پہنچائے   اوروں کا پیغام یہ لائے

شاکرہ بیگم صبا درس وتدریس کے مقدس پیشے سے وابستہ رہی ہیں، بچوں کے ادب سے آپ کو خاصی محبت ہے، بچوں کے لیے آپ نے کئی نظمیں اور گیت لکھے ہیں، آپ کی نظموں اور گیتوں کا مجموعہ 'گلدستۂ صبا' 2001 میں کرناٹک اردو اکیڈمی بنگلور سے شائع ہوا ہے، آپ کو اس بات کا احساس ہے کہ بچوں کو ابتدا ہی سے مذہب، اخلاق اور مہذب سماج کے بنیادی اصولوں سے واقف کرانا چاہیے، تا کہ وہ اچھے شہری بن سکیں، یہ کام ابتدائی عمر سے ہی کھیل کود کے طریقے سے اور سلیس نظموں کے پیرایہ میں کرنا چاہیے، چنانچہ نرسری اسکولوں کے بچوں کے لیے (55) نظموں اور گیتوں کا مجموعہ مرتب کیا ہے، اس میں موضوعات کی رنگارنگی ہے، بچوں کی دل چسپی، ان کی ہمہ جہت معلومات اور ذہنی وفکری نشوونما کا خیال رکھا گیا ہے، نظم: 'نیک بچے کی آرزو' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مجھ سے رب راضی ہو ہمیشہ   اس پہ فدا ہے ریشہ ریشہ
سب کے دکھ میں کام میں آؤں   ہر ایک کو میں سکھ پہنچاؤں
میں نہ کسی کی کروں برائی   لوں نہ کبھی میں چیز پرائی

کڑپہ آندھرا پردیش کے ستار فیضی حالیہ دور میں بچوں کے ایک کامیاب شاعر ہیں، وہ اپنی ریاست سے بچوں کی شاعری کی کامیاب نمائندگی کر رہے ہیں، رسائل میں چھپنے کے علاوہ ان کی شاعری کا مجموعہ 'دھنک' کے نام سے شائع ہو چکا ہے، جس میں حمد، نعت، موضوعاتی نظمیں، مختصر نظمیں (ننھی منی نظمیں)، حب الوطنی سے متعلق نظموں کے علاوہ 36 حرکاتی نظمیں (تحتانوی طلبہ کے لیے) اور قطعات کی ہیئت میں پچاس پہیلیاں ہیں، ستار فیضی کی نظموں کی زبان آسان اور ہلکی پھلکی ہے، انھوں نے چھوٹے بچوں کے لیے ان کی اپنی زبان میں لکھ کر قلمی پختگی کا ثبوت دیا ہے۔

ان کے علاوہ جنوبی ہند میں بچوں کے نظم گو شعراء کا ایک قافلہ ہے، اختصار کے پیشِ نظر ان کے نام لکھنے پر اکتفا کیا جا رہا ہے:

یعقوب اسلم عمری، شاہوار بیگم، وائی محمد فضل اللہ رومی، الف احمد برق، مشتاق سعید، محمود خاں قیصر، انور عزیز، رضیہ یاسمین راز، ڈاکٹر وحید انجم، شہ نواز بانو یاسمین، ریشماں طلعت شبنم، جلال الدین اکبر، سردار سلیم اور ظفر صدیقی وغیرہ۔

مذکورہ جائزے سے اندازہ ہوتا ہے کہ قرنِ حاضر میں جنوبی ہند میں بچوں کی شاعری کی حالت کسی حد تک بہتر ہے۔ اگر مغربی ہند کی ریاست مہاراشٹرا کی طرح جنوبی ہند میں مادرِ مہربان اردو کو ذریعۂ تعلیم کے طور پر عام کیا جائے تو بڑی تعداد میں قارئین اور اہلِ قلم پیدا ہو سکتے ہیں۔

کتابیات:

1. اردو میں بچوں کا ادب، از: ڈاکٹر خوشحال زیدی
2. اردو میں بچوں کا ادب، از: ڈاکٹر سیدہ مشہدی
3. اردو میں بچوں کے ادب کی انتھولوجی، از: ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی
4. بچوں کے ادب کی تاریخ، از: ڈاکٹر سید اسرار الحق سبیلی
5. بچوں کا ادب اور اخلاق ایضاً
6. دکن میں اردو، از: سید نصیر الدین ہاشمی
7. مدراس میں اردو ایضاً

■

Dr. Syed Asrarul Haque
Asst Prof. Dept of Urdu
Government Degree College
Siddipet - 502103 (Telangana)
Mob.:09346651710

سعود عالم

بچوں کے شاعر محمد اقبال

اقبال اردو کے اہم شاعر ہیں۔ ان کے کلام کا مطالعہ کرنے سے پتا چلتا ہے کہ شاعری اقبال کی جبلت میں شامل تھی۔ اقبال نے شاعری کا آغاز بہت پہلے کردیا تھا اور بہت جلد انھیں مقبولیت بھی مل گئی تھی۔ 1899 میں انجمن حمایت الاسلام کے ایک جلسے میں جب انھوں نے اپنی نظم 'نالۂ یتیم' پڑھی تو اسی وقت لوگوں کو اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ لڑکا آگے چل کر بہت بڑا بننے والا ہے۔ اسی عرصے میں اقبال کی ایک دوسری نظم 'ہمالہ' بھی کافی مقبول ہوئی۔ اس کے بعد تو لوگوں کی زبان پر اقبال کا چرچا عام ہوگیا۔ 1904 میں اقبال نے ایک نظم 'ترانۂ ہندی' کے نام سے لکھی۔ یہ نظم اس زمانے میں اتنی مشہور ہوئی کہ ہر خاص وعام کی زبان زد ہوگئی۔ موجودہ دور میں بھی اس نظم کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی اس وقت تھی۔ ہندوستان کے بیشتر پروگراموں میں یہ نظم گائی اور سنائی جاتی ہے۔ اس نظم میں حب الوطنی کا اظہار ہے۔ گویا کہ اقبال اپنے ابتدائی دور میں جتنے مقبول تھے آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں۔

اقبال 1905 میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ چلے گئے، وہاں انھوں نے انگلستان کی مشہور یونیورسٹی کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیا اور فلسفے کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے بعد اقبال انگلستان سے جرمنی کوچ کر گئے اور وہاں کی مشہور میونخ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری لی۔ یہ ڈگری انھیں تحقیقی مقالہ 'ایران میں فلسفۂ الٰہیات کا ارتقا' پر تفویض کی گئی۔ اقبال نے بیرسٹری کی سند برطانیہ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ پروفیسر آرنلڈ اُس وقت لندن یونیورسٹی میں عربی کے استاد تھے۔ وہ چھ مہینے کے لیے چھٹی پر گئے ہوئے تھے، اِس دوران اقبال ان کے قائم مقام لندن یونیورسٹی میں عربی کی تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ 1908 میں یورپ سے واپسی کے بعد اقبال نے شاعری کو جو رُخ دیا اُس کا مطالعہ ہر خاص وعام کے لیے ضروری ہے۔ یورپ میں رہ کر اقبال کی شخصیت میں بڑا نکھار پیدا ہوا۔ انھوں نے مغربی تہذیب کا کھوکھلا پن بہ نظرِ غائر دیکھا۔ ان کی نظم 'لینن خدا کے حضور میں' سے اس کا پتا چلتا ہے۔

اقبال کی شاعری میں بچے، بوڑھے، جوان اور خواتین ہر طبقے کے لیے جگہ ہے۔ ہم فی الوقت بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں سے ایک نظم 'بچے کی دُعا' پر مختصراً گفتگو کریں گے۔

بچوں کے لیے لکھی گئی نظموں میں ایک پہاڑ اور گلہری، ایک گائے اور بکری، ایک مکڑا اور مکھی، ایک پرندہ اور جگنو، بچے کی دعا، ہندوستانی بچوں کا گیت، جہاں تک ہوسکے نیکی کرو، محنت، ہمدردی، ماں کا خواب، گھوڑوں کی مجلس، جگنو، شہد کی مکھی اور پرندے کی فریاد' قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر نظمیں اقبال نے دوسری زبانوں سے اردو میں منتقل کی ہیں۔ خواہ ترجمے کی شکل میں یا دیگر ذرائع کے طور پر۔ محققین وناقدین انھیں جو نام دینا چاہیں دے سکتے ہیں۔ واضح رہے کہ اقبال کی ان نظموں پر کسی بھی صورت میں سرقہ کا الزام عائد نہیں ہوتا۔ اقبال نے ہر نظم سے پہلے اس کے ماخذ کا حوالہ دیا ہے اور انھوں نے یہ اعتراف بھی کیا ہے کہ ان تمام نظموں کے خیالات دوسری زبان سے اردو میں منتقل کیے گئے ہیں۔ البتہ زبان اور اسلوب اقبال کے اپنے ہیں۔

زیر بحث 'بچے کی دعا' اقبال کی وہ نظم ہے جو دنیا میں جگہ جگہ پڑھی جاتی ہے۔ یہ نظم ہندوپاک کے بیشتر اسکولوں میں ترانہ کی شکل میں بطور دعا پڑھائی جاتی ہے۔ اس نظم کے ذریعہ اقبال نے تمام برادران وطن وقوم وملت کو یہ تعلیم دینے کی کوشش کی ہے کہ اگر خدا نے انسان کو توفیق عطا کی تو وہ اپنے علم اور طاقت کی بدولت

دنیا میں کچھ بھی کرنے پر آمادہ ہوسکتا ہے۔ وہ دنیا میں پھیلی تاریکی کو روشنی میں تبدیل کرسکتا ہے۔ جیسا کہ اس شعر سے واضح ہوتا ہے۔

دوٗر دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے
ہر جگہ میرے چمکنے سے اُجالا ہو جائے

اقبال نے اگلے شعر میں وطن سے محبت کا پیغام دیا ہے۔ حب الوطنی اقبال کی فطرت میں شامل تھی ویسے بھی انسان جس ملک میں رہتا ہے اس کو اس ملک کا وفادار بن کر رہنا چاہیے۔ اقبال نے اس کی تعلیم اپنی شاعری کے ذریعہ دینے کی کوشش کی ہے۔

یہ شعر دیکھیں۔

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

اس شعر میں اقبال نے اپنا ایک فلسفہ 'خودی' My self کو پیش کیا ہے جیسا کہ اس شعر کے پہلے مصرع کا پہلا جز 'ہو مرے دم سے' سے واضح ہوتا ہے۔ اقبال کا فلسفہ ہے کہ اگر انسان نے اپنے آپ کو پہچان لیا تو سمجھو اُس میں ہر کام کرنے کی صلاحیت موجود ہے۔ اسی فلسفے کو مدنظر رکھتے ہوئے اقبال دعائیہ انداز میں رب کریم سے دست دراز ہیں کہ اے میرے خالق! تو مجھے اس لائق بنا دے، میرے اندر وہ صلاحیت پیدا کردے کہ میں اپنے علم اور طاقت کی بدولت اپنے ملک کی حفاظت کرسکوں۔ اس کی مثال اقبال نے دوسرے مصرع میں دینے کی کوشش کی ہے کہ جس طرح پھول کے وجود کے بغیر چمن کی زینت بے رونق ہے اسی طرح میرے بغیر ملک کی حفاظت بھی نامکمل ہے۔

اس نظم میں ایک شعر ایسا ہے جو ہم میں سے ہر ایک کو اپنی طرف کھینچ لیتا ہے۔ ملاحظہ ہو یہ شعر۔

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا

شعر پڑھتے ہی اندازہ ہوجاتا ہے کہ شاعر اس کے ذریعہ کیا پیغام دینا چاہتا ہے۔ آدمی جتنا بھی بڑا ہوجائے باوجود اس کے دل میں خدمتِ خلق کا ایک گوشہ ضرور مخفی ہوتا ہے۔ اسی طرح آدمی جتنا بڑا گناہ گار کیوں نہ ہو، اس کے دل میں اپنی خطا ونسیان کی تلافی کی جگہ باقی رہتی ہے۔ وہ اس کا ازالہ غریبوں کی حمایت اور دردمندوں کی خیرخواہی اور ہمدردی کے ذریعہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور اس کے بعد ہی اپنے رب کے دربار میں جانا چاہتا ہے۔

اقبال کو علما و ناقدین نے کئی طرح سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ بعض نے انھیں فلسفی تصور کیا ہے تو بعض نے انھیں اسلامی شاعر کے طور پر دیکھنے کی کوشش ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی شاعری فلسفہ اور اسلامیات کا سنگم ہے۔ اقبال نے ان دونوں کو ایک ساتھ آسان لفظوں میں پروکر پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کی بہترین مثال اس نظم کے ان اشعار میں دیکھی جاسکتی ہے۔ یہ اشعار حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کی بھی تصدیق کرتے ہیں۔ ان میں مارکس اور گاندھی جی کے فلسفہ کو بھی تلاش کیا جاسکتا ہے۔

ہو مرا کام غریبوں کی حمایت کرنا
درد مندوں سے ضعیفوں سے محبت کرنا
زندگی ہو مری پروانے کی صورت یارب
علم کی شمع سے ہو مجھ کو محبت یارب

اقبال صرف یہیں نہیں رکتے بلکہ وہ ایک قدم آگے بڑھ کر اس مشن کی کامیابی کے لیے دعا کرتے ہیں۔

میرے اللہ برائی سے بچانا مجھ کو
نیک جو راہ ہو اس رہ پہ چلانا مجھ کو

اقبال کی اس نظم میں سورۂ فاتحہ کی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ جیسا کہ آخری شعر 'اهدنا الصراط المستقیم' کا صریح ترجمہ ہے۔

'علم کی شمع' یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انسان یا قوم کی نجات صرف ایک ہی چیز میں ہے اور وہ علم ہے۔ علم کی طاقت سے آج کے مادیت پرست دور میں انسان ضرور چاند تارے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ اصل علم سے دور ہے۔

اقبال نے بچوں کی تعلیم سے متعلق ایک مضمون بھی لکھا تھا جو پہلی بار 1902 میں رسالہ 'مخزن' میں شائع ہوا تھا۔ یہ مضمون دوسری بار اسی مجلّہ میں اکتوبر 1917 میں بھی شائع ہوا۔ دوبارہ شائع ہونے سے مضمون کی اہمیت کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اقبال بچوں کی تعلیم کے سلسلے میں کتنے فکرمند رہے ہوں گے۔ اقبال ایک دوسری جگہ لکھتے ہیں: ''تمام قومی عروج کی جڑ بچوں کی تعلیم ہے۔'' آگے مزید لکھتے ہیں: ''حقیقی انسانیت یہ ہے کہ انسان کو اپنے فرائض سے پوری پوری آگاہی ہو اور وہ اپنے آپ کو اس عظیم الشان درخت کی ایک شاخ محسوس کرے، جس کی جڑ تو زمین میں رہے مگر اس کی شاخیں آسمان کے دامن کو چھوتی ہیں۔''

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بچے کسی بھی ملک کے مستقبل ہوتے ہیں۔ ان کے مستقبل کا انحصار تعلیم پر ہوتا ہے اور تعلیم انسان کا وہ واحد ہتھیار ہے جو انھیں دیگر تمام چیزوں سے ممتاز کرتی ہے۔ تعلیم کے ساتھ ایک دوسری چیز تربیت کا ہونا بھی ضروری ہے۔ یہ دونوں ضروری ہیں۔ کسی بھی ملک یا قوم میں بچے جب تک تعلیم سے آراستہ نہیں ہوتے تب تک وہ قوم یا سماج ترقی نہیں کرسکتی۔ ایسے میں بچّوں کی تربیت، ان کی تربیت گاہوں اور ان کے نصاب پر گہری نظر رکھنا اہم ہوجاتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں اردو کی تعلیم کا عام چلن ہے۔ ہر خاص وعام اپنے بچوں کو اردو کی تعلیم سے واقف کرانا اپنا فرض منصبی سمجھتا ہے۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مسلم کلچر میں اردو ایک ایسی زبان تسلیم کرلی گئی ہے کہ اس زبان میں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت کا راز بھی مضمر ہے۔ ایک زمانے میں اقبال، حالی، نظیر اور اسماعیل میرٹھی کی نظموں نے اور ڈپٹی نذیر احمد وراشد الخیری کے ناولوں نے ہمارے معاشرے کے بچوں میں بیداری پیدا کی اور ایک نیا رُخ دیا لیکن آج ہمارے ملک وقوم کے بچوں کا مستقبل تاریک نظر آرہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی اقبال اور اسماعیل میرٹھی جیسے شعرا ہمارے معاشرے کے بچوں کے لیے آئیڈیل ہیں جن کی شاعری نے پورے معاشرے کو ایک نئے طریقے سے سوچنے اور عمل کرنے پر مجبور کردیا۔

اقبال نے جو کہا اس پر انھوں نے عمل بھی کیا۔ اقبال نے بچوں سے متعلق بہت ساری نظمیں لکھیں جس کا تذکرہ ہم نے مضمون کے شروع میں کردیا ہے۔ انھوں نے بچوں کے علاوہ اعلیٰ ثانوی درجات کے طلبا و طالبات کے لیے بھی سبق آموز نظمیں لکھی ہیں۔ ان میں 'چاند اور تارے'، 'شمع اور شاعر' قابل ذکر نظمیں ہیں۔

ہیئت کے اعتبار سے یہ نظم 'بچے کی دعا' مثنوی کی ہیئت لیے ہوئے ہے۔ اقبال کی بیشتر نظمیں مثنوی اور قصیدہ کی ہیئت میں ہیں۔

'بچے کی دعا' اپنے آپ میں ایک چھوٹی سی نظم ہے۔ نظم؛ اردو ادب کی وہ صنف ہے جو دو معنوں میں مستعمل ہے۔ نظم بالعموم نثر کے مقابل استعمال ہوتی ہے۔ اس کے تحت قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ اور مخمس ومسدس وغیرہ اصناف آتے ہیں۔ دوسرا، نظم اپنے آپ میں ایک منفرد اور جداگانہ صنف کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے تحت نظم کی کئی قسمیں ہیں جیسے پابند نظم، آزاد نظم، نظم معریٰ اور نثری نظم وغیرہ۔ متذکرہ بالا بحث کو سامنے رکھ کر اگر اس چھوٹی سی نظم پر طائرانہ نظر ڈالی جائے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ نظم ہیئت کے اعتبار سے تو مثنوی کی ہیئت میں ہے لیکن تعدادِ اشعار کی وجہ سے اس کو نظم کے زمرے میں رکھنا زیادہ مناسب ہوگا۔

■

Saud Alam
B-114, Okhla Main Market
Jamia Nagar, Okhla, New Delhi - 110025
Mob: 8076495936 , saudalam1983@gmail.com

بچوں کے صالح ادیب وشاعر

مرتضیٰ ساحل تسلیمی

پرویز اشرفی

آج ادب اطفال کے میدان میں بے شمار شعرا اور ادبا نے بچوں کے لیے ادب تخلیق کیا ہے لیکن اُن میں چند ہی ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو بچوں کے شعری ونثری ادب کے لیے وقف کر دیا ہو۔ نئی نسل کو صالح اور بامقصد شعری ونثری ادب پیش کرنے والوں میں مرتضیٰ ساحل تسلیمی کا نام سرفہرست ہے۔

مرتضیٰ ساحل تسلیمی اپنی بات بچوں یا بڑوں تک پہنچانے کے لیے انتہائی دل چسپ، پُرکشش اور مقناطیسی اسلوب اختیار کرتے ہیں۔ روزمرہ کے عام فہم الفاظ کا استعمال کر کے اپنی تخلیق کو نہ صرف دلچسپ بنا دیتے ہیں بلکہ اَن پڑھ قاری یا سامع بھی اُن سے محظوظ ہوئے بنا نہیں رہ پاتا۔

ہنسی ہنسی میں پتے کی بات کہہ گزرنے میں مرتضیٰ ساحل تسلیمی کو ملکہ حاصل تھا۔ لطیفہ گوئی کا انداز اختیار کر کے اپنا مقصد واضح کر دینے میں بھی انھیں کمال حاصل تھا۔ ان کا یہ انداز بچوں کا پسندیدہ انداز ہر دور میں رہا ہے۔

بچوں کی اس نفسیات کو پہچاننا تو بہت ہی آسان ہے لیکن اس کے تقاضوں کو پورا کرنا آسان نہیں ہے جب کہ ساحل صاحب نے اسے بھی آسان سمجھ کر خارزار ادب میں قدم رکھا۔ ان کی ایک نظم کا نمونہ حاضر ہے۔

وہ اپنے ساتھیوں میں بڑا نیک نام ہے
ہر آدمی سے اُس کی دعا و سلام ہے
چھوٹوں کے واسطے ہے بہت اُس کے دل میں پیار
اور جو بڑے ہیں اُن کے لیے احترام ہے

مرتضیٰ ساحل تسلیمی نے زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والوں کا اپنے قلم سے تعارف کرایا ہے۔ عام طور پر لوگوں کا دھیان جن کی طرف نہیں جاتا ان کی نظروں سے وہ بھی نہیں بچ پائے۔ مثال کے طور پر انھوں نے دھوبی، کمہار، لوہار، کسان، غبارے والا، چاٹ والا، پھلوں والا وغیرہ۔ پرندوں چرندوں اور دُنیا بھر کی مشہور وغیر مشہور اشیا پر نظموں کا ایک انبار لگا دیا ہے۔ اس طرح کی چند نظموں کے اشعار سے لطف اُٹھائیے۔

نظم بعنوان 'بڑھئی'

اسے لوگ کہتے ہیں سب بڑھئی
ذرا دیکھیے اس کی کاریگری
بہت محنتی ہے سمجھدار ہے
حقیقت میں یہ اچھا فنکار ہے

پھر بڑھئی کے مختلف اوزاروں مثلاً بسولہ، برما، رندہ، پلاس، پیچ کس، چھینی ہتھوڑی، ریتی اور آری وغیرہ کا ذکر کر کے اُنھیں حلال روزی کمانے کا حلال ذریعہ بتاتے ہیں۔

یہ اوزار سب اُس کے آتے ہیں کام
انھی کی بدولت کماتا ہے دام

جہاں تک بچوں کے ادب اور شاعری کا تعلق ہے، ساحل صاحب نے کوئی گوشہ چھوڑا نہیں ہے۔ اگر مثال پیش کرنا شروع کروں تو ایک دفتر ضخیم چاہیے۔ 'اخبار' جیسے سنجیدہ عنوان کے تحت بچوں کے لیے انھوں نے جو نظم لکھی ہے وہ الفاظ اور خیالات پر اُن کی دسترس کو ثابت کرتی ہے۔ پیش ہے نمونہ۔

ایک جنگل سے یہاں آئی ہیں چڑیا اُڑ کر
جو یہ کہتی تھیں کہ جینا تھا وہاں پر دوبھر
ہم تھے محفوظ گھروں میں نہ گھروں سے باہر
کوئی راجا تھا وہاں، فوج نہ کوئی افسر
آج کی تازہ خبر

رات دن ہوتی ہے آپس میں لڑائی گھر گھر
چوریاں رات کو ہوتی ہیں وہاں پر اکثر
کل تو اک چوہے نے بلی کے لیے کان کتر
''ایک انساں نے کیا ایک گدھے کا مرڈر''
آج کی تازہ خبر

تھک کے اک پیڑ کے سائے میں جو بیٹھا نائی
اُسترا اُس کا چُرا لے گیا بندر بھائی
استرا ناک پہ رکھا تھا کہ شامت آئی
اپنے ہاتھوں ہی سے خود ہوگیا نکٹا بندر
آج کی تازہ خبر

ان نظموں کے سمندر سے میں نے ایک اور موتی تلاش کر کے نکالا ہے۔ عنوان ہے 'ضمیر' اس پر غور کیجیے۔

میں کون ہوں بتائیے کیا میرا نام ہے
میں کون ہوں بتائیے کیا میرا کام ہے
آیا ہوں میں کہاں سے کہاں میرا قیام ہے
ہمدرد ہوں رفیق ہوں یہ جان لیجیے
میں ہوں ضمیر آپ کا پہچان لیجیے

اُٹھے غلط قدم تو بتاتا ہوں آپ کو
ہر ہر غلط عمل پہ جتاتا ہوں آپ کو
میں جاگتا ہوں خود بھی جگاتا ہوں آپ کو
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُسے مان لیجیے
میں ہوں ضمیر آپ کا پہچان لیجیے

جب بولتے ہیں آپ کبھی جھوٹ برملا
اور ٹوکتا ہوں میں کہ یہ عمل نہیں بھلا
اس وقت گھونٹتے ہیں مرا آپ ہی گلا
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُسے مان لیجیے
میں ہوں ضمیر آپ کا پہچان لیجیے

کرتے ہیں آپ نقل اگر امتحان میں

اس ڈھنگ سے کہ آئے نہ شان وگمان میں
میں ٹوکتا ہوں آپ کو دل کی زبان میں
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُسے مان لیجیے
میں ہوں ضمیر آپ کا پہچان لیجیے
کرتے ہیں دوستوں سے اگر آپ گفتگو
رکھتے ہیں دوسروں کی کہاں پاس آبرو
غیبت کی خو کو آج ہی کر دیجیے آخ تھو
جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اُسے مان لیجیے
میں ہوں ضمیر آپ کا پہچان لیجیے

ادب کے اس ساحل پر نہ صرف شاعری بلکہ طنز ومزاح، افسانہ، اصلاحی واسلامی ادب کے جہاز بھی لنگر انداز نظر آتے ہیں۔

ایک اہم اور قابل تعریف بات ساحل صاحب کے ذہن وقلم کی یہ ہے کہ وہ گرما گرم، سلگتے ہوئے مسائل پر بھی نظمیں اور کہانیاں لکھتے رہے ہیں۔ مثلاً جہیز کا بھیانک مسئلہ، طلبا میں انتشار و بے چینی، لاقانونیت کا عام رجحان، سماجی بگاڑ، سیاسی بدعنوانیاں، گھریلو مسائل اور مادہ پرستانہ مزاج کا انجام وغیرہ۔ 'الحسنات' اور 'بتول' وغیرہ کے اداریوں میں مذکورہ موضوعات کا احاطہ ایسے پیارے انداز میں کرتے ہیں جیسے کوئی خشک مضمون نہیں بلکہ مزے دار کہانی سنا رہا ہو۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی کی اس خاموش جدوجہد کا اچھا نتیجہ ہی اُن کے لیے صلہ ہے، انعام ہے اور ناموری کا ذریعہ ہے۔ ظاہر ہے بامقصد ادبی زندگی گزارنے والے قلم کار کا مقصد ہی اپنے مقصد میں کامیاب ہونا ہوتا ہے۔ وہ دنیاوی شہرت اور تعریف وتوصیف سے ہمیشہ بے نیاز ہی رہتا ہے۔ اس کی بے نیازی ہی اُس کے لیے دنیا کی بڑی دولت ہوتی ہے۔

ساحل صاحب بچوں کے شاعر اور ادیب ہونے کے باوجود بڑوں کے لیے بھی وقتاً فوقتاً لکھتے ہیں مگر یہاں بھی وہی صالح مقصد پیش نظر رہتا ہے، جو بچوں کے قلم کار کی حیثیت سے رہتا ہے۔ چونکہ بنیادی طور پر آپ بچوں کے قلم کار کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ کسی شاعر یا ادیب میں ایسی کوالیٹی کے ساتھ ہونا بہت بڑی بات ہے، یہ بات ساحل صاحب نے اپنے اندر اُس وقت سے پیدا کر رکھی ہے جب سے اُنھوں نے لکھنا شروع کیا۔

آج کل جلسے جلوس کا بازار بھی خوب گرم ہے۔ یہ سب بھی ہڑتالوں سے جُڑی ہوئی چیزیں ہیں۔ اس لیے ساحل صاحب نے جلوس نظم کے ذریعہ آسان پیرائے میں چھوٹے بچوں کو سمجھایا ہے کہ جلوس نکالنے کا طریقہ کیا ہے؟ اور جلوس کہتے کس کو ہیں؟ جلوس نکالنے کا مقصد کیا ہوتا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ نظم 'جلوس' کے درج ذیل اشعار اس کی سلامت، روانی اور مقصدیت کا اظہار ہیں۔

شکاری جو جنگل میں آئے نظر
تو پھر ڈر کے مارے سبھی جانور
گھروں میں رہے اپنے اپنے چھپے
نہ کوئی شکاری اُنھیں دیکھ لے
شکاری گئے لوٹ جب اپنے گھر
ہوا طے کہ راجا سے جاکر کہیں
جلوس ایک لے جائیں راجا کے پاس
بتائیں کہ ہم پر ہے کتنا ہراس
زرافہ کو لیڈر بنایا گیا
اُسے سب سے آگے چلایا گیا
چلے ہاتھ اپنے ہلاتے ہوئے
چلے سب وہ نعرے لگاتے ہوئے

اگر نظم ہڑتال اور جلوس کو ایک ساتھ سامنے رکھیں تو ایسا لگتا ہے کہ شکاری کے مظالم کے خوف سے تنگ آکر سارے جانور راجا کے پاس اپنی شکایت لے کر گئے۔ جب ان کی شکایت پر توجہ نہ کی گئی تو اُنھوں نے احتجاج میں بھوک ہڑتال کردی۔ ساحل صاحب کی بہت سی ایسی نظمیں ہیں جن کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق موجود ہے۔ مرتضیٰ ساحل تسلیمی کی یہ ایک ضمنی خوبی ہے۔

آپ کی کہانیاں 'گدھا گھوڑا'، 'سرکس' اور 'دوستی' وغیرہ ایسی ہی کہانیاں ہیں جو مندرجہ بالا باتوں کی تصدیق کرتی ہیں۔ اپنی ایک نظم ''پڑھنا لکھنا کام ہے میرا'' میں بچوں کو سمجھاتے ہوئے رقم طراز ہیں کہ پڑھنے لکھنے کے ساتھ کھیل بھی ضروری ہے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہر کھیل پڑھنے والے بچوں کے لیے مناسب نہیں ہے۔

کھیلنا ہے تو کھیلو ہاکی
کرکٹ ٹینس اور کبڈی
میں کیوں کھیلو گلی ڈنڈا؟

اسی طرح 'اللہ' کے عنوان سے لکھی گئی نظم کی سلاست اور روانی دیکھیے۔

الف سے اللہ، ب سے بلا
پ سے پنجرا، ت سے تالا
ٹ سے ٹوپی، ج سے جوگی
چ سے چرخہ، ح سے حقہ
خ سے خنجر، د سے دفتر
ڈ سے ڈبہ، ذ سے ذرہ

مرتضیٰ ساحل تسلیمی نے بچوں کے لیے جو غزلیں کہی ہیں اُن میں بھی نظموں جیسی خصوصیات موجود ہیں۔ ایسی ہی ایک غزل کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

جس کو چھوٹوں سے پیار ہوتا ہے
وہ بڑا باوقار ہوتا ہے
بے ادب ہر جگہ ہے بے عزت
باادب باوقار ہوتا ہے
اس کو ہوتی ہے سب سے ہمدردی
خود بھی وہ غمگسار ہوتا ہے
بول کر جھوٹ وہ خدا جانے
کس لیے شرمسار ہوتا ہے
غم کوئی ہو مگر نماز کے بعد
دل کو حاصل قرار ہوتا ہے
اس کو اچھا کوئی نہیں کہتا
فیل جو بار بار ہوتا ہے
دولتِ دین جس کو مل جائے
وہ بہت مالدار ہوتا ہے
پاس کیا ہو وہ امتحان میں جو
مدرسے سے فرار ہوتا ہے

ظاہر ہے کہ مذکورہ غزل کے ہر شعر میں نظم کا لطف غزل کی ایک اہم شرط کے تحت ضروری ہے۔ ساحل صاحب کی کوئی بھی غزل ہو، ہر غزل میں یہی خوبی نظر آئے گی۔

مرتضیٰ ساحل تسلیمی نے نثر کے میدان میں ہی سکہ نہیں جمایا بلکہ شاعری میں بھی اپنا جواب نہیں رکھا۔ بچوں کے لیے نظمیں لکھنے کا سہرا علامہ اقبال، حضرت امیر خسرو، اکبرالہ آبادی، پنڈت برج نرائن چکبست، مولوی اسماعیل میرٹھی، حامد اللہ افسر، یکتا امروہوی اور شفیع الدین نیّر کے سر بندھا ہے، لیکن عصر حاضر میں مرتضیٰ ساحل تسلیمی نے اس صنف میں بچوں کے لیے اَن گنت نظمیں کہی ہیں۔ غزل جس کا مطلع ہے ''جس کو چھوٹوں سے پیار ہوتا ہے، وہ بڑا باوقار ہوتا ہے'' دل کی گہرائیوں کو چھو لینے والی غزل ہے۔ ہر شعر اپنی جگہ خوب ہے۔ خاص طور سے تیسرا شعر ''بے ادب ہے ہر جگہ بے عزت، باادب باوقار ہوتا ہے'' اسی طرح ''سچا مسلمان بنادے'' بھی ساحل صاحب کے مذہبی جذبے کی نشان دہی کرتا ہے کہ وہ کس طرح بچوں کو مذہب کی طرف راغب کر رہے ہیں۔ اس میں اصلاح کا پہلو مضمر ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ بچہ اُنھیں پڑھے اور اُن سے متاثر نہ ہو۔

مرتضیٰ ساحل تسلیمی کی بچوں کے لیے محبت اُن کی ہر تحریر سے جھلکتی ہے اور پڑھنے والوں کو احساس ہوتا ہے کہ وہ نونہالانِ قوم کی ذہنی تربیت اور اصلاح کے لیے کتنی تگ ودو کر رہے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ بچوں کا ادب اُن کو کبھی فراموش نہ کر سکے گا اور ان کی تحریریں بہت ہی توجہ اور پسندیدگی سے پڑھی جائیں گی!!

■

Parwez Alam
N-113, Top Floor, Gali No. 10, 20 futa Road
Batla House, Jamia Nagar, Okhla,
New Delhi - 110025
E-mail: parwezashrafi1955@gmail.com
Mob.: 9990129128

صفیہ بانو اے شیخ

گجرات میں ادب اطفال کے شاعر و ادیب

گجرات کا علاقہ اردو زبان و ادب کا مرکز رہا ہے۔ لہٰذا یہاں پر اردو ادب کی تخلیق ہوتی رہی ہے۔ ادب اطفال میں بھی یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کو نہ تو نظر انداز کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی بھلایا جا سکتا ہے میں اپنے اس مقالے میں ادب اطفال کے تعلق سے صرف دو ادیبوں کی تخلیقات پر سیر حاصل بحث کروں گی۔

اختر حسین اختر گجرات سے تعلق رکھتے ہیں، وہ بچوں کے شاعر ہیں۔ ان کی نظم 'پیسہ' ملاحظہ کیجیے۔

سب کو اپنا بنا گیا پیسہ
ساری دنیا پہ چھا گیا پیسہ
خود کو قادر، خدا، سمجھتا ہے
ہاتھ جس کے کبھی آ گیا پیسہ
گرم روٹی کو چھین کر ہم سے
دن میں تارے دکھا گیا پیسہ
ہم بھنانے گئے تھے پیسے کو
یارو! ہم کو بھنا گیا پیسہ
مکر، چوری، دغا، فریب و عناد
ہر برائی کو پا گیا پیسہ
کچھ تعلق رہا نہ اپنوں سے
سارے رشتے بھلا گیا پیسہ
دین و دنیا سے، ہر طرف سے گئے
کام ایسے سکھا گیا پیسہ
کیا تونگر، گدا، فقیر امیر
سب کو طالب بنا گیا پیسہ
موج مستی میں سب اڑا ڈالا
جب کبھی ہاتھ آ گیا پیسہ
قدر جس نے بھی کی نہیں اس کی
ہوش اُس کے اڑا گیا پیسہ
علم والا ہو یا عمل والا
سب کو اُلو بنا گیا پیسہ
ایک بازار کیا گرا اس کا
سارے بازار ڈھا گیا پیسہ
کون اختر کا نام اب لے گا
نام اپنا کما گیا پیسہ

(سخن کا سفر از اختر حسین اختر، اشاعت: 26 جنوری 2003، مطبع: آئی ایس بی ڈیجیٹل مع نیشنل آفسٹ، ڈویشور، ص 16 سے 18)

اختر حسین اختر کی پیسہ سے متعلق مذکورہ نظم اطفال کی تعلیم و تربیت کے لیے بڑی اہمیت کی حامل ہے اس نظم کا ہر شعر لا جواب ہے۔ پہلے ہی شعر سے قاری کو اندازہ ہو جاتا ہے کہ پیسہ کس قدر ہم سب کی اولین ضرورت ہے۔ اس کے بغیر زندگی بسر نہیں کی جا سکتی۔ پیسہ سب کو اپنا بنا کر ساری دنیا پر چھا گیا ہے۔

ادب اطفال کی تعلیم کا ایک مقصد یہ بھی ہوتا ہے کہ بچے زیادہ سے زیادہ تعلیم حاصل کریں کیونکہ علم کے بغیر نہ تو خدا کی معرفت حاصل ہو سکتی ہے اور نہ ہی دنیا جہان کو جانا جا سکتا ہے۔ دنیا کی ہر دولت چرائی جا سکتی ہے لیکن علم کے بارے میں حق یہی ہے کہ اسے چرایا نہیں جا سکتا۔ دنیا کی ہر دولت خرچ کرنے سے گھٹتی جاتی ہے لیکن علم کی دولت جس قدر خرچ کی جائے اُسی قدر بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ پیسہ کمانے کے لیے علم حاصل کرنا یا علم حاصل کرنے کے لیے پیسہ خرچ کرنا نہ تو ہماری زندگی کا مقصد ہونا چاہیے نہ ہی مقصود۔ مقطع میں شاعر نے پیسہ کے مقابلے علم و ادب کی ناقدری پیش کر کے اپنی بات ختم کر دی ہے۔

گنگا جمنی تہذیب ہمارے ملک کی جمہوریت، سالمیت اور یگانگت کا بنیادی عنصر

ہے ہمارے ملک میں گوداوری، کرشنا، گنگا، جمنا، نربدا، کاویری جیسے بڑے دریا بہتے ہیں ہمارے ملک کے صنعتی اور غیر صنعتی بڑے بڑے شہر انھیں دریاؤں کے کنارے آباد ہیں۔ پانی آب حیات ہے لہٰذا ہندوستانی تہذیب میں دریاؤں کو ماں (ماتا) کا درجہ حاصل ہے۔ بڑھتی ہوئی آبی آلودگی کے سبب پینے کے پانی کی قلت میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ قومی نظام صحت کو بہتر بنانے اور آبی ذخائر کو آلودگی سے بچانے کے لیے مرکزی اور ریاستی سطح پر کئی منصوبے کام کر رہے ہیں ان میں گنگا کی صفائی کا منصوبہ سب سے بڑا ہے۔ اب میں آپ کے سامنے اختر صاحب کی ایک اور نظم پیش کرتی ہوں جس کا نام 'ندی' ہے جس کی زبان نہایت ہی سادہ اور سلیس ہے۔ اردو کے ادب اطفال میں ایسی نظموں کا اضافہ بڑا ہی معنی خیز ہے۔

ندی بہتی جاتی ہے　　آگے بڑھتی جاتی ہے
بستی ہو یا جنگل　　بس بہتی ہی جاتی ہے
اٹھلاتی بل کھاتی ہے　　ناگن سی لہراتی ہے
یہ ماحول بناتی ہے　　یہ ماحول بچاتی ہے
چلتی ہے سیدھی سی کہیں　　اور کہیں مڑ جاتی ہے
بہتی ہے آہستہ کہیں　　تیز کہیں ہوجاتی ہے
گرتی ہے پربت سے کہیں　　اور کہیں سستاتی ہے
سب کی پیاس بجھاتی ہے　　سب کی شان جگاتی ہے
سب کا بوجھ اٹھاتی ہے　　بیڑے پار لگاتی ہے
کھیتوں کو پانی دے کر　　فصلیں خوب اگاتی ہیں
مت ڈالو کوڑا اس میں　　سَو سَو کام بناتی ہے
ندی آخر کو اختر　　ساگر میں مل جاتی ہے

(سخن کا سفر از اختر حسین اختر، اشاعت : 26 جنوری 2003، مطبع : آئی ایس بی ڈجیٹل مع نیشنل آفسٹ، ڈوبشور، ص 30 سے 31)

باباے قوم مہاتما گاندھی جی کی دلی آرزو تھی کہ لوگ خود کو، اپنے سماج کو اور اپنے ملک کو ہر قسم کی غلاظتوں اور نجاستوں سے پاک اور صاف رکھیں۔ اسی خیال کے تحت نظیف ہندوستان (Clean India) مہم کا پُر اثر آغاز ہوا۔ یہ مہم اب بھی جاری ہے ملک کے کونے کونے میں اس کے مثبت اور فیض رساں نتائج دیکھے جاسکتے ہیں۔ سائنس کے اس مشینی دور میں انسان اور اس کی نسل قدرت یعنی Nature سے دور سے دور تر ہوتی جارہی ہے۔ ادب اطفال میں ایسے ابواب کی شمولیت ضرور ہونی چاہیے جو بچوں کو فطرت کے قریب کردیں۔ اس نظم میں ندی کا بہتے جانا، بڑھتے جانا، اٹھلاتے جانا، بل کھاتے جانا، سستاتے جانا، لہراتے جانا، وغیرہ مناظر کا بیان پڑھنے والے قاری کے دل میں ندی پر جانے اور وہاں کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔

انٹرنیٹ کے اس دور میں بچوں کے تعلیمی نظام میں نمایاں تبدیلیاں آچکی ہیں۔ ملک کے مستقبل کے ان ذمے دار شہریوں کے ہاتھ میں سمارٹ فون دکھائی دیتے ہیں۔

ادب اطفال میں ایسے ابواب کی شمولیت ضرور ہونی چاهیے جو بچوں کو فطرت کے قریب کردیں۔ اس نظم میں ندی کا بہتے جانا، بڑھتے جانا، اٹھلاتے جانا، بل کھاتے جانا، سستاتے جانا، لہراتے جانا، وغیرہ مناظر کا بیان پڑھنے والے قاری کے دل میں ندی پر جانے اور وہاں کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔

ادبائے اطفال موجودہ دور کے تقاضوں کی ترجمانی کریں۔ ایسی تخلیقات کا تخلیق ہونا اور نصاب تعلیم میں شامل ہونا لازمی ہے مگر افسوس ہمارے تعلیمی نظام میں اب تک ایسی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہو پائی ہے۔ انسانی نسلوں نے پانی پر چلنا اور ہوا پر اڑنا تو سیکھ لیا ہے لیکن اشرف المخلوقات کی سی زندگی بسر کرنے سے کوسوں دور ہے۔ احمد خاں اثر یعنی اثر احمد آبادی علم نفسیات سے بی۔ اے تھے۔ درس و تدریس ان کا پیشہ تھا۔ انھوں نے صرف بچوں کے لیے مختلف موضوعات پر سادہ اور آسان زبان میں نظمیں لکھیں تھیں۔ ان کی نظموں میں اصلاح پسندی، تفریح اور تفنن کا عنصر جدت کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی نظم 'سبزی والی' ملاحظہ فرمائیے:

آئی سبزی والی آئی　　آؤ دیکھیں کیا کیا لائی
یہ ہے مولی وہ ہے گاجر　　کتنے اچھے لال ٹماٹر
بینگن سے آلو کی یاری　　بھنڈی کتنی پیاری پیاری
جو ہر روز کریلا کھائے　　اس کے گھر میں روگ نہ آئے
لے لو سبزی اچھی اچھی　　پالک، میتھی، اروی، گوبھی
سب کہتے ہیں سبزی کھاؤ　　سبزی کھاؤ خون بڑھاؤ

(سبزی والی (بچوں کی نظمیں) شاعر: اثر احمد آبادی، اشاعت دسمبر 2004، مطبع: خطیب کتاب گھر اینڈ پرنٹرس، ص 19)

ادبائے اطفال موجودہ دور کے تقاضوں کی ترجمانی کریں. ایسی تخلیقات کا تخلیق ہونا اور نصاب تعلیم میں شامل ہونا لازمی ہے مگر افسوس ہمارے تعلیمی نظام میں اب تک ایسی کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہو پائی ہے۔ انسانی نسلوں نے پانی پر چلنا اور ہوا پر اڑنا تو سیکھ لیا ہے لیکن اشرف المخلوقات کی سی زندگی بسر کرنے سے کوسوں دور ہے۔

جس طرح غالب اپنے خطوط میں بالمشافہ گفتگو کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اثر بھی اپنی اس نظم میں اطفال سے روبرو بات چیت کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہے۔ اس نظم میں جن جن سبزیوں کا اثر نے جس انداز میں ذکر کیا ہے وہ قاری کو حفظان صحت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ حفظان صحت پر توجہ دینا آج کے دور کی سب سے اہم ضرورت ہے۔

ریل کوئی بھی ہو (ٹوئے ٹرین، منی ٹرین، پکنک ٹرین، پیسنجر ٹرین) بچوں کے ساتھ ساتھ بڑوں کے لیے بھی تفریح کا سامان ہوتی ہے۔ اثر احمد آبادی نے بھی بچوں کے لیے 'ریل' نامی ایک نظم لکھی ہے۔ اسے ملاحظہ کیجیے۔

وہ دیکھو وہ آئی ریل　　پٹری پر لہرائی ریل
انجن ہے وہ سب سے آگے　　اس کے پیچھے ہیں بس ڈبے
گارڈ ہری جھنڈی لہرائے　　انجن اپنی چال دکھائے
سگنل کا یہ کام ہے دیکھو　　ریل سے کہہ دو ٹھہر کے جاؤ
گرمی، بارش، ہو یا سردی　　ہر موسم میں ریل ہے چلتی
ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی　　سب کی پیاری سب کی ساتھی
یہ لوگوں کا بوجھ اٹھائے　　سب کو اپنے گھر پہنچائے
کام ہے اس کا سب کی خدمت　　خدمت سے ملتی ہے عظمت

(سبزی والی (بچوں کی نظمیں) شاعر: اثر احمد آبادی، اشاعت دسمبر 2004، مطبع خطیب کتاب گھر اینڈ پرنٹرس، ص 63)

گجرات میں اردو زبان میں کثرت سے ادب اطفال تخلیق کیاجاتا رہا ہے۔یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے نہ صرف بچوں کی معیاری نظمیں لکھیں بلکہ بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں بھی لکھیں۔ اختر صاحب خالص ریاضی سے ایم۔ایس۔سی ہیں۔ قریب اڑتیس سال (38)تک درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مقالے کی طوالت کے پیش نظر میں ان کی کتاب 'جنگل کا راجہ' میں شامل دو کہانیوں پر مقالے کا اختتام کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔

گجرات میں اردو زبان میں کثرت سے ادب اطفال تخلیق کیا جاتا رہا ہے۔ یہاں کے ادیبوں اور شاعروں نے نہ صرف بچوں کی معیاری نظمیں لکھیں بلکہ بچوں کے لیے سبق آموز کہانیاں بھی لکھیں۔ اختر صاحب خالص ریاضی سے ایم۔ایس۔سی ہیں۔ قریب اڑتیس سال (38) تک درس وتدریس کے فرائض انجام دیتے رہے۔ مقالے کی طوالت کے پیش نظر میں ان کی کتاب 'جنگل کا راجہ' میں شامل دو کہانیوں پر مقالے کا اختتام کرنا مناسب سمجھتی ہوں۔

کہانی 'عزم' کا مرکزی کردار حامد نامی لڑکا ہے۔ بچے بڑے ہی معصوم ہوتے ہیں وہ ہر وقت پیار ومحبت تلاش کرتے رہتے ہیں۔ حامد بھی ایک معصوم بچہ ہے اُسے بھی پیار ومحبت اور اپنائیت چاہیے تھی مگر اس کی جلد کا رنگ کالا تھا۔ دن بہ دن کالا رنگ گہرا تا ہوتا جا رہا تھا۔ اس کہانی میں حامد کو اپنے کالے رنگ کے سبب ہوئی احساس کمتری سے باہر نکلنے کا رستہ مل جاتا ہے یہ راستہ حامد جیسے ان گنت بچوں کے لیے بھی آسان نہیں تھا۔ اس کے جسم کا کالا پن اس کے لیے عذاب بن گیا تھا۔ اس نے جغرافیہ میں پڑھا تھا کہ افریقہ کے لوگ سیاہ فام اور قبیح صورت ہوتے ہیں۔ وہ خیالات اور تصورات کی دنیا میں کھو جاتا ہے:

'' حامد یہ سب کچھ سوچتا جاتا اور اندر ہی اندر محسوس کرتا کہ اس کی جلد کی سیاہی اور گہری ہوتی جارہی ہے اور اتنا ہی نہیں بلکہ وہ بڑھنے کے بجائے گھٹتا جارہا ہے اور ایک دن لوگ اُسے حبشی ہی نہیں 'بونا بھی کہیں گے پھر تو وہ سچ مچ مہذب انسانوں کی بستی کا نہیں بلکہ افریقہ کے جنگل کا پگمی بن کر رہ جائے گا۔ ''

(بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ: جنگل کا راجہ از اختر حسین اختر، اشاعت: 1984، مطبع: نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد، ص 5)

حامد جیسا ہونہار بچہ محض اپنے کالے پن کو لے کر نفسیاتی انتشار کا شکار ہوگیا۔ خلل دماغ کے سبب وہ احساس کمتری کا شکار ہوگیا۔ اُسے محسوس ہوتا تھا کہ اس کے ساتھ نہ تو کوئی دوستی کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اُسے اپنے پاس یا اپنے ساتھ بٹھاتا ہے۔ کوئی بھی اُسے اپنے ساتھ نہ تو کھیل کود میں شامل کرتا ہے اور نہ ہی کوئی اُسے لنچ ٹائم میں کھانا کھانے میں شامل کرتا ہے۔ اسکول کے تمام بچے اُسے کلّو یا کالیا کہہ کر ہی پکارتے ہیں۔ حامد انہی خیالات میں ڈوب کر افسردہ رہنے لگا۔ علم خاک کے ذرّے کو آسمان کا درخشاں ستارہ بنانے کی صفت رکھتا ہے۔ تعلیم کے ذریعے ہی علم کے حصول کی منازل طے کی جاسکتی ہیں۔ تعلیم کے میدان میں بچوں کے درمیان پھل پھول رہے اس جیسے امتیازات کو مٹانے کی ذمہ داری کس کی؟

'' حامد کی گھبرائی ہوئی حالت اور پُر نم آنکھوں کو دیکھ کر استاد انور حسین نے پوچھا، حامد چند لمحے خاموش رہا پھر آنسوؤں کی لڑی کے ساتھ آواز اس کے گلے سے باہر نکلی' سر! کیا بدصورت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟ ''

(بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ: جنگل کا راجہ از اختر حسین اختر، اشاعت: 1984، مطبع: نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد، ص 7)

کیا بدصورت کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں؟ حامد کے ذریعے اٹھایا گیا یہ سوال کسی قیامت سے کم نہ تھا۔ اس کے استاد انور حسین اس کے لیے امید کی کرنوں سے بھرا عزم کا چراغ لے کر آئے۔ انھوں نے حامد کو سمجھایا کہ مایوسی کفر ہے۔ حوصلہ رکھو۔ تم ایک ذہین طالب علم ہو۔ تمھیں عزم کرنا ہوگا۔ یقین محکم اور عمل پیہم سے تمھیں نہ صرف اپنے ساتھیوں کو بلکہ ساری دنیا کو یہ بتانا ہوگا۔ بقول ڈاکٹر سر علامہ محمد اقبال:

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی

حامد کے عزم کرنے کے بعد اس کی زندگی میں بہت بڑا انقلاب آگیا۔ اب تک جو بچے حامد سے دوری بنائے ہوئے تھے، حامد میں آئے انقلاب آفریں تغیر کے سبب اس پر فریفتہ ہوگئے۔ اس سے دوستی کرنے، اس کے ساتھ کھانا کھانے، اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے، اور اس کے ساتھ کھیلنے کودنے میں اپنے لیے فخر سمجھنے لگے۔

اختر صاحب کی دوسری کہانی کا عنوان ہے' دولت کا فرق'۔ اس کہانی میں شہر احمد آباد کے ایک سوداگر کی زندگی کا المیہ پیش کیا گیا ہے۔ سوداگر کو اولاد نہ ہونے کا غم تھا۔ کسی فقیر کی دُعا سے وہ دو لڑکوں کا باپ بن گیا۔ سوداگر ان پڑھ ضرور تھا لیکن اس نے اپنے دونوں بیٹوں کی تعلیم کے لیے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ رازق اسکول جانے کے بہانے بازاروں میں، گلی کوچوں میں، آوارہ گردی کرتا پھرتا تھا جبکہ امتیاز جو رازق سے چھوٹا تھا، برابر اسکول جاتا تھا اور خوب دل لگا کر پڑھتا تھا۔ رازق بری صحبتوں میں پڑ کر جُوا کھیلنے، شراب پینے، اور عیاشیوں کے اڈوں پر آنے جانے میں مشغول ہوگیا جبکہ امتیاز اعلیٰ تعلیم پا کر ڈاکٹر بن جاتا ہے۔ ایک روز سوداگر کا انتقال ہوجاتا ہے۔ رازق اپنا حصہ لے کر بمبئی جیسے شہر میں جا بستا ہے اور اپنی بری عادتوں کے سبب ساری دولت گنوا بیٹھتا ہے۔ امتیاز اپنے آبائی گھر میں اپنی ماں اور بیوی کے ساتھ خوش حال زندگی بسر کرتا ہے۔ رازق کے پاس جتنا پیسہ تھا وہ سارا خرچ ہوجاتا ہے۔ جب وہ نوکری تلاش کرنے جاتا ہے تب اسے اس کے ان پڑھ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ اس کہانی کا نچوڑ ذیل کے اقتباس میں مضمر ہے۔

'' دونوں ایک ہی باپ کی اولاد تھے پھر بھی دونوں کی زندگی میں اتنا بڑا فرق صرف اس لیے تھا کہ بڑے بھائی رازق کے پاس صرف مادی دولت تھی جو کبھی بھی فنا ہوسکتی تھی جبکہ چھوٹے بھائی امتیاز کے پاس علم تھا جو لازوال اور پائندہ ہے۔ ''

(بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ: جنگل کا راجہ از اختر حسین اختر، اشاعت: 1984، مطبع: نشاط پریس ٹانڈہ فیض آباد، ص 35)

■

Dr. Sufiya Banu .A. Shaikh
C- Ground Floor Tajpalace, Kumbharwada
380001. ,Jamalpur Ahmedabad
Mob: 9824320676,6354980992
Email: shaikhsufiyabanu@gmail.com

بچوں کے ادب کے فروغ میں رسالہ نور کی خدمات

سعدیہ سلیم

اردو رسائل کی تاریخ کا جب بھی ذکر ہوگا رسالہ 'نور' کا شمار ان رسالوں میں ہوگا جس کے بطن میں علم کے خزانے موجود ہیں۔ اس رسالے پر جب بھی غور کرتی ہوں تو بڑا خوشگوار احساس ہوتا ہے۔ اردو کے کتنے ہی ایسے رسالے ہیں جن کی مدت چند ہی برسوں پر محیط ہے پر رسالہ 'نور' الحمد للہ گزشتہ 65 سالوں تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ اگر ہم اس کی خدمات کے ایک حصے کو لیں تو مضمون نہیں پوری کتاب تیار ہو جائے گی۔

1953 میں 24 صفحات پر مشتمل پندرہ روزہ نور کا اجراعمل میں آیا۔ اس کی قیمت دس پیسے تھی۔ اس وقت ہندوستان میں بچوں کی ذہن سازی کرنے والا کوئی دوسرا پرچہ نہیں تھا چنانچہ نور کے ذریعے ننھے منے بچوں کو تشفی بخش روحانی غذا نصیب ہوگئی تھی۔ ستمبر 1970 میں نور کا سالنامہ ڈائجسٹ کی شکل میں شائع کیا گیا قارئین نے اسے بہت سراہا۔ جنوری سے نور ماہنامہ ہوگیا اور بچوں کا ڈائجسٹ بھی۔

مولانا عبدالحی صاحب اس وقت کے حالات میں جہاں ملت کے بڑوں کی تعلیم وتربیت اور ان کی مذہب سے وابستگی کے لیے کوشاں تھے وہیں بچوں کی تعلیم و تربیت سے بھی غافل نہیں تھے۔ مولانا عبدالحی صاحب گہری فکر ونظر کے حامل ادیب اور صحافی تھے انھوں نے یہ محسوس کیا کہ ننھے منے بچوں کے لیے بھی کوئی رسالہ شائع ہونا چاہیے جس سے انھیں دینی، معلوماتی اور تعلیمی فوائد حاصل ہوں اور ان کو اس میں دلچسپی پیدا ہو۔ چنانچہ انھوں نے مائل خیر آبادی صاحب کے تعاون سے ایک ایسا رسالہ مرتب کیا جس میں بہت ہی سادہ زبان میں کہانیاں اور مضامین تحریر کیے گئے کہ جیسے بچوں کے آمنے سامنے گفتگو ہو رہی ہو، انھیں کوئی کہانی زبانی سنائی جا رہی ہو۔ چنانچہ اس رسالے کا اداریہ 'اللہ کے نام سے' شروع کیا گیا۔ ایک اداریہ دیکھیں جس سے اندازہ ہوگا کہ نور بچوں کی تعلیم وتربیت کے لیے کس قدر کوشاں تھا:

''لو بھئی 'نور' الحسنات سے الگ چھپ گیا۔ پہلا پرچہ آپ کے ہاتھ میں ہے۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ نور کا انتظار کر رہے تھے۔ بار بار ہمیں خط لکھتے تھے 'نور' کب آئے گا؟ کہتے تھے کل کا آتا آج ہی آجائے۔ اللہ کا شکر ہے 'نور' تیار ہوگیا۔ ہماری دعا ہے کہ ہم اسے اچھے سے اچھا بنا سکیں۔ اب نور کے صفحے بڑھ گئے ہیں۔ ہم ہر بار آپ کے لیے بہت سی نئی نئی باتیں لکھ کر بھیجیں گے۔ کہانیاں خوب آئیں گی آپ دل لگا کر پڑھیں اپنے ساتھیوں کو پڑھوائیں اور ہاں بھئی دیکھیے ایک بات نہ بھولیے گا آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو نور میں جو باتیں پسند آئیں وہ ہمیں بھی بتائیں اسی طرح جو باتیں اچھی نہ لگیں وہ بھی لکھ کر بھیجیں۔ ہم کو آپ کے خط پڑھنے میں بڑا مزہ آتا ہے۔ جو باتیں جواب دینے کی ہوں گی ہم ان کا جواب بھی چھاپ دیں گے۔ ایک اور بات یاد رکھیں۔ 'نور' میں آپ کی لکھی کہانیاں بھی تو چھپ سکتی ہیں، اچھی اچھی مزیدار کہانیاں لکھ کر بھیجیے۔ اگر کچھ گڑبڑ ہوگی تو ہم ٹھیک کر لیں گے۔ کہانیاں لکھنا تو بہت آسان ہے، آپ کوشش تو کریں آپ کو جو کہانی پسند آئے وہی لکھ کر بھیج دیجیے۔ اس بار ہم آپ کے خطوں کا جواب بھی چھاپ رہے ہیں۔ آپ کو پڑھ کر بڑا مزہ آئے گا۔ اسی طرح بچوں کی آپ بیتی دیکھیے ایسی باتیں تو آپ بھی لکھ کر بھیج سکتے ہیں۔ جو بات آپ کو یاد ہو لکھ ڈالیے اور ہاں، دیکھیے تو اس بار کھیل کتنا اچھا ہے آپ اپنے ہاتھ سے بنانے کی کوشش کریں۔ ادھر ادھر گھومنے سے تو یہی اچھا ہے کہ آپ ایسے کاموں میں دل لگائیں۔ اچھے بچے وہی کام کرتے ہیں جس سے انھیں کچھ نہ کچھ فائدہ بھی پہنچے۔ انعامی سوال میں حصہ لینا نہ بھولیے گا۔ نور کے پہلے پرچے تو آپ کے پاس ہوں گے نہ ہوں تو ہم سے منگا لیجیے گا اور ہاں اب نور کے رسالے بہت سنبھال کر رکھیے گا کچھ دنوں بعد پھر ایسا ہی انعامی سوال چھپے گا۔ اس وقت آپ کے پاس نور کے سب رسالے ہونا چاہئیں۔ اچھے بچے اپنی سب چیزیں سنبھال کر رکھتے ہیں''

سیرت کے واقعات اور احادیث شامل کی گئی جو بچوں کی ذہنی سطح سے بالاتر نہ ہوں۔ صحابی وصحابیات اور بزرگان دین کے حالات کہانی کے انداز میں دلچسپ پیرائے میں لکھے گئے۔ نظمیں، حمد، نعت ترانے شامل کیے گئے۔ معلومات، سیر جنگل کے قصے، نوری محفل اور ریڈیو نورستان اور بچوں سے متعلق لطیفے اور مشغلے شامل کیے گئے۔ اور اس رسالے کا نام نور تجویز کیا گیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی روشنی ساری دنیا میں پھیل گئی اور رسالہ نور سے ہر گھر منور ہوتا چلا گیا اور اس طرح کامیابی کی سیڑھیاں چڑھتا ہوا اپنے عروج پر پہنچ گیا۔

نور نے اپنی عمر عزیز کے 65 برسوں میں کئی خاص نمبر شائع کیے۔ سالنامے ان کے علاوہ ہیں اور خاص نمبر بھی ایسے کہ ان کے سامنے دیگر رسائل کے خاص نمبر عام لگنے لگیں۔ ان خاص نمبروں کے موضوعات ہی ان کی انفرادیت کا پتا دیتے ہیں اور انھیں سے ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ نور کے مدیران اور ان کے معاونین کتنے تخلیقی اور زرخیز ذہنوں کے مالک تھے۔ چند منفرد موضوعات ملاحظہ ہوں۔ اجتماع نمبر، نور الانوار نمبر، دلچسپ کہانی نمبر، شکاریات نمبر، سچی کہانی نمبر، عید نمبر، نماز نمبر وغیرہ۔ اس کے ساتھ ساتھ ہر سال کی بہترین کہانیوں، مذہبی تحریروں، معلوماتی تحریروں نظموں وغیرہ پر اول، دوم اور سوم انعامات دیے گئے۔ نور میں شائع ہونے والی تحریروں کی زبان شائستہ، عام فہم اور معیاری ہوتی تھی۔ نور ہر ماہ نت نئی دلچسپیوں اور گراں قدر معلومات کو دلفریب انداز میں پیش کرنے والا رسالہ تھا۔ نور نے بہت کم وسائل کے ساتھ اپنا یہ سفر درخشاں جاری رکھا۔ شدید ضرورت اس بات کی ہے کہ سنجیدہ اور شائستہ سوچ رکھنے والے صنعتکار اور تجارتی اداروں کے مالکان اچھائی کو فروغ دینے والے جرائد کو باوقار انداز

میں مالی استحکام فراہم کریں۔ میرا یہ خیال ہے کہ اردو کے فروغ کے لیے اردو میں شائع ہونے والے بچوں کے اس منفرد رسالے کو بطور زریں مثال پیش کیا جانا چاہیے۔

گزشتہ 65 سالوں میں ماہنامہ نور نے بہت سے ارتقائی مراحل طے کیے ہیں۔ کتابت وطباعت رنگین ہوگئی اور یہ فوٹو آفسیٹ سے طبع ہونے لگا۔ نئے نئے کالمس میں بھی اضافہ ہوا اور دیگر دلچسپیوں میں بھی۔ اب اس میں انٹرویو، شکاریات سلسلے اور جاسوسی کہانیاں بھی جگہ پا گئیں۔ مائل خیرآبادی صاحب ادارے سے الگ ہو کر آزادانہ طور پر تحریری مشاغل میں لگ گئے۔ بہار کے ایک نوجوان 'محمود عالم' ادارے سے وابستہ ہوگئے جنھوں نے معاون مدیر کی ذمے داری سنبھالی لیکن وہ بھی جلد رخصت ہوگئے پھر سید مستفیض الحسن صاحب جو مرادباد کے مسلم انٹر کالج میں لیکچرار تھے، 1973 میں ادارے سے وابستہ ہوگئے۔

ذوق مطالعہ رکھنے والے بچوں کے لیے یہ رسالہ ہر سال ایسے انٹرویو بھی شامل کرتا جس میں بچوں کے لیے لکھاری سے ملاقات ان کے اپنے قاری سے کرائی جاتی تھی۔ بچے جن لوگوں کی کہانیاں، نظمیں اور مضامین پڑھتے ان سے اس طرح انٹرویو کے ذریعے مل کر خوشی اور مسرت ہی نہیں ایک اعزاز بھی محسوس کرتے۔

ماہنامہ 'نور' میں شائع ہونے والی تحریریں رنگا رنگ اور متنوع ہوتیں یہی وجہ ہے کہ یہ رسالہ مختلف عمروں اور متفرق ذوق رکھنے والے بچوں میں یکساں مقبول ہوا۔ تاریخی اور سائنسی کہانیوں سمیت ہر تعلیمی موضوع پر اثر انگیز کہانیاں اور ڈرامے شامل کیے جاتے۔ سائنسی تجربات اور فنی معلومات پر مضامین الگ سے دیے جاتے۔ دیگر مضامین میں قرآن وحدیث، سیرت النبی، سیرت صحابی، بزرگوں کے واقعات، اسلامی تاریخی عمارات جس میں عالم اسلام کی شاہکار مساجد سے متعلق معلومات بھی شامل کی جاتیں جو ماہنامہ نور کے خاص موضوعات ہیں۔

بچپن کی تربیت کے کئی عناصر ہیں ماں باپ، ماحول اور اسکول، اسکولی ماحول میں جہاں دوست شامل ہیں وہیں اس زمرے میں کتابوں (لٹریچر) اور دیگر میڈیا کو بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے گھرانوں میں والدین کا رویہ یہ ہے کہ جن کتابوں کا تعلق نصاب یا اسکول سے ہے وہی کتابیں خریدیں گے پر نصابی کتب سے ہٹ کر دیگر لٹریچر والدین کے نزدیک فضول خرچی ہے۔ اگر کوئی بچہ پڑھنے کا ذوق بھی رکھتا ہے تو والدین اس کی ہمت افزائی نہیں کرتے۔ مسلم بچوں کا معاملہ تو بہت تشویش ناک ہے۔ ہمارے بچوں کے ساتھ ایک اور مسئلہ یہ ہے کہ ان کی مادری زبان اکثر اردو ہوتی ہے اور انھیں روانی کے ساتھ کسی اور زبان میں مشق کرائی جا رہی ہے جس کی وجہ سے اردو کا تلفظ بہت غلط ہوتا جا رہا ہے۔ ماہنامہ نور نے بچوں کے تلفظ پر بھی بہت غور کیا اور بہت ہی آسان زبان میں اردو الفاظ کا استعمال کیا جس سے بچوں کو بہت اچھی اردو بولنا اور لکھنا آ گئی۔ یقیناً بچوں کا لٹریچر تیار کرنا آسان کام نہیں ہے۔ ہندوستان میں بچوں کے اسلامی لٹریچر کی کمی کی ایک اور بنیادی وجہ بچوں کے لٹریچر کو ترتیب دینے والوں کی عدم ہمت افزائی ہے۔ اگر کوئی بچوں کے لیے کوئی رسالہ نکالتا ہے تو اسے اس حد تک دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ خود اپنا سرمایہ لگا کر شائع کرنا ہوتا ہے۔ نہ تو کوئی اشاعتی ادارہ اسے رائلٹی دیتا ہے اور نہ ہی دیگر لوگ اس کی ہمت افزائی کرتے ہیں نتیجہ اداروں کو بند کرنے تک کی نوبت آ جاتی ہے۔ بچوں کے لٹریچر کی تیاری سرپرستی چاہتی ہے اردو زبان میں بچوں کے ادب پر بہت کم توجہ دی جا رہی ہے۔ مائل خیرآبادی اس میدان کے اہم ادیب رہے ہیں جنھوں نے اسلامی اقدار کو پیش نظر رکھتے ہوئے بچوں کے لیے کافی اہم ذخیرہ ادب تخلیق کیا۔ ماہنامہ نور میں بچوں کی نظموں کے علاوہ ان کے بہت اچھے اور دلچسپ ناول بھی شائع ہوتے تھے۔ مائل خیرآبادی کا نام ادبی حلقوں میں تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ نثر و نظم دونوں میں ہی مہارت رکھتے تھے۔ وہ ایک اچھے شاعر بھی تھے، انھوں نے بچوں کے لیے کئی نظمیں لکھیں جو بالخصوص ماہنامہ نور میں لگاتار شائع ہوتی تھیں۔ ان کی سبھی نظمیں اخلاقی، مذہبی اور اصلاحی ہیں۔

مائل خیرآبادی اپنی نظموں کے ذریعے اللہ کی حمد وثنا بیان کرتے ہیں جس سے بچوں میں اللہ کی قدرت کو پہچاننے اور اس کا شکر ادا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ ان کی نظم کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

اے خدا اے خدا شکر و احساں تیرا
ہم کو پیدا کیا اور کھانا دیا
اے خدا اے خدا شکر واحساں تیرا
سارا عالم بنایا ہمارے لیے
اور اس کو سجایا ہمارے لیے
اے خدا اے خدا شکر و احساں تیرا
تونے بھیجا نبی جس سے قرآں ملا
اچھی باتیں ملیں دین و ایماں ملا
اے خدا اے خدا شکر و احساں تیرا
سب برائی بھلائی بتا دی ہمیں
دین کی راہ سیدھی دکھا دی ہمیں
اے خدا اے خدا شکر و احساں تیرا
ہے یہ میری دعا میرے اللہ میاں
راہ سیدھی چلا میرے اللہ میاں
اے خدا اے خدا شکر و احساں تیرا

مائل خیرآبادی نے اسی طرح کی اپنی بہت سی نظمیں تخلیق کیں جس کے ذریعے سے بچوں کی ذہنی اصلاح کی جا سکے۔ یوں تو آپ نے اردو ادب سے متعلق نثری کتابیں بھی لکھیں ہیں لیکن آپ کی شہرت بچوں کے شاعر کی حیثیت سے زیادہ ہے۔

اس طرح دیگر بہت سے شاعر اور ادیب ماہنامہ نور میں اپنے اپنے فن کے جوہر دکھاتے چلے گئے جن میں سے کچھ کے نام درج ذیل ہیں۔

بچوں کے شاعر: مولانا ابوالمجاہد زاہد، مرتضی ساحل تسلیمی، خلیل محمودی، سحر رامپوری، مجاہد لکھیم پوری، خالد فوزان

بچوں کے ادیب: مولانا ابوسلیم محمد عبدالحیٔ، ڈاکٹر ابن فرید، وصی اقبال، ایس فضیلت، مرتضی ساحل تسلیمی، سعید فرحت، تبسم نشاط، ڈاکٹر محمد اطہر مسعود، زبیر گستاخ، سعید ریاض وغیرہ ہیں۔

نور کا ہر کالم اپنی دلچسپی کے لحاظ سے اپنا ایک الگ ہی مقام رکھتا تھا۔ نور میں ایک کالم 'قلمی دوستی' کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ قلمی دوستی کے اس مشغلے کے بنیادی مقاصد ہی مختلف ممالک میں دوست بنانا مختلف ممالک کے رہن سہن کی معلومات لینی تھی۔ اسی طرح سے ایک نہایت دلچسپ ومعلوماتی کالم 'ریڈیو نورستان' تھا جس میں بچوں کی نظمیں وغیرہ نشر کی جاتی تھیں۔ ریڈیو نورستان کی نشر کی ہوئی نظمیں 'ادارہ الحسنات' نے کتابی شکل میں طبع کیں۔

بچے ہر ملک اور ہر قوم کا وہ خوشنما، دیدہ زیب اور معطر پھول ہوتے ہیں جن کی خوشبو کسی بھی قوم کا وہ گلدستہ بنتا ہے جو آنے والی تاریخ میں اس قوم کا اصل چہرہ تمام خدو خال کے ساتھ سلامت رکھتا ہے۔ بچوں کے اس رسالے نور نے اس پھول کو ایک گلدستہ بنا کر پیش کیا اور فضا کو اپنی خوشبو سے معطر کر دیا۔

غرض یہ کہ بچوں کے ادب کے لیے ہر صدی میں لکھا جاتا رہا ہے اور اس کے فروغ کے لیے رسالہ نور نے اپنی بے لوث خدمات پیش کی ہیں ان کو تا قیامت یاد کیا جاتا رہے گا۔ مختصر ہم کہہ سکتے ہیں بچوں میں مثبت اور معیاری مطالعے کا اعلیٰ ذوق پیدا کرنے اور اسے فروغ دینے اور مطالعے کے شوق کو پروان چڑھانے میں ماہنامہ نور نے گزشتہ 65 برسوں میں نہایت ہی اہم کردار ادا کیا ہے جسے فراموش نہیں کیا سکتا ہے۔

■

Sadia Saleem
Research Scholar
Osmania University Main Rd, Amberpet,
Hyderabad-500007 (Telengana)

شاہد جمال

ادب اطفال اور بچوں کی نفسیات

ادب اطفال پر گفتگو کرنے سے قبل ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ ادب اطفال ہے کیا؟ کسی تحریر کی کون سی خصوصیت اسے ادب اطفال کے زمرے میں لاتی ہے۔ یوں تو ادب اطفال کی تعریف مختلف اہل علم نے اپنے اپنے طور پر کی ہے۔ اختلاف کے باوجود ان تعریفوں میں ایک بات مشترک ہے کہ ادب اطفال کو بچوں کے مزاج اور خواہشات کے مطابق ہونا چاہیے۔ ادب اطفال میں کم از کم اتنی تو خوبی ہونی چاہیے کہ وہ بچوں کے تحیر و اشتیاق اور استعجاب کو تسکین پہنچا سکے۔ اکبر رحمانی ادب اطفال کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"وہ ادب جس کے ذریعے بچوں کی دلچسپی و شوق کی تسکین ہو اور جو مختلف عمر کے بچوں کی نفسیات و ضرورتوں، دلچسپیوں، میلانات اور ان کی فہم و ادراک کی قوت کو پیش نظر رکھ کر تخلیق کیا گیا ہو، صحیح معنوں میں 'بچوں کا ادب' کہلانے کا مستحق ہے۔

(اردو میں بچوں کا ادب: ایک تنقیدی جائزہ، مشمولہ اردو میں ادب اطفال کا ذخیرہ، مرتب اکبر رحمانی، ایجوکیشنل اکادمی جل گاؤں، 1991، ص 68)

بچوں کا ادب تخلیق کرنے کے لیے موضوعاتی و نفسیاتی امور بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ بچوں کے ادب میں بچوں کی نفسیات و فطرت کا خیال رکھنا بے حد ضروری ہے اور سب سے اہم یہ کہ اسے بچوں کے لیے ہی لکھا جائے۔ چونکہ بچے بھی بڑوں کی طرح اپنی پسند ناپسند رکھتے ہیں لہٰذا اس میں ایسے موضوعات رکھنے چاہئیں جو ان کی ذہنی آسودگی اور نشو و نما میں معاون ثابت ہوں۔

بچوں کی نفسیات ایک منفرد زاویہ رکھتی ہے۔ یہ نفسیات کچھ معاملات میں تمام بچوں میں فطری طور پر ہی ودیعت ہوتی ہے۔ عنفوان شباب کو پہنچتے نیز اس عمر کے بچوں کی نفسیات کی تشکیل میں یہی فطری نفسیات کارفرما ہوتی ہے۔ دنیا کے تمام نوزائیدہ بچوں کے نفسیاتی ابعاد مختلف ماحول کی بدولت ہی مختلف ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر واٹسن نے نوزائیدہ بچوں کے جبلی و جذباتی نظام کی تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ:

"بچے میں خوف، غصہ اور محبت کے تین واضح جذبات ہوتے ہیں۔ ابتدا میں ننھا بچہ اونچی آواز سے اور سہارا کھونے سے خوف محسوس کرتا ہے۔ بچے کے کھیل میں مداخلت کی جائے تو اسے غصہ آجاتا ہے۔ تھپکی دینے یا گدگدانے سے بچے میں جنسی تحریک ہوتی ہے۔ بچے کے یہ تین جذبات پیدائش کے فوراً بعد معرض وجود میں آجاتے ہیں۔ آئندہ بالغ زندگی کی گوناگوں پیچیدگیوں کی عمارت انھی تین بنیادی جذبات پر تعمیر ہوتی ہے۔

(بحوالہ بچوں کی نفسیات از ڈاکٹر عبدالروف، ورلڈ اسلامک پبلی کیشنز، دہلی 1982، ص 12,13)

واٹسن بچوں کی نفسیاتی تعمیر میں ماحول کو بنیادی اہمیت دیتا ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ بچوں کے اکثر خوف ماحول و ذاتی تجربات کے زائیدہ ہوتے ہیں۔ اس نے ایک ننھے بچے پر تجربہ کر کے یہ ثابت کیا کہ تربیت اور ماحول سے اکثر بچوں میں خوف پیدا بھی کیے جا سکتے ہیں اور مٹائے بھی جا سکتے ہیں۔ ایک بچہ جس نے سانپ کبھی نہیں دیکھا تھا، ڈاکٹر واٹسن نے اپنی نفسیاتی تجربہ گاہ میں جب اس بچے کے آگے ایک بڑا بے ضرر سانپ ڈالا تو وہ بچہ اس سے خوف کھانے کے بجائے کھیلنے لگا تھا۔ لیکن کچھ دن بعد اس تجربہ گاہ میں ایک خوفناک آواز نکالنے والا آلہ نصب کر دیا گیا۔ جونہی وہ بچہ اس سانپ کو چھوتا آلہ بجنے لگتا۔ سانپ کو چھونے پر خوفناک آواز نکلنے کی وجہ سے اس بار بچہ سانپ سے خوف کھانے لگا۔ (ایضاً، ص 29)

جہاں تک بچوں کی نفسیات کی بات ہے تو ماحول کے ساتھ ساتھ کسی ملک اور قوم کی تہذیب و ثقافت اور رسوم و رواج بھی بچوں کی نفسیات کی تعمیر و تشکیل میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ برصغیر ہندو پاک کے بچوں کا موازنہ اگر مغربی ممالک کے بچوں سے کیا جائے گا تو آپ واضح فرق محسوس کریں گے۔ ہمارے یہاں بچوں کے دل میں بچپن سے ہی خوف سمو دیا جاتا ہے۔ رات گئے اگر بچے نہیں سوتے تو پھر انہیں کسی نہ کسی جانور یا خیالی بھوت کے ڈر سے خاموش کرا دیا جاتا ہے۔ مثلاً سو جاؤ ورنہ کتا آجائے گا یا بلی آجائے گی۔ اور سب سے بڑھ کر اندھیرے کا خوف ان کے دل میں کم عمری سے ہی گھر کر لیتا ہے۔ جب کہ اس کے برعکس مغربی ممالک کے بچوں کو سال بھر کے بعد اکیلے سونے کی عادت ڈال دی جاتی ہے۔ علاوہ ازیں سونے سے پہلے کہانی سنانا اور بچے کو گلے لگا کر بوسہ دینا بھی ان کے دل میں محبت اور انس کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ بظاہر یہ ایک چھوٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن ایک بچے کے ذہن و دل پر اس حرکت کا بہت گہرا اثر پڑتا ہے۔ بے شک ہر والدین کو اپنے بچے سے بے حد محبت ہوتی ہے لیکن بچے اس محبت کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور انہیں وقتاً فوقتاً اس کا احساس کرانے کے لیے

اظہار کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب آپ بچے کو گلے لگاتے ہیں تو اسے تحفظ کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ احساس تحفظ اس احساس تحفظ سے قطعاً مختلف ہے جو اسے والدین کے درمیان سونے سے فراہم ہوتا ہے۔ آخر الذکر سے وہ رفتہ رفتہ ڈرپوک اور بزدل بننے لگتا ہے۔ جبکہ اول الذکر سے اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق گلے لگانا ایک بچے کی جسمانی و دماغی صحت کی بہتری کے لیے سب سے اہم ذریعہ ہے۔ گلے لگانا بچے کی جذباتی صحت کے لیے بھی بے حد ضروری ہے۔

بچے کی شخصیت کی مناسب نشوونما کے لیے کھیل بہت ضروری ہے۔ بچوں کے لیے ان کے کھلونے محض توڑنے پھوڑنے کی بے جان اشیا نہیں ہوتے بلکہ یہ ان کی شخصیت کی نشاندہی کا ایک ننھا وخوبصورت ذریعہ بھی ہیں۔ بچوں کو کھلونوں سے کھیلتے دیکھ کر ان کی عادات و خصائل سے متعلق پیش گوئی کرنا آسان ہو جاتا ہے۔ وہ بچے جو اپنے کھلونے سنبھال کر رکھتے ہیں اور کسی کو ہاتھ لگانے نہیں دیتے ان میں ملکیت کا رجحان بہت قوی ہوتا ہے۔ کھلونوں کو توڑ کر دوبارہ جوڑنے والے بچوں میں تجسس کا مادہ زیادہ ہوتا ہے ساتھ ہی وہ ٹیکنیکل ذہن کے حامل ہو سکتے ہیں۔ غصے و ناپسندیدگی کے عالم میں کھلونے توڑنے والے بچے اس سے مبرا ہیں۔ گڑیا سے بچیوں کی انسیت کسی سے پوشیدہ نہیں۔ گڑیا سے بچیوں کی محبت ان کی مادرانہ جبلت کی غماز ہے۔ عصر حاضر میں ایسے سائنسی کھلونے بنائے جا رہے ہیں کہ بچہ کھیل کھیل میں سائنس کی بہت سی ایجادات سے بھی متعارف ہو جاتا ہے۔ یہ کھلونے یونہی نہیں تیار کیے جاتے بلکہ بچوں کی عمر اور ان کی نفسیات کو پیش نظر رکھ کر ہی کھلونے تیار کیے جاتے ہیں۔ اس کے متعلق سلیم اختر لکھتے ہیں:

''امریکہ میں کھلونے بنانے والی بڑی بڑی کمپنیوں نے نفسیات دانوں کو مشیر رکھا ہوتا ہے جو بچوں کے نفسیاتی رجحانات کے مطابق کھلونے بنانے میں مشورے دیتے ہیں۔

(ہماری جنسی اور جذباتی زندگی، سلیم اختر، فرید بک ڈپو نئی دہلی، ص 75)

ہر جگہ کا ادب اطفال اپنے کلچر اور ثقافت کی بنیادوں پر ہی لکھا جاتا ہے۔ ہندوستان پاکستان کی بیشتر کہانیوں میں کسی بزرگ، سادھو، دیوی دیوتا، پری، جن اور دیو کا تذکرہ ضرور ملتا ہے جو مصیبت میں مدد کرنے کے لیے نمودار ہوتا ہے۔ جبکہ امریکہ اور یوروپین ممالک میں یہ کام santa caluse یا fairy Godmother کے ذریعے انجام دیا جاتا ہے۔ جاپان کی لوک کہانیوں میں kitsune نامی عقلمند لومڑی کا تذکرہ ملتا ہے جس کی نو دم ہوتی ہے۔ کٹ سونے کے پاس انسانی روپ میں تبدیل ہونے اور جادو وغیرہ کرنے کی صلاحیتیں ہوتی ہیں۔ جب کہ چینی کہانیوں میں سانپ مینڈک اور ڈریگن کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ مینڈک چین میں دولت کی علامت ہوتا ہے۔ افریقی کہانیوں میں اانسی Anansi نامی مکڑی کا ذکر ہے جو عقلمند، بے وقوف، کاہل اور دلچسپ کسی بھی شکل میں ہو سکتی ہے لیکن اس سے ہمیشہ کوئی نہ کوئی سبق ضرور ملتا ہے۔ اس کے علاوہ بندر ہاتھی زراف اور مگرمچھ وغیرہ کا ذکر بھی بار بار آتا ہے۔ اس تفصیل سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بچے کو اپنے کلچر تہذیب اور تاریخ سے واقف کروانے کے لیے کہانی سے بہتر دوسری صورت نہیں ہوتی۔ ایک ادیب بھی جب بچے کے لیے ادب تخلیق کرتا ہے تو اپنے کلچر سے متاثر ہو کے کرتا ہے۔

بچوں کی کہانی لکھنا یا ان کے لیے ادب کی دوسری اصناف میں کچھ تحریر کرنا بظاہر آسان معلوم ہوتا ہے۔ لگتا ہے کہ صاحب گڈے گڑیا کا کھیل یا راجا رانی کی کہانی ہی تو ہے لیکن جب آپ بچوں کا ادب لکھنے کی کوشش کریں گے تو معلوم ہوگا کہ یہ مشکل ترین صنف ہے۔ یہ ایک تعمیری اور مقصدی ادب ہے۔ مصنف کو اس بات کا خیال رکھنا ہوتا ہے کہ بچہ اس کہانی یا نظم سے کوئی غلط پیغام اخذ نہ کر سکے یا بے راہ روی کا شکار نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی یہ کوشش بھی کرنی ہوتی ہے کہ کہانی میں ناصحانہ انداز حاوی نہ ہونے پائے کیونکہ نصیحت کے لیے انھیں والدین یا اساتذہ ہی کافی ہوتے ہیں اور یہ انسانی نفسیات میں شامل ہے کہ براہ راست نصیحت، خشک باتیں اور وعظ قاری یا سامع میں اکتاہٹ کا عنصر پیدا کرتے ہیں۔ کتاب میں وہ کوئی نئی اور دلچسپ چیز تلاش کرتے ہیں۔ کوئی نئی تفریح، نئی دلچسپی، نیا ایڈونچر، نیا تخیل یا نئی فنتاسی۔ کتاب میں وہ تمام اجزا ہونے چاہئیں جو ایک بچے کے تجسس واشتیاق کو تسکین دے سکیں۔ انھیں یہ باور کرانا ہوتا ہے کہ یہ کتاب صرف انھیں کے لیے لکھی گئی ہے۔

لہٰذا ادب اطفال کی تخلیق ایسی ہو جو بچے سے باہم ربط پیدا کر سکے اور بچہ خود کو اس کہانی یا نظم سے جوڑ کر دیکھ سکے۔ ساتھ ہی یہ بچوں کو مسرت بخشنے کے ساتھ ان میں تخیل کی صلاحیت کو بیدار کرے۔ ان کے جوش و جذبے اور ان کے حوصلوں کو پروان چڑھائے۔ واضح ہو کہ فنتاسی اور تخیل دونوں میں فرق ہے۔ فنتاسی سے مراد وہ ذہنی قوت ہے جو ایسی تصاویر یا خیال کو ذہن میں پیدا کرے جو حقیقی دنیا میں تقریباً ناممکن سی ہوں۔ بچوں کی قوت متخیلہ بڑی طاقتور ہوتی ہے اور یہ ان کی ذہنی نشوونما میں اہم

جب آپ بچے کو گلے لگاتے ہیں تو اسے تحفظ کا احساس ہوتا ہے لیکن یہ احساس تحفظ اس احساس تحفظ سے قطعاً مختلف ہے جو اسے والدین کے درمیان سونے سے فراہم ہوتا ہے۔ آخر الذکر سے وہ رفتہ رفتہ ڈرپوک اور بزدل بننے لگتا ہے۔ جبکہ اول الذکر سے اس کے اعتماد میں اضافہ ہوتا ہے۔ ماہرین نفسیات کے مطابق گلے لگانا ایک بچے کی جسمانی و دماغی صحت کی بہتری کے لیے سب سے اہم ذریعہ ہے۔ گلے لگانا بچے کی جذباتی صحت کے لیے بھی بے حد ضروری ہے۔

رول ادا کرتی ہے۔ یہ خصوصیت بچوں میں فطری طور سے پائی جاتی ہے۔ یہ فنتاسی کی عادت ادب سے زیادہ نفسیات سے تعلق رکھتی ہے۔ تخیل اور فنتاسی کی اس صلاحیت کو جس ادب اطفال کے ذریعے پرواز کرنے کا موقع ملے وہ اس ادب کی کامیابی کی دلیل ہے کیونکہ یہ صلاحیت بذات خود ایک اچھی ادبی تخلیق میں مدد فراہم کرتی ہے۔ عالمی پیمانے پر مشہور نارنیا سیریز کے مصنف C.S.Lewis نارنیا کی پہلی کتاب The Lion, the witch and the wardrobe کے حوالے سے بتاتے ہیں کہ ''یہ ساری کہانی ایک ہرن کی تصویر سے شروع ہوئی جو چھتری اور کچھ ڈبے لے کر ایک برف سے ڈھکی ہوئی لکڑی پر کھڑا تھا۔''

(Fantasy Literature for Children and Young adults by Pamlea S Gates. The Scarecrow press. 2003.P.3.)

یہ تصویر سولہ برس کی عمر سے اس کے پاس تھی اور وہ تب سے اسے لے کر متجسس تھا اور پھر اسی تصویر کو لے کر اس نے ایک کہانی لکھنا شروع کی جس نے بالآخر ایک داستان کی شکل اختیار کر لی۔ اس ایک تصویر نے اس سولہ سالہ لڑکے کے تخیل کو ایسے ایسے رنگ عطا کیے کہ آنے والے برسوں میں نارنیا سیریز نے دنیا بھر میں ریکارڈ قائم کر دیے۔

ماہرین نفسیات نے بچوں کی عمر کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک ولادت سے چھ برس تک کی عمر اور پھر چھ سے چودہ برس تک کی عمر۔ لیکن یہ دونوں حصے بچپن کے زمرے میں ہی آتے ہیں۔ اس عمر کے بچوں کو شوخ رنگ بھاتے ہیں۔ اس کے علاوہ دیدہ زیب تصاویر میں بھی وہ دلچسپی لیتے ہیں، لہٰذا بچوں کا لٹریچر تیار کرتے ہوئے موجودہ دور میں کارٹون، فوٹوگرافی اور گرافکس وغیرہ کا استعمال ان کے لیے کشش کا باعث ہو سکتا ہے۔ کہانی کے

ساتھ تصاویر اور رنگ ایسے دلکش ہوں کہ بچہ ٹی وی اور موبائل کے بجائے ان رنگین کتابوں کی دنیا میں کھو جائے۔ زبان نہایت آسان اور الفاظ کی تعداد کم ہونی چاہیے۔ معروف ادیب ڈاکٹر خوشحال زیدی لکھتے ہیں:

''مصنفین کے سامنے مسئلہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے لیے کیا لکھیں؟ مختلف عمروں کے بچوں کے لیے لکھنا ہو تو مزید مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، جس میں سب سے بڑا پریشان کن مرحلہ زبان کا ہے۔ یہ ملحوظ رکھنا لازمی ہے کہ بچہ کس عمر میں کتنی زبان جانتا ہے۔ بچوں کا ادیب فطرت انسانی، مناظر قدرت اور بچوں کی نفسیات کے بارے میں مکمل معلومات رکھتا ہو۔''

(بچوں کا ادب ضروریات اور مسائل، مشمولہ اردو ادب اطفال کے معمار، ڈاکٹر خوشحال زیدی، نہرو چلڈرن اکیڈمی، دہلی، ص 25)

چودہ سال کے بعد بچے بلوغت کی سرحدوں کو پہنچ جاتے ہیں اور ان کی پسند اور ترجیحات بدلنے لگتی ہیں۔ انگریزی اور دوسری مغربی زبانوں میں تو ان نوعمروں کے لیے خصوصی طور پر Young Adult Literature تیار کیا جاتا ہے اور یہ باقاعدہ ایک صنف شمار کی جاتی ہے۔ اس میں تیرہ برس سے زائد عمر کے بچوں کے ذوق کی کتب موجود ہوتی ہیں۔ ان میں موضوعات کا تنوع ہوتا ہے۔ ان کہانیوں میں پلاٹ، کردار، منظر نگاری، مکالمہ نگاری جیسے تمام اجزائے ترکیبی پائے جاتے ہیں۔ انگریزی میں Harry Potter اور Narnia اس کی عمدہ مثال ہیں جبکہ اردو میں کرشن چندر کا ناول ستاروں کی سیر اور الٹا درخت، عصمت چغتائی کا تین اناڑی، سراج انور کا خوفناک جزیرہ، اطہر پرویز کا مشینی گھوڑا، مناظر عاشق ہرگانوی کا گدھے کے بچے، وکیل نجیب کی کامکس خوفناک حویلی، ناولٹ بے زبان ساتھی اور ناول مہربان جن سرفہرست ہیں۔

اردو میں ادب اطفال کی ابتدا ناصر خسرو کی خالق باری سے مانی جاتی ہے جو کہ پچھلے وقتوں کے نصاب میں شامل رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس میں بچوں کے ادب کی خصوصیت کم ہی نظر آتی ہے، میر تقی میر نے بھی بچوں کے لیے موہنی بلی، گھر کا حال اور بکری اور کتے مثنویاں لکھیں۔ بچوں کے لیے پہلی بار باضابطہ طور پر نظیر اکبر آبادی نے لکھا۔ تل کے لڈو، ہرن کا بچہ، تربوز، گلہری کا بچہ، کنکوے اور پتنگ اور معصوم بھولے بھالے وغیرہ ان کی نظمیں بچوں میں بے حد مقبول ہیں۔ اسماعیل میرٹھی تو بچوں کے شاعر ہی کے طور پر مشہور ہوئے ہیں۔ انھوں نے بچوں کی نصابی کتب بھی تصنیف کیں۔ اس کے علاوہ غالب، حالی، شبلی، چکبست، اکبر الہ آبادی، علامہ اقبال، حفیظ جالندھری اور اختر شیرانی وغیرہ نے بھی بچوں کے لیے بہترین نظمیں لکھیں۔ جب کہ محمد حسین آزاد، نذیر احمد، ذکاء اللہ، پریم چند، خواجہ حسن نظامی، عظیم بیگ چغتائی، امتیاز علی تاج، عابد حسین، محمد مجیب، مرزا ادیب، صالحہ عابد حسین اور قرۃ العین حیدر وغیرہ نے بھی مضمون، ناول، ڈرامے اور کہانیاں لکھ کر ادب اطفال کے ذخیرے میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔

بچوں کی نفسیات کو مد نظر رکھتے ہوئے رضیہ بٹ کے ناول مسرتوں کا شہر کا ذکر برمحل ہوگا۔ یہ ادب اطفال کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہے لیکن اسے وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کا یہ حقدار تھا۔ اس ناول میں رضیہ بٹ نے زندگی کے مختلف جذبات اور عادات کو کرداروں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ ناول کا آغاز ایک بستی سے ہوتا ہے جہاں کے رہنے والے گناہوں میں ڈوبے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے ان کی بستی کی رونقیں ماند پڑ چکی ہوتی ہیں۔ ناول میں چند بچوں کا گروہ ہوتا ہے جو بے حد شرارتی اور بدتمیز ہیں۔ انھیں چھوٹے بڑے کا کوئی لحاظ نہیں اور وہ بستی کے ہر شخص کا جینا حرام کیے ہوتے ہیں۔ بستی کا ہر فرد ان بچوں سے تنگ ہوتا ہے۔ ایک دن ان کی ملاقات ایک بزرگ سے ہوتی ہے جو انھیں بتاتے ہیں کہ ان لوگوں کے گناہوں کی وجہ سے ان کے ذہن آلودہ ہیں۔ بچے بزرگ کا مذاق اڑاتے ہیں اور ضد کرتے ہیں کہ اگر واقعی ایسی ہی بات ہے تو ان کے گناہ ظاہر کر کے دکھائیں۔ بزرگ انھیں آگاہ کرتے ہیں لیکن بچے باز نہیں آتے۔ آخر اس ضد کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ بچوں کے گناہ ان کی پیٹھ پر کوبڑ کی صورت ظاہر کر دیے جاتے ہیں۔ بچے بے حد خوفزدہ اور شرمندہ ہوتے ہیں اور اس سے نجات کی صورت دریافت کرتے ہیں جس پر بزرگ کہتے ہیں کہ اس کا علاج صرف اس بزرگ کے شہر میں ملے گا جو کہ پہاڑ کے اس پار ہے۔ خیر بچے سفر شروع کرتے ہیں اور پھر ان کی اصل دشواریوں کا آغازہ ہوتا ہے۔ راہ میں انھیں رحمدلی، غفلت، شک، طمع لالچ، خوف، بہادری، دوستی، مہربانی، ظلم، کاہلی، سستی، غصہ، نفرت، تلخی، امن، محبت، ہمدردی، بردباری، سکون، سنجیدگی، شور، لڑائی، دھوکا، فریب، مدد، خوشامد، چوری، مہمانداری جیسے جذبات اور خصلتیں انسانی شکلوں میں ملتے ہیں۔ رضیہ بٹ نے اس ناول کے ذریعے بچوں کو بری خصلتوں سے دور رہنے اور اچھی عادتوں کو اپنانے کی ایک بہترین کوشش کی ہے۔ ادب اطفال میں تمثیل کی اس سے بہترین مثال کوئی اور نہیں مل سکتی۔

یہ سچ ہے کہ اردو زبان ادب اطفال سے مالامال ہے، بچوں کے ادب میں سائنسی پہلو بھی ہے، تفریحی بھی اور اصلاحی بھی، لیکن اس کے باوجود آج بچوں کے ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی بلکہ اس سے بے اعتنائی برتی جا رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نئی نسل کے بیشتر بچے اپنی زبان و ادب سے ناواقف ہیں۔ نئی نسل کی شخصیت کی تعمیر اور ذہنی بالیدگی کے لیے بچوں کے ادب کا معیاری ہونا بے حد ضروری ہے۔ ڈاکٹر اطہر پرویز سے ایک پروفیسر نے کہا کہ ''تم بچوں کے لیے کیوں لکھتے ہو؟ یہ بھی کوئی لکھنا ہے، اچھے تحقیقی و ادبی مقالے لکھو، کوئی تعمیری کام کرو''۔ اسی طرح محترمہ ناصرہ شرما نے ایک واقعہ بیان کیا کہ کسی قاری نے ان کی کہانی پڑھ کر خط لکھا کہ آپ سنجیدہ ادب کے ساتھ بچوں کی کہانیاں بھی لکھتی ہیں؟ مجھے تعجب ہو رہا ہے۔ مجھے آپ جیسی ذہین عورت سے ایسی امید نہیں تھی کہ وہ پری کی کہانی لکھنے بیٹھ جائے گی۔

(بچوں کے ادب کی تاریخ۔ سید اسرار الحق سبیلی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی 2016، ص 58)

اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اردو کے بڑے مصنفین، پروفیسرز اور قارئین کے نزدیک بچوں کے لیے لکھنا کس قدر غیر تعمیری و غیر سنجیدہ ہے۔ جب کہ آج کا بچہ کل کا ادیب، ڈاکٹر و انجینئر ہے تو آج ان کے لیے لکھا گیا ادب سنجیدہ و تعمیری کام کیوں نہیں ہے۔ ادبی حلقوں میں جب تک یہ رجحان ختم نہیں ہوگا بچوں کے لیے معیاری ادب تخلیق نہیں ہو سکتا۔ اس کے ساتھ ہی اردو زبان میں بچوں کے لیے معیاری ادب تخلیق کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم دوسری زبانوں میں ادب اطفال کے ساتھ ہو رہے تجربات سے استفادہ کریں اور نئے خیالات اور رجحانات کے ساتھ تکنیک کے تجربوں کو بھی فروغ دیں۔

■

Shahid Jamal
Room No: 202, Ext. Brahmaputra Hostel, JNU
New Delhi - 110067
Mobile No. 9250194396
Email Add. shahidsallu76@gmail.com

یہ سچ ھے کہ اردو زبان ادب اطفال سے مالامال ھے .بچوں کے ادب میں سائنسی پہلو بھی ھے .تفریحی بھی اور اصلاحی بھی. لیکن اس کے بلوجود آج بچوں کے ادب پر خاطر خواہ توجہ نہیں دی جارھی بلکہ اس سے بے اعتنائی برتی جارھی ھے .یہی وجہ ھے کہ نئی نسل کے بیشتر بچے اپنی زبان و ادب سے ناواقف ھیں۔

تمنا مظفر پوری

نشاط اختر

تمنا مظفر پوری ہماری ادبی دنیا کے ایسے مایہ ناز فن کاروں میں سے ہیں جن کے سوانحی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شمالی بہار سے وطنی تعلق رکھنے والے اس فن کار نے تقریباً نصف صدی تک نہایت کامیاب ادبی زندگی گزار کر داعیِ اجل کو لبیک کہا۔

تمنا مظفر پوری کا اصل نام اسرار احمد ہے۔ وہ ایک صوفی خانوادے سے تعلق رکھتے تھے۔ بعد کے زمانے میں ان کے دادا نے وکالت کا پیشہ اختیار کیا اور ان کے گھرانے میں عصری انگریزی تعلیم کا رواج ہوا۔ تمنا مظفر پوری کی ولادت 17 نومبر 1943 کو محمد پور مبارک ضلع مظفر پور میں ہوئی۔ ان کے والد سید محمد احرار عمر دراز اپنے وقت کے کامیاب شاعر گزرے ہیں۔ تمنا مظفر پوری نے بی اے تک تعلیم حاصل کر کے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ ان کی ادبی زندگی کا آغاز 1960 کے آس پاس سے ہوتا ہے۔ وہ تمام عمر اپنے ذوق وشوق سے لکھتے پڑھتے رہے۔ وہ دیگر ادبی خدمات کے علاوہ ترجمہ نگاری میں خاص مہارت رکھتے تھے اور انھیں اردو اور ہندی صحافت سے بھی عملاً دلچسپی تھی۔ انھوں نے اپنی کئی کتابوں پر ادبی انعام بھی پایا۔ جناب تمنا مظفر پوری نے 4 مئی 2013 کو وفات پائی اور سمن پورہ قبرستان، پٹنہ میں آسودہ خاک ہوئے۔

تمنا مظفر پوری نے جب بھی لکھا، معاشرے کی نفسیات اور زمانے کے معاملات ومسائل کو سامنے رکھتے ہوئے گہرے تجزیاتی شعور اور انتہائی دلسوزی کے ساتھ لکھا اور ان موضوعات کا انتخاب کیا جو ہمارے سماج میں اپنے مہلک جراثیم پھیلا رہے ہیں۔ غلط نہیں کہا گیا ہے کہ باتوں ہی باتوں میں خیالوں کی خوش خرامی کے جلوے دکھا جانا ان کی تحریر کا ایک ایسا پہلو ہے جو اسے دلچسپ بھی بناتا ہے اور موثر بھی۔ تمنا مظفر پوری کی تحریریں گہرے فلسفیانہ موضوعات ومباحث سے عموماً کوئی تعلق نہیں رکھتیں اور نہ ہی علمی فضیلت فروشی سے ان کا کوئی واسطہ ہوتا ہے۔ وہ الجھی ہوئی بات کو پیچیدہ ہوئی بات کے رنگ روپ دے کر سامنے نہیں لاتے بلکہ روزمرہ کی زندگی اور ان سے وابستہ تجربات ومشاہدات کے ہلکے پھلکے اور بظاہر بالکل بے ضرر اور غیر اہم دکھائی دینے والے پہلوؤں کو موضوعِ تحریر بناتے ہیں اور باتوں ہی باتوں میں متوسط طبقے کی الجھنوں اور اس کے لیے سوالیہ نشان بننے والی کیفیتوں سے متعلق بہت کچھ کہہ جاتے ہیں۔ ان کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ پہلے پڑھنے والوں کو ہنسی آتی ہے اور جب بات کا نشانہ سمجھ میں آتا ہے تو کچھ کہتے نہیں بنتی بلکہ سر ندامت سے جھک جاتا ہے اور لباسِ نو میں ملبوس ہونے کا دعویٰ کرنے والے خود کو اچانک اس حال میں محسوس کرنے لگتے ہیں جہاں درخت کے پتوں کی تلاش ہوتی ہے اور وہ بھی تا دیر میسر نہیں آتے۔

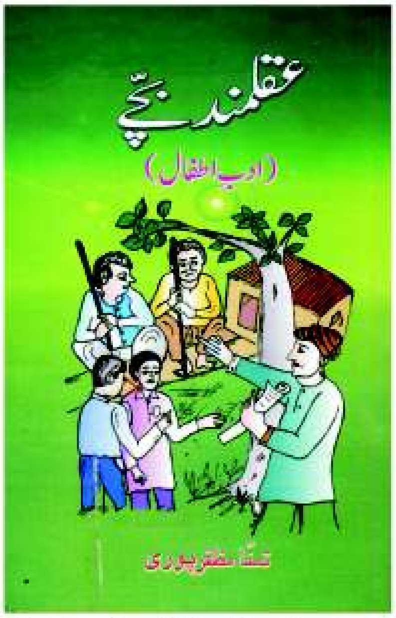

تمنا مظفر پوری کے یہاں مشاہدے کی گہرائی، رنگا رنگی اور فن کی پاکیزگی و لطافت دیدنی ہوتی ہے۔ گہری بصیرت، برجستہ ظرافت، زندگی اور فن کے خوشگوار امتزاج اور دیگر خوبیوں کی ان کے یہاں کوئی کمی نہیں۔ ان کی تحریروں میں تازگی وشگفتگی کے نمایاں عناصر ملتے ہیں اور بالکل غیر منطقی انداز ترتیب کے ساتھ خیالات کی پیش کش ہوتی چلی جاتی ہے۔ ان کی متعدد ایسی تحریریں دیکھی جا سکتی ہیں، جن میں فکر وفن کی مختلف جہات کے ساتھ، انشائیہ نویسی اور برجستہ طنز ومزاح کی نہایت وسیع دنیا آباد ہے۔ تمنا مظفر پوری نے نہ صرف یہ کہ بہت سارے سلگتے ہوئے موضوعات پر قلم اٹھایا ہے اور حسب حال طرز اسلوب سے طنز ومزاح پیدا کیا ہے بلکہ ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے نئے تجربات سے کام لینے پر مسلسل توجہ رکھی ہے۔ وہ مختلف ہیئت ونوعیت سے غذا لے کر اپنی تحریر میں ندرت لانے کے خواہاں معلوم ہوتے ہیں۔ کبھی اقوال زریں، کبھی اشتہارات وفلمیات، کبھی خبر نگاری و مصاحبہ نگاری اور کبھی تاریخ وجغرافیہ نویسی غرض کہ مختلف تحریری سانچے اپنا کر قاری کی خوش طبعی کے سامان مہیا کرتے ہیں اور نہایت ہنر مندی کے ساتھ اسے اپنے طنز کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔

لطف بالائے لطف یہ ہے کہ انھوں نے اگر ایک طرف طنزیہ ومزاحیہ اسلوب میں اپنی پہچان بنائی ہے اور انشائیہ نگاری کے تعلق سے کامیاب ونفیس تحریریں پیش کی ہیں تو دوسری طرف سنجیدہ ومتین طرز نگارش میں بھی انھوں نے اپنی باقیات سے اپنے قارئین کی طمانیت کے اسباب مہیا کرنے میں کوئی کمی نہیں رکھی ہے

تمنا مظفر پوری نے لگ بھگ پچاس برسوں تک مختلف اصناف ادب کو اپنی بہترین صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ ان کی پہلی کہانی 'میری گلی کے بڈھے' ہفت روزہ 'ہمارا بہار' میں 1959 میں چھپی تھی، پھر 1982 میں ان کی کتاب 'ظرافت اور چند ظریف ہستیاں' نسیم بکڈپو لکھنؤ

سے شائع ہوئی جو بچوں کے لیے ان کی بھرپور قوت تخلیق کی غماز ہے۔ اس کے دو سال بعد 1984 میں ان کی مشہور کتاب 'تمنا پنچ' منظر عام پر آئی جس میں انٹرویو، اسلامیات، مقالے، نظم، انشائیے، طنز ومزاح، غزل، جغرافیہ، تواریخ، افسانے، اقوال زریں، ڈرامے، اشتہارات، اخبارات اور فلمیات جیسے عناوین کے تحت ان کی مختلف تحریریں شامل ہیں۔ 1989 میں ان کی کتاب 'پردے کے سامنے' اشاعت پذیر ہوئی جو ان کے نو ڈراموں کا مجموعہ ہے، بعدازیں 1993 میں ان کی کتاب 'الٹے قلم سے' منظر عام پر آئی جس میں پندرہ طنزیہ اور مزاحیہ مضامین ہیں، پھر 2007 میں ان کے چوبیس انشائیوں کا مجموعہ شائع ہوا جس کا نام ہے 'کہتا ہوں سچ کہ...' تمنا مظفر پوری کی کتاب 'عقلمند بچے' 2011 میں چھپی جس میں بچوں کے لیے تیس تخلیقات شامل ہیں۔ جناب تمنا کی آخری کتاب 'تحقیقی وتنقیدی آفاق' ہے جس میں ان کے انیس تنقیدی وتحقیقی مضامین شامل ہیں۔ یہ کتاب 2013 میں شائع ہوئی جو ان کا سال وفات ہے۔

تمنا مظفر پوری نے بہت ساری کتابیں ترتیب بھی دی ہیں مثلاً محمد سلیم واجد کا شعری مجموعہ 'وقت کا مسیحا'، م۔ق۔خان کا افسانوی مجموعہ 'تنہائی میں مکالمہ' منتخب فرید کا افسانوی مجموعہ 'سانچہ اور شیشہ' اور فرحت قادری پر مختلف ارباب قلم کے تاثرات اور مقالات کا مجموعہ 'فرحت قادری: فن اور فن کار' مزید برآں ان کی کئی کتابوں کے مسودات، ترتیب وطباعت کے مرحلے میں تھے، مگر افسوس کہ زندگی نے وفا نہ کی اور یہ عظیم فنکار اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔ تمنا مظفر پوری نے بقول ضیاء الرحمٰن غوثی 1959 سے بچوں کے لیے لکھنے کا سلسلہ شروع کیا۔

(بہار میں بچوں کا ادب، ضیاء الرحمٰن غوثی، ص 105)

وہ نہ صرف 'اطفال ادب' گیا کی سرپرستی کرتے رہے اور ماہنامہ 'مسرت' میں پابندی سے لکھتے رہے، بلکہ 'مسرت' بند ہو جانے کے بعد بہت سارے دوسرے پرچوں میں بھی بچوں کے لیے ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں۔ ان کی پہلی کتاب 'ظرافت اور چند ظریف ہستیاں' بھی بچوں ہی کے لیے تھی اور ان کی زندگی میں سال وفات سے پہلے شائع ہونے والی آخری کتاب 'عقلمند بچے' بھی بچوں ہی کے لیے ہے اور ان کتابوں کا مطالعہ بتا دیتا ہے کہ تمنا مظفر پوری نے بچوں کی فطرت کے مطابق موضوع وطرز تحریر کا انتخاب کیا اور بچوں کے جذبہ تجسس کو آسودہ کرنے پر توجہ رکھی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ بھی التزام رکھا ہے کہ زمانے کے اتار چڑھاؤ میں انھیں پڑھ کر بچے ان سے بخوبی آنکھیں ملانے کے قابل ہو سکیں اور عمل کے پیکر بن کر ابھر سکیں:

''تمنا مظفر پوری کبھی آرائشی زبان استعمال نہیں کرتے، بلکہ اپنی باتیں سادگی کے ساتھ بیان کر دیتے ہیں، چونکہ ان کا تعلق مزاح اور ادب اطفال سے ہے، اس لیے یہ انداز تحریر موضوعات سے گہری مطابقت رکھتا ہے۔ بچوں کے لیے کہانیاں لکھتے ہوئے تمنا مظفر پوری بچوں کے ذوق اور ان کی ذہنی سطح کا خاص خیال رکھتے ہیں۔ نیکی کا درس ان کی کہانیوں میں دلچسپی کے جلو میں آتا ہے اس لیے یہ بچوں کے لیے گرانبار نہیں ہوتا۔''

(ادب اطفال کے تخلیق کار: تمنا مظفر پوری، علیم اللہ حالی مشمولہ عقلمند بچے، ص 6)

تمنا مظفر پوری علم الحساب اور الجبرا سے خاص شغف رکھنے والے اور شخصی طور پر سادگی پسند آدمی تھے۔ ان کے مزاج میں قناعت پسندی تھی اور یک گونہ شان بے نیازی، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ادب اطفال کے باب میں بھی ان کی خدمات ان اوصاف سے بخوبی غذا یافتہ ہیں۔ یہاں تک کہ تمنا مظفر پوری کی بیشتر کہانیاں اگر 'آوارجہ بداماں' کہی جائیں تو شاید مبالغہ نہ ہو کہ حساب کتاب کی باتیں لکھے بغیر وہ آگے بڑھتے ہی نہیں ہیں۔ وہ نہ تو بھاری بھرکم لفظوں سے کام لیتے ہیں اور نہ ہی ایسی بھاری بھرکم سوچ اپنی کہانیوں میں سمونے کے متمنی ہوتے ہیں جن کا بوجھ نونہالوں سے اُٹھ ہی نہ سکے۔

تمنا مظفر پوری یقیناً ادب اطفال کے سچے، کھرے اور مخلص و باشعور فن کار ہیں اور بخوبی سمجھتے ہیں کہ بچوں کے ذہن تک، ان کے لیے لکھے جانے والے ادب کی رسائی اسی وقت ممکن ہے جب کہ اس میں سادگی اور صفائی ہو۔ تمنا مظفر پوری کی دو کتابیں ادب اطفال کے تعلق سے اشاعت پذیر ہوئیں اور سال اشاعت کے اعتبار سے ہم دیکھتے ہیں کہ ان میں تقریباً پچیس سال کا وقفہ ہے۔ پہلی کتاب ان کی ادبی زندگی کے درمیانی دہے میں آئی اور دوسری کتاب آخری دہے میں، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بچوں کے ادب کی تخلیق پر تاحیات متوجہ رہے۔ ان کی کتاب 'عقلمند بچے' آج سے محض سات، آٹھ سال پہلے 2011 میں چھپی تھی۔ اس کتاب کے شروع میں پروفیسر علیم اللہ حالی کی تحریر کے بعد، خود مصنف کی باتیں 'کہانی کی کہانی' کے عنوان سے سامنے آتی ہیں جس میں انھوں نے بچوں کو 'دوستو' کہہ کر مخاطب کیا ہے اور عمر کا فرق ہونے کے باوجود اس طرز تخاطب کی وجہ بھی انھیں بہت اچھے انداز میں سمجھا دی ہے۔ ان کی تحریر 'کہانی کی کہانی' پڑھنے سے بخوبی اندازہ ہوجاتا ہے کہ فنی سطح پر ادب اطفال کے تعلق سے وہ صاف ستھرا تجزیاتی ذہن رکھتے تھے۔

تمنا مظفر پوری نے 'کہانی کی کہانی' سناتے ہوئے مزید جو کچھ بتایا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ بچوں کے ادب سے دلچسپی ان کے خاندانی ماحول کا ورثہ ہے اور اس تعلیمی نظام کا بھی جس نے عورتوں کے لیے کوئی ذہنی وعملی رکاوٹ کھڑی نہیں کی تھی، نہ مختلف زبانوں کے حصول کے معاملے میں اور نہ ہی ریاضی جیسے مضمون کے معاملے میں۔ 'کہانی کی کہانی' میں انھوں نے برسبیل تذکرہ 1964 کے حوالے سے روپے، آنے اور وزن اور باٹ کی جو کہانی سنائی ہے وہ بجائے خود بچوں کے لیے نہایت مفید اور معلوماتی ہے۔

تمنا مظفر پوری کی کتاب 'عقلمند بچے' کی پہلی کہانی 'علم دین' ہے۔ جس میں بغداد کے خلیفہ اور ایک تاجر کی ملاقات کا قصہ بیان ہوا ہے اور اس ملاقات میں سوال و جواب کے نتائج سے علم دین کی اہمیت وافادیت اور ضرورت سامنے لائی گئی ہے۔ یہاں ایک طرف بچوں کو یہ ذہن دیا گیا ہے کہ دنیاوی علوم وفنون میں مہارت کی اہمیت اپنی جگہ، لیکن دینی علوم سے واقفیت کے بغیر بہرحال کام نہیں چل سکتا بلکہ ایسی صورت میں وقتی طور پر ہاتھ آنے والی کامیابی کا پانسہ اچانک پلٹ بھی سکتا ہے اور دوسری طرف بڑوں کو یہ توجہ دلائی گئی ہے کہ اگر انھوں نے اپنی اولاد کو علم دین سے بے بہرہ رکھا، تو دنیاوی علوم میں ہزار مہارت کے باوجود بھی وہ مشکلوں میں پڑ سکتی ہے۔

تمنا مظفر پوری کی کہانی 'عقلمند بچے' کا پلاٹ عظیم آباد کے ایک مضافاتی قصبہ احمد نگر کے سنگ وخشت سے بنایا گیا ہے اور یہ عقلمند بچے اکبر حسین اور اصغر حسین نامی دو سگے بھائیوں کے بچے ہیں۔ اکبر حسین کے بیٹوں کا نام احمر اور انور ہے اور ان کی عمر بالترتیب سولہ سال اور چودہ سال ہے، جب کہ اصغر حسین کے بچے مجیب اور شکیب بالترتیب بارہ سال اور دس سال کے ہیں۔ موروثی حویلی نما مکان کے بٹوارے کا سوال ان بچوں کے باپ اور چچا کے درمیان زبردست ناچاقی پیدا کر دیتا ہے تو آخر کار احمر کی پہل پر تینوں بچے ایک منصوبہ بناتے ہیں اور جب بٹوارے کے لیے پنچایت بیٹھتی ہے تو عین فیصلے کے وقت یہ بچے، اپنے اپنے ابو کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان کی فرمائش کے اثر سے فریقین کے درمیان صلح پر پنچایت کا اختتام ہوتا ہے۔ اس کہانی میں جو مسئلہ اٹھایا گیا ہے، وہ نیا نہیں ہے، لیکن تمنا مظفر پوری کے مشاہدے

کی گہرائی اور بیان واقعہ کی ہنر مندی سے بہر حال ایک نئی فضا بن گئی ہے، بلاشبہ بچوں کی متحد اور معصوم ذہنیت اور ان کی بر وقت منصوبہ بند ہمت کا سہارا لے کر ایک طرف کہانی نویس نے بڑوں کی تربیت کی ہے اور دوسری طرف یہ بھی دکھادیا ہے کہ بچے بھی اپنی کم عمری کے باوجود اپنی عقلمندی سے خاندان اور معاشرے میں، مسائل کو سلجھانے کے لیے اہم رول ادا کر سکتے ہیں صرف اپنی بات رکھنے کا سلیقہ اور موقع محل کو سمجھنے کی صلاحیت ہونی چاہیے۔

تمنا مظفر پوری کی کہانی 'توہم' میں ہماری ملاقات جاوید اور انور نامی دو اسکولی طالب علموں سے ہوتی ہے۔ یہ دونوں دسویں جماعت میں پڑھتے ہیں اور ایک ہی محلے میں رہتے ہیں، اس لیے ان میں کافی گہری دوستی ہے، مگر ان دونوں کے خیالات میں بڑا فرق ہے۔ جاوید محنتی، ذمے دار اور ایماندار لڑکا ہے جب کہ انور لا پرواہ، باتونی اور پڑھائی سے جی چرانے والا۔ انور کی والدہ ایک توہم پرست خاتون ہیں، وہ تعویذ گنڈے پر اندھا اعتقاد رکھتی ہیں اور انھوں نے اپنے بیٹے کا ذہن بھی ایسا ہی بنادیا ہے۔ یہاں اگرچہ جاوید یہ کہہ کر اپنے دوست کا ذہن بدلنے میں عملاً کامیاب ہو جاتا ہے کہ:

''دعا اور تعویذ دل اور روح کی قوت کے لیے ہیں۔ یہ نہیں کہ تم ان کے بھروسے سے پڑھنا چھوڑ دو۔ قرآن شریف حفظ کرنے کے لیے بھی محنت کرنی پڑتی ہے۔ یہ نہیں کہ خدا کا کلام ہے تمھیں یوں ہی یاد ہو جائے گا۔'' (کہانی 'توہم' مشمولہ 'عقلمند بچے' ص 22،23 اور ص 24)

لیکن برا ہو، جہالت بھری توہم پرستی کا، کہ آخر کار اس کا ایک سال، ماں کے توہم کی نذر ہو ہی جاتا ہے۔ اس کہانی کا یہ جملہ بڑا قیمتی ہے کہ:

''وہم سے انسان کمزور پڑ جاتا ہے اور بیوقوف بن جاتا ہے۔'' (کہانی 'توہم' مشمولہ 'عقلمند بچے' ص 22،23 اور ص 24)

تمنا مظفر پوری کی کہانی 'قدرت کا فیصلہ' میں مقدمہ کے فریقین کی حیثیت سے پرشوتم داس اور مدن موہن سے ہماری ملاقات ہوتی ہے۔ مدن موہن مدعی اور پرشوتم داس مدعا علیہ ہے اور اس کہانی کے ذریعہ یہی بتایا گیا ہے کہ بے قصور کے خلاف لاکھ سازشیں کی جائیں، اللہ ان کے ساتھ ضرور رہتا ہے اور غیب سے ایسا سامان ہوتا ہے کہ باطل کو منھ کی کھانی پڑتی ہے۔ اس کہانی میں ایک ضمنی کہانی بھی ہے کہ نل پر نہانے کے لیے جب پرشوتم اور مدن جی کی بیویوں کے درمیان جھگڑا ہوا تھا تو مدن جی کی بیوی کے حق میں محلے کے عورتوں کے فیصلے کو پرشوتم کی بیوی نے اپنی بے عزتی سمجھتے ہوئے بدلہ لینے کی بات کہی تھی اور شاید مدن پر یہ مقدمہ بیوی کے ذریعہ شوہر کو بہکاوے میں لینے کا نتیجہ تھا، اس طرح یہاں بڑوں کے لیے بھی بالواسطہ طور پر کام کی بات یہ نکلتی ہے کہ وہ بات کو طول دینے، کینہ پالنے اور بہکاوے میں آنے سے بچیں اور چھوٹے ہوں یا بڑے ہمیشہ یاد رکھیں کہ جعل سازی کا انجام برا ہی ہوتا ہے۔

'شاہد کی شرارت' خالص بچوں کے لیے لکھی گئی نیم مزاحیہ کہانی ہے۔ یہاں تمنا مظفر پوری نے بہت ہی پھڑکتے ہوئے انداز میں بچوں کو اردو محاورے اور ان کے مفاہیم سمجھائے ہیں۔ چند سطریں دیکھیے:

''.......... پھٹا پائجامہ دیکھنا تھا کہ اسے (شاہد کو) محاورہ یاد آگیا اور ان کے پھٹے میں اپنی ٹانگ ڈالنے کی خواہش پیدا ہوگئی.......... دونوں جب قریب آگئے تو شاہد نے جھٹ احمد کی ٹوپی محمود کے سر پر رکھ کر تماشہ دیکھنا چاہا، لیکن کوئی خاص نتیجہ نہیں نکلا۔ دونوں کو مسکراتے ہوئے آگے بڑھتے دیکھ کر اسے محاورہ اور اس کے بنانے والے پر سخت غصہ آیا.......... اس کے ساتھ باغ سے باہر نکلنے کے بعد سڑک پر کھڑے ہو کر (اس کے دوست) اسے تیز بھاگنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ شاہد نے دیکھا کہ سر پر پاؤں رکھنے سے کام نہیں چلے گا لہٰذا پاؤں پر سر رکھ کر التجا کی جائے کہ اے پاؤں جتنا تیز بھاگ سکتا ہے بھاگ چل..........''

(شاہد کی شرارت مشمولہ 'عقلمند بچے' ص 31 و ص 32)

تمنا مظفر پوری کی کہانی 'میاں بدھو' کی اردو بسنت گاؤں کے دو بھائیوں کی کہانی ہے۔ یہاں تمنا مظفر پوری نے ایک طرف انور اور دوسری طرف اکبر یعنی بدھو سے بچوں کی ملاقات اسی لیے کرائی ہے کہ وہ تعلیم کی تاثیر اور برکت قریب سے دیکھ لیں اور یہ سمجھ لیں کہ جو بچے محنت اور لگن سے نہیں پڑھتے، انھیں نام کا اکبر یعنی بڑا ہونا کوئی فائدہ نہیں دیتا بلکہ وہ ساری زندگی 'بدھو' کی طرح گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں اور بوڑھی ماں کا سہارا بننے کے قابل ہوتے ہیں۔ ورنہ بدھو کی طرح بوڑھی ماں پر اپنی نگرانی کا بوجھ ڈالے رہتے ہیں۔

اس کہانی میں بدھو میاں کا خط پڑھنا اور خود ہی تبصرہ کرتے چلے جانا بہت دلچسپ ہے۔ وہ جب 'از گور کھپور' کو 'از گور۔ کھپور' پڑھتے ہیں۔ '1 اکتوبر' کو '12 اکتوبر' پڑھتے ہیں اور 'خطوط' کو 'خط وط' اور پھر اپنے غلط سلط پڑھنے کے مطابق فوراً ہی مطلب بھی جوڑ لیتے ہیں تو ہنسی آنا لازمی ہے، مگر بات یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس منظر نامے سے دراصل تمنا مظفر پوری غلط نویسی اور عدم صحت کے ساتھ بلند خوانی کا انجام بھی دکھانا چاہتے ہیں۔ دادی اماں نے اگر پاس ہی پڑے ہوئے پرانے اخبار ہاتھ میں لے کر بدھو کے پڑھنے کی نقل اتاری ہے تو اس میں بھی ایک باریک نکتہ پوشیدہ ہے کہ آئے دن، بدھو جیسے لوگ اسی طرح تحریر کا غلط سلط مطلب نکالتے رہتے ہیں۔ وہ 'لقوہ مار گیا' جیسے محاورے کو نہیں سمجھتے بلکہ 'لقوہ' کو کسی کمینے آدمی کا نام سمجھ بیٹھتے ہیں اور اس کی ہڈی پسلی ایک کر دینے کا پروگرام بنانے لگتے ہیں۔ یہاں باتوں ہی باتوں میں تمنا مظفر پوری نے قصہ فہمی کا جو احساس دلایا ہے، کہانی کی بنت کا فن اور کہانی سننے کا ادب و سلیقہ جس طرح سکھایا ہے، وہ بھی دیدنی ہے۔

ان دنوں ریڈیو اور ٹی وی پر ہندی میں 'جاگو گراہک جاگو' کا اشتہار آتا رہتا ہے جس کا مقصد خریداروں کو اپنے حقوق کے تئیں بیدار کرنا اور دوکانداروں کی زیادتی اور بے ایمانی سے بچانا ہے۔ تمنا مظفر پوری نے 'عاقلہ بوا' میں یہی موضوع اٹھایا ہے اور کم تولنے والے دوکانداروں سے ہوشیار کیا ہے۔ جھوٹے کو اس کے گھر تک پہنچانا اگر ایک محاورہ ہے تو عاقلہ بوا نے، پھل خریدنے کے لیے ترازو اور باٹ اپنے ساتھ لے جا کر گویا عملاً یہ محاورہ پورا کر دیا ہے۔ اس کہانی کا ایک مفید پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں کہانی لکھنے والے نے صرف کم تولنے والے کا انجام ہی نہیں دکھایا بلکہ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ترازو میں کیسے کیسے گھپلا ہوتا ہے۔

کہانی 'غلام وزیر بن گیا' قدرے طویل مگر دلچسپ کہانی ہے۔ بکسر کے رحم دل راجہ وجے رانا کی اس تاریخی میں ایک طرف وزیر دیو کرن سے ملاقات ہوتی ہے جو لالچی، حاسد اور خائن ہے اور دوسری طرف وزیر دیو کرن کے دوست گوپال سے جو ذہین اور محنتی ہے، مگر غریبی نے اسے گھیر رکھا ہے۔ کہانی کا مقصد یہی دکھانا ہے کہ برے کام کا انجام برا ہوتا ہے اور صلاحیت رکھنے والے نیک اور ایماندار آدمی کو دیر یا سویر اس کا حق ضرور مل جاتا ہے۔

تمنا مظفر پوری کے اس مجموعے میں جہاں 'چور کا مقبرہ' اور 'عجیب و غریب مقدمے' جیسی دلچسپ اور حیرت ناک کہانیاں ملتی ہیں، وہیں دوسری طرف 'ہم ایک ہیں'، 'جھوٹی دوستی' اور 'سانپ اور مینڈک' جیسی کہانیاں بھی بچوں کو متوجہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتی ہیں۔ مختصر یہ کہ تمنا مظفر پوری ادب اطفال کے باب میں اپنی تصنیفی خدمات کی وجہ سے بلاشبہ ایک بڑے اور منفرد فن کار ہیں۔

■

Nishat Akhtar
Research Scholar, Patna University
Patna - 800005 (Bihar)

مولانا غیاث الدین

بچوں کے ادب کا ایک قدیم خاموش خدمت گزار

مرحوم حافظ عبدالسمیع دھامپوری

قدیم تاریخی، علمی، ثقافتی، اورتہذیبی، ورثے سے مالامال ضلع بجنور جہاں زمانہ قدیم سے شعروادب، افسانہ نگاری، اردوناول نگاری اور دیگر علوم وفنون کے علاوہ اردوصحافت کے میدان میں بھی نمایاں مقام رکھتا ہے نیز قدیم ثقافتی نظریے سے بھی ضلع بجنور کی ثقافتی اورتہذیبی روایت قابل فخر رہی ہے، یوں تو ضلع بجنور کی خاک سے سیکڑوں نابغہ روزگار شخصیات نے جنم لے کر ضلعے کا نام روشن کیا ہے۔ لیکن شعروادب کے لیے بھی سرزمین ضلع بجنور زرخیز اور سرسبز واقع ہوئی ہے۔ یہاں سیکڑوں اردو اورفارسی کے ادیب پیدا ہوئے ہیں جنھوں نے اپنے علمی وادبی امتیاز کی بنا پر شہرت دوام حاصل کی اور جن کی ادبی شہرت کی بازگشت پورے ملک میں سنی جاسکتی ہے ضلع بجنور کی ان شخصیات میں سے سرزمین دھامپور میں پروان چڑھنے والے شعراء وادباء میں ایک معتبر اورقابل تعظیم شخصیت جوکہ قادرالکلام شاعر ہونے کے ساتھ ادب اطفال کے محقق بھی تھے، اورزبان وادب کی انفرادیت اورادب اطفال کے سبب مقبول خاص وعام ہوئے، جس کو اس دنیا سے رخصت ہوئے 34 سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ جو براہ راست اپنے وقت کے ایک بڑے نام چیں شاعر اور ادیب 'سیماب اکبرآبادی' کے شاگرد تھے۔ شہردھامپور میں پروان چڑھے، بچوں کے اس عظیم ادیب کوحافظ عبدالسمیع سیمابی دھامپوری کہا جاتا ہے، لیکن شعرو ادب کی دنیامیں حافظ دھام پوری کے نام سے متعارف ہیں۔

حافظ دھامپوری کی پیدائش 5 جولائی 1919 کو ضلع بجنور کے موضع منڈاور میں ہوئی آپ ایک علمی وادبی گھرانے کے روشن چراغ تھے آپ کے والد مولانا عبدالعزیز اورآپ کے جدامجد 1880 میں دھامپور سے منڈاوراس وقت کے وہاں کے رئیس (ساہوکار) جانکی پرساد کے یہاں بسلسلہ ملازمت چلے گئے تھے 1922 میں ساہوکار کی وفات کے بعد 1922 میں 42 سال کے بعد حافظ دھامپوری اوران کے آباو اجداد پھر سے دھامپور آ گئے اس اعتبار سے حافظ کا آبائی وطن دھامپور ہوا اور اسی وجہ سے 'حافظ دھامپوری' کہنے اور لکھنے لگے اورعلامہ سیماب اکبرآبادی کے تلمیذ خاص ہونے کے سبب اپنے تخلص 'حافظ' کے آگے سیمابی استعمال کرتے تھے حافظ دھامپوری کے ایک چھوٹے بھائی کا نام مستقیم اور بہن کا نام زبیدہ تھا والد کا نام مولانا عبدالعزیز اور والدہ کا نام مجیدا خاتون تھا، جو اردو، عربی اورفارسی کی عالمہ تھیں۔

سرزمین دھامپورمیں پروان چڑھنے والے شعرا، وادبا، میں ایک معتبر اور قابل تعظیم شخصیت جو کہ قادرالکلام شاعرہونے کے ساتھ ادب اطفال کے محقق بھی تھے، اورزبان وادب کی انفرادیت اورادب اطفال کے سبب مقبول خاص وعام ہوئے، جس کو اس دنیاسے رخصت ہوئے 34 سال کا طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ جوبراہ راست اپنے وقت کے ایک بڑے نام چیں شاعر اور ادیب 'سیماب اکبرآبادی' کے شاگرد تھے۔ شہردھامپور میں پروان چڑھے۔ بچوں کے اس عظیم ادیب کوحافظ عبدالسمیع سیمابی دھامپوری کہا جاتا ہے۔ لیکن شعرو ادب کی دنیامیں حافظ دھام پوری کے نام سے متعارف ہیں۔

حافظ دھامپوری کی الف۔ با۔ تا۔ تعلیم حافظ نصرت منڈاوری کے یہاں ہوئی جو شاعر بھی تھے اس کے بعدان کے والد مولانا عبدالعزیز نے ان کودھامپور میں تحصیل سے متصل ایک سرکاری اسکول میں داخل کیا مگر کچھ ہی دنوں کے بعدان کے والد نے ان کواس وجہ سے اس اسکول سے ہٹالیا کہ وہاں مذہبی تعلیم نہ تھی پھرعربی وفارسی کی کتابیں خود ہی گھر پر پڑھائیں اور حفظ قرآن کے لیے حافظ محمد ابراہیم (جوکہ بڑے نیک انسان تھے) کے سپرد کردیا، اردو کی تعلیم کے لیے منشی عبدالرحمن کے پاس چھوڑا جواس وقت اردو کے بڑے نام چیں استاد تھے، اس کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ادیب کامل کا امتحان دیا۔

موصوف نے امامت اوردرس وتدریس کوبطور پیشہ اختیارکیا اورتادم حیات اسی پیشے سے حاصل قلیل مشاہرے پر گزر بسرکی، حافظ دھامپوری نے اپنے ہی گھر میں ایک مدرسہ قائم کیا اوربچوں کوتعلیم دینے لگے مگر بعد میں کسی وجہ سے دھامپور چھوڑکررلجہ کا تاج پور چلے گئے اوروہاں چھیپیوں کے مدرسے میں 16 سال امامت کی، بعدہ تین سال سوائی مادھوپور راجستھان میں درس وتدریس اور امامت وخطابت کے فرائض انجام دیے۔ پھر، نجیب آباد، نیڈرو، جیترا، اوردھامپور محلہ بندوقچیان میں امامت کی۔ اس مسجد میں احقر استادمحترم کی اقتدا میں نماز ادا کرتا تھا، اس لیے ان کی مترنم آواز، اورقرات قرآن اب تک یاد ہے، راقم الحروف کوچونکہ ان کی شاگردی کا شرف حاصل ہے اس لیے 34 سال بعد بھی ان کا چہرہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کتابی آنکھیں، درازقد، لمبی داڑھی، علی گڑھی شیروانی اور پائجامہ، گول ٹوپی، چہرے پرچشمہ، ہاتھ میں بید، میانہ

رفتار، ہلکی گفتار، مجموعی طور سے حافظ دھامپوری ایک خوش اخلاق، خوش مزاج، خوش اطوار، خوش کردار، وسیع المنزلت اور کشادہ فکر تھے۔ اللہ نے آپ کو دنیوی تکلفات، تصنع بناوٹ، سے طبعی طور سے بالکل مستغنی کر دیا تھا، آپ بالکل سادہ مزاج تھے، حافظ دھامپوری کی زندگی تادم حیات نہایت عسرت اور تنگدستی میں گزری، لیکن تمام تر ناسازگار و نامساعد حالات کے باوجود بھی وہ تقویٰ پر عمل پیرا تھے، انسانی زندگی کا ایک اہم جز شادی ہے لہٰذا حافظ دھامپوری رشتہ ازدواج میں بھی منسلک ہوئے اور ان کے گھر سات بچوں کی پیدائش ہوئی دو اولاد نرینہ اور دو لڑکیاں بچپن ہی میں انتقال کر گئیں اور بڑے بیٹے عبدالصمد بزمی کا بھی چند سال قبل انتقال ہو چکا ہے۔ مرحوم کے چھوٹے صاحبزادے محمد حنیف جو کہ احمد علی روڈ دھامپور میں سیٹرنگ کا کام کرتے ہیں، منجھلے بیٹے عشرت بزمی جو پیشے سے کارپینٹر ہیں اور شعری ذوق بھی رکھتے ہیں ان کو اپنے والد سے شعر و سخن کا کچھ حصہ وراثت میں ملا ہے، عشرت بزمی کے مطابق ان کی حیات میں ان کا کوئی شعری مجموعہ چھپ سکا اور نہ ہی ان کی علمی و ادبی خدمات کے تعلق سے ان کے بڑے صاحبزادے عشرت بزمی کے علاوہ کسی اور سے ان کے بارے میں کوئی ٹھوس معلومات کوشش بسیار کے باوجود حاصل ہو سکی، باقی ان کی ادبی خدمات سے متعلق پورا دھامپور خاموش ہے، ان کے کئی شعری مجموعے غیر مطبوعہ ہیں، کاش ان کی زندگی ہی میں ان کے ادبی گوشے محفوظ کر لیے جاتے تو ہمارے پاس دھامپور کے ایک قابل قدر سپوت کی ادبی خدمات بڑی آسانی سے ہمارے سامنے آجاتیں، عشرت بزمی کے بقول اگر ان کا تمام اردو و فارسی میں بچوں سے متعلق کہا گیا کلام محفوظ و مرتب ہوتا تو ان کے اشعار کی تعداد دیگر شعرا کے کلام کی طرح ہزاروں ابیات پر مشتمل ہوتی، مگر افسوس ان کا تمام کلام ہماری دسترس میں نہیں ہے۔ مگر بقول ان کے بیٹے عشرت بزمی والد صاحب نے اپنا ایک شعری مجموعہ (صبح روشن) چھپوانے کی کوشش کی مگر اس کی اشاعت کے لیے اس وقت 1500 روپے کا انتظام نہ ہو سکا جس کی وجہ سے وہ مجموعہ شائع نہ ہو سکا، اب عشرت بزمی والد محترم کی اس ادبی و شعری یادگار کو منظر عام لانے کے متمنی ہیں۔

حافظ دھامپوری نے 1933 سے شاعری کا آغاز کیا یعنی 15 سال کی عمر ہی سے اشعار کہنے لگے تھے، اولاً حافظ نصرت منڈاوری سے اصلاح لی اس کے بعد مولانا ظفر علی خان (ولادت 1870 وفات 1956) سے استفادہ کیا بعد میں اپنے وقت کے مشہور شاعر عاشق حسین علامہ سیماب

حافظ دھامپوری نے 1933 سے شاعری کاآغاز کیا یعنی 15سال کی عمرھی سے اشعار کھنے لگے تھے . اولاً حافظ نصرت منڈاوری سے اصلاح لی اس کے بعد مولاناظفرعلی خان (ولادت 1870 وفات1956) سے استفادہ کیا بعد میں اپنے وقت کے مشھورشاعرعاشق حسین علامہ سیماب اکبرآبادی (المتوفی1951) کا دامن تھام لیاتو پھر انھیں کے ھوکررہ گئے۔ حتیٰ کہ استاد کی محبت میں حافظ دھامپوری لفظ(سیمابی) کواپنے نام کے ساتھ استعمال کرنے کو فخر سمجھتے ھوئے نسبتی اضافے کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔

اکبرآبادی (المتوفی 1951) کا دامن تھام لیا تو پھر انھیں کے ہوکر رہ گئے۔ حتیٰ کہ استاد کی محبت میں حافظ دھامپوری لفظ (سیمابی) کو اپنے نام کے ساتھ استعمال کرنے کو فخر سمجھتے ہوئے نسبتی اضافے کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ اور کسی موقع پر استاد کی شان میں یہ اشعار کہے۔

میں جناب حضرت سیماب کا شاگرد ہوں
ہاں اسی لیے اعزاز تلمذ پر بھی مجھ کو ناز ہے
آپ نے مجھ کو لب نازک سے اپنا کہہ دیا
حافظ ناشاد کو کافی یہی اعزاز ہے

بزرگ اور کہنہ مشق شاعر یوسف بہزاد دھامپوری کہتے ہیں کہ اس وقت کی ایک ادبی تنظیم 'بزم ادب' کے حافظ دھامپوری صدر اور میں اس کا سکریٹری تھا، بقول عشرت بزمی حافظ دھامپوری نے ایک جگہ لکھا ہے کہ میں نے پچاس سال شاعری کی ہے اور پچاس ہزار اشعار کہے ہیں، حافظ دھامپوری چالیس سال تک رامپور سے نکلنے والے موقر ماہنامہ 'الحسنات' میں چھپتے رہے، لہٰذا ماہنامہ الحسنات سے انتہائی تعلق کی بنا پر ایک غزل بعنوان 'یہ گلدستہ ہے روحانی ادب' کا تحریر فرماتے ہوئے لکھا:

یہ الحسنات ہے ایسا رسالہ
کہ ہے میرا رفیق تیس سالہ
نظرافروز ہے اس کا نظارہ
جواہر پارہ ہے ہر ایک شمارہ

اس کے علاوہ ماہنامہ 'نور' ماہنامہ الہلال، نیا دور اور ہندوستان بھر میں بچوں کے تعلق سے جو ماہنامے نکلتے رہے ان سب میں حافظ دھامپوری کی نظمیں، غزلیں، نعتیں منقبتیں مستقل چھپتی رہیں۔ حافظ دھامپوری کا شمار بیسویں صدی کے نمائندہ نظم گو شاعروں میں ہوتا ہے، نظم نگاری حافظ کا اوڑھنا اور بچھونا تھی، ان کی نعتیں، نظمیں، غزلیں، سبھی سلیس اور آسان زبان میں ہیں۔ انھوں نے اپنی نعتوں میں عقیدت و محبت کے ساتھ ادب و احترام کا لحاظ بھی رکھا ہے جو ایک نعت گو کے لیے ضروری ہے مولانا نذیرالاکرم مرادآبادی کے ایک طرحی مصرعہ (آستان حبیب خدا چاہیے) پر بند لگاتے ہوئے یہ نعت کہی۔

اے زبان پہلے حمد خدا چاہیے
پھر حبیب خدا کی ثنا چاہیے
زندگی میں تجھے اور کیا چاہیے
سایہ دامن مصطفیٰ چاہیے

ایک دیگر نعت میں حضورؐ سے اس طرح اظہار محبت کر رہے ہیں۔

میں تو عشق محمد کا بیمار ہوں
کب علاج و دوا کا طلب گار ہوں
اے طبیب مجھے کب شفا چاہیے
یہ ہے اعجاز انگشت صل علی
آپ نے چاند کو ٹکڑے ٹکڑے کیا
آپ سے جب کہا معجزہ چاہیے

بچوں سے متعلق حافظ کی نظمیں شامل نصاب ہیں، ایک نظم جو بیسک ریڈر اردو درجہ تین میں ہے وہ بھی شامل نصاب ہے، اس سبق آموز نظم میں ماں باپ کا احترام، اخوت، بھائی چارگی اور بچوں کی اخلاقی کردار سازی کی گئی ہے۔

حافظ دھامپوری کی بچوں کی ایک نظم پیارے نبی کی پیاری باتیں بڑی مشہور ہوئی۔

دین سب کو سکھاتے تھے پیارے نبی
اچھی باتیں بتاتے تھے پیارے نبی

داستان حق، اور آسان نظمیں، بچوں سے متعلق تقریباً پچاس نظموں پر مشتمل یہ دونوں کتابیں ادارہ الحسنات رامپور سے شائع ہوئیں بہرحال بچوں کی فطرت اور فراست پر فراخدلی سے قلم چلانے والا یہ عظیم شاعر دل میں شاعری کی مزید تمنا لیے یہ کہتا ہوا اس دنیائے فانی سے رخصت ہوا کہ۔

چالیس برس مشق سخن کر کے بھی حافظ
تکمیل فن شعر کی حسرت سی ابھی ہے

25 نومبر 1983 بروز جمعہ صبح 4 بجے حافظ عبدالسمیع دھامپوری الملقب بہ حافظ دھامپوری نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اس طرح دھام پور کے افق پر ادب اطفال کا یہ خادم ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

■

Maulana Ghayasuddin Dhampuri
Mohalla: Banduqchiyan, Dhampur
Distt.: Bijnor -246761 (UP)

محمد جلیل

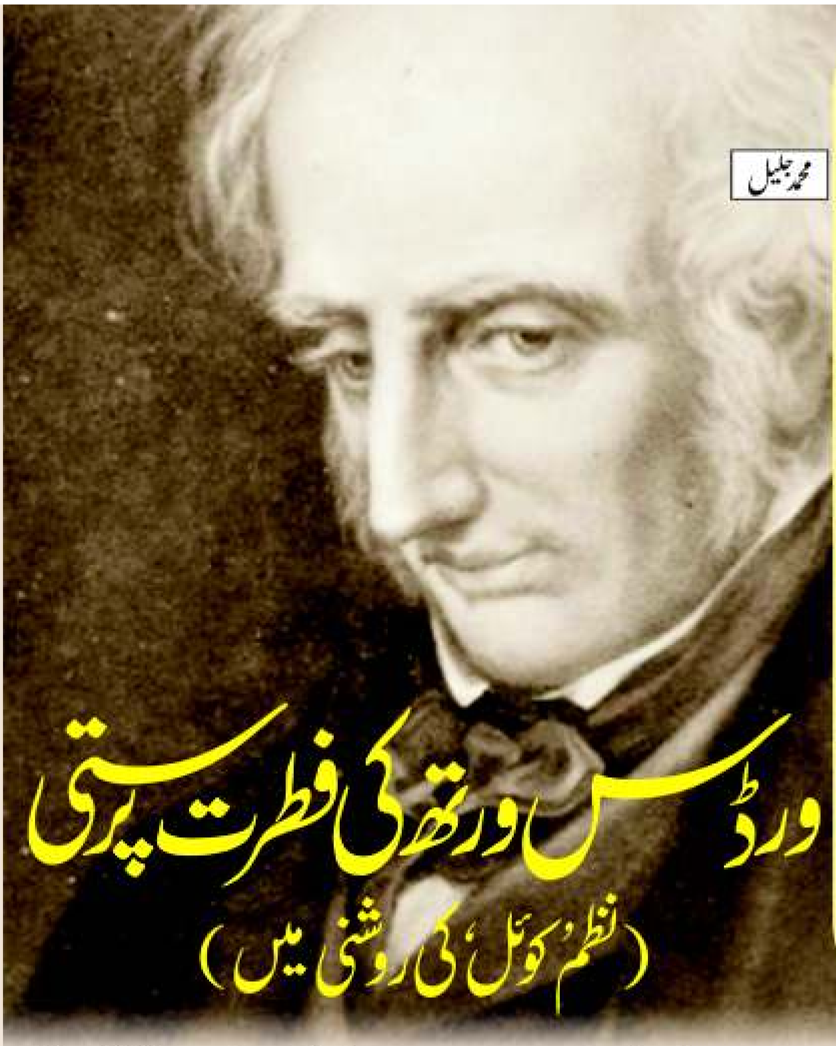

ورڈس ورتھ کی فطرت پرستی
(نظم 'کوئل' کی روشنی میں)

دنیا میں اب تک لا تعداد انسان پیدا ہو چکے ہیں جن کا کوئی شمار نہیں لیکن بعض شخصیات ایسی ہوتی ہیں جو اوراق لیل ونہار پر نقش کالحجر ہو جاتی ہیں۔ ورڈس ورتھ کا شمار ایسی ہی شخصیات میں ہوتا ہے۔ اٹھارویں صدی کے اواخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں انگریزی ادب کا جو منظر نامہ سامنے آیا اور جن لوگوں نے اس پر اپنے نشانات مرتسم کیے ان میں ورڈس ورتھ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انھوں نے شاعری اور تنقید میں بیش بہا ادبی سرمایہ چھوڑا ہے جس پر انگریزی ادب ہمیشہ ناز کرتا رہے گا۔ ان کی عظمت کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ ان کی پذیرائی صرف مغرب میں ہی نہیں بلکہ اپنے عہد، خطے اور جغرافیائی سرحدوں کو عبور کر کے ایسے ممالک اور نو آبادیات میں ہوئی جہاں تک رسائی مشکل تھی۔ آج ڈیجیٹل کاری کے باعث پوری دنیا ایک وحدت کی شکل میں ہمارے سامنے ہے اور کسی بھی زبان کے ادب کا مطالعہ بہت سہل ہو گیا ہے۔ ورڈس ورتھ کا شمار انگریزی ادب کے ان شاعروں اور نقادوں میں ہوتا ہے جن کی تخلیقات کا تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ نہ صرف مغرب بلکہ مشرقی ممالک بالخصوص ہندوستان میں ژرف نگاہی کے ساتھ کیا گیا اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

کسی بھی زبان کے ادب میں کوئی بھی تبدیلی فوری طور پر رونما نہیں ہوتی۔ کلاسیکیت ہو یا رومانیت یا پھر جدیدیت دراصل یہ مخصوص مزاج کا نام ہے اور کسی بھی تخلیق کے دوران فن کار کو کسی نہ کسی شکل یا درجے میں اس سے سابقہ پڑتا ہے۔ انگریزی ادب پر رومانیت کا اثر کب سے شروع ہوا یہ قطعیت کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا البتہ اٹھارویں صدی کی ابتدائی دہائیوں کی تخلیقات میں اس کی جھلکیاں دیکھی جا سکتی ہیں۔ یورپی ادبیات پر نظر ڈالیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ رومانیت کی ابتدا فرانس سے ہوئی اور اٹھارویں صدی کے اواخر میں جرمنی میں اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل ہوئی۔ بعد ازاں انگلستان پہنچنے پر اس کا گرم جوشی سے استقبال کیا گیا۔ فرانسیسی مفکر اور ادیب روسو کو رومانی تحریک کا نقیب تسلیم کیا جاتا ہے لیکن اس تحریک کو ولیم ورڈس ورتھ، ایس ٹی کولرج، پی بی شیلی اور جان کیٹس نے بام عروج تک پہنچایا۔ یورپ بالخصوص انگلستان میں جدید کلاسیکی ادب کی تقلید، فرسودہ ہیئت پسندی اور اصول شعر و انشا کی پیروی کو از کار رفتہ قرار دے دیا گیا تھا جس کے باعث کلاسیکی روایت اپنی توانائی کھونے لگی اور رومانیت کا زور بڑھنے لگا۔ زندگی کے ہر شعبے میں حریت اور آزادی اس تحریک کے اولین مقاصد قرار پائے۔ جذبات و احساسات کا اظہار، فطرت پرستی اور حیات و کائنات کا عمیق مشاہدہ و مطالعہ مذکورہ تحریک کے نمایاں اوصاف ہیں۔ اس تحریک کے فروغ میں ورڈس ورتھ کا نام سب سے نمایاں ہے۔ انہوں نے قدیم شعری روایت کی سخت مخالفت کی۔

ورڈس ورتھ کی پیدائش 7 اپریل 1770 کو کاکرموتھ کمبرلینڈ میں ہوئی۔ ابھی ان کی عمر صرف آٹھ برس تھی کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا۔ اس جانکاہ صدمے کو ان کے والد جان ورڈس ورتھ برداشت نہیں کر سکے اور اس سانحہ کے چھ برس بعد وہ بھی دار فانی سے کوچ کر گئے۔ والد کی موت کے وقت ولیم ورڈس ورتھ چودہ سال کے تھے اور وہ لنکا شائر کے ہاک شیڈ گرامر اسکول میں زیر تعلیم تھے۔ اس درسگاہ کا شمار انگلستان کی بہترین درسگاہوں میں ہوتا تھا جہاں انھوں نے نو برس تک تعلیم حاصل کی۔ دوران تعلیم ان پر اسکول کے اساتذہ کے گہرے اثرات مرتب ہوئے۔ ورڈس ورتھ نے سب سے پہلی نظم چودہ سال کی عمر میں 'گرما کی تعطیلات' لکھی اور اس نظم کی جتنی ستائش ہوئی، ورڈس ورتھ کو اس کی توقع نہیں تھی۔ انھوں نے خود لکھا ہے کہ مذکورہ نظم کی جس طرح پذیرائی ہوئی اس کی یہ مستحق نہ تھی۔ شاعر خود مذکورہ نظم کی خامیوں کا معترف ہے لیکن اس کے باوجود وہ شعری ارتقا کے راستے پر تیزی سے گامزن ہوئے اور ان کی نظموں میں جستہ جستہ فکری اور فنی بالیدگی آتی گئی۔

ورڈس ورتھ اپنی ابتدائی تعلیم کے دوران ہی فطرت کی طرف مائل ہوئے۔ وہ بچپن سے ہی عام لوگوں، غریبوں اور کسانوں کی زندگی کا مشاہدہ کرتے تھے لیکن یورپ کے سفر کے دوران مختلف شہروں اور قصبوں سے گزرتے ہوئے انھوں نے ہر طرف رقص و سرود کی محفلیں دیکھیں، انھیں ہر جانب خوشحالی اور شادمانی نظر آئی۔ یہ سارے مناظر کافی مسرور کن تھے لیکن ورڈس ورتھ نے ان کا اثر قبول نہیں کیا۔ مظاہر فطرت کی رعنائیوں اور بوقلمونیوں سے ورڈس ورتھ کو گہری دلچسپی تھی اور اسی وجہ سے یورپ کی سیاحت کے دوران بنی نوع انسان سے ان کا روحانی رشتہ مزید پختہ ہو گیا۔ انھوں نے فطرت کو ہر صورت اور کیفیت میں دیکھا ہے اور اس سے متاثر بھی ہوئے ہیں۔ اٹھارویں صدی کے شعرا کے کلام میں منظر نگاری سطحی طور پر نظر آتی ہے لیکن اس کے علی الرغم ورڈس ورتھ نے مظاہر فطرت کی بہت ہی دلچسپ تصویریں پیش کی ہیں۔ 'شام کی ہوا خوری' کے عنوان سے ان کی نظم 1793 میں شائع ہوئی۔

شاعر کے مطابق قسمت کو یہ منظور نہیں کہ وہ اپنے

عزیز اور مخلص احباب کے ساتھ وقت گزارے۔ خوش وقتیاں اب ان کی تقدیر میں نہیں ہیں اس لیے وہ دوستوں سے علیحدہ ہوکر برگ و بار صحرا اور سنگلاخ وادیوں میں اکیلا پھر رہا ہے۔ ان وادیوں اور جنگلوں میں ڈرونٹ نامی گزرگاہ بھی ہے جہاں کی مسرور کن فضا میں وہ سکون محسوس کرتا ہے۔ یہاں کی فرحت بخش فضا انہیں گرامیر کے اخوت گزیں جزیرے کی طرف لے جاتی ہے۔ نشیبی علاقے کی خاردار جھاڑیوں، زمردیں، سبزہ زار اور سنگلاخ پگڈنڈیوں کے زیر سایہ ہوا کے تیز وتند جھونکوں سے دور وہ خوابوں کی دنیا میں گم ہے۔

ورڈس ورتھ نے جامعہ کیمبرج میں اکتوبر 1787 میں داخلہ لیا۔ اس وقت گرچہ وہ بیحد خوش وخرم تھے لیکن کچھ ہی عرصے بعد جامعہ کے جامد ماحول سے بدظن ہونے لگے۔ درسی کتابوں میں ان کی دلچسپی کم تھی، دنیا کے شور میں ان کا دم گھٹتا تھا لہٰذا اس کے بیشتر اوقات تنہائی میں گزرنے لگے اور سکون قلب کے لیے فطرت کے خوبصورت نظاروں اور مظاہروں سے لطف وانبساط حاصل کرنے لگے۔ ورڈس ورتھ کو کتب بینی کا ذوق تھا۔ وہ آزاد پسند طبیعت کے مالک تھے اور اس وجہ سے وہ کسی خاص نصب العین یا قاعدے کے پابند نہیں رہ سکے لیکن ماضی کے شہ پاروں سے یقیناً کسب فیض کیا۔ ورڈس ورتھ کو شاعر فطرت بھی کہا جاتا ہے۔ رومانی تحریک کے دوران فطرت پرستی پر خاصا زور دکھائی دیتا ہے اور اس خیال کے زیر اثر ورڈس ورتھ نے جو خواب دیکھا تھا اس کا اندازہ اس کے کلام کے مطالعے سے لگایا جاسکتا ہے۔

ان کا مجموعۂ کلام لیریکل بیلڈس 1798 میں منظر عام پر آیا۔ اس مجموعے میں ان کے عزیز دوست ایس ٹی کولرج کی نظمیں بھی شامل ہیں۔ مذکورہ مجموعہ اور انیسویں صدی کی پہلی دہائی کے دیگر مجموعوں کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ انگریزی شاعری ایک نئے رخ پر گامزن ہے۔ ورڈس ورتھ نے بھی اپنے مجموعہ کلام میں ایک الگ زاویہ نظر اختیار کرتے ہوئے بہترین شاعری کا نمونہ پیش کیا۔ انھوں نے خارجی فطرت نگاری سے احتراز کرتے ہوئے داخلی حسن پر توجہ مرکوز کی۔ ورڈس ورتھ کو معمولی سے معمولی چیز میں بھی نئی شان اور نئے مطالب دکھائی دینے لگے، حیات و کائنات کی روحانی حیثیت ان پر بتدریج منکشف ہونے لگی۔ ورڈس ورتھ نے کئی مایہ ناز نظمیں تخلیق کی ہیں جن میں

The Prelude, Tintern Abbey, ode on Intimations of Immortality, The Solitary Reaper, The World Is Too Much with Us, My Heart Leaps Up, Lucy Gray, To a Butterfly, The Excursion, A slumber did my spirit seal, The Idiot Boy, Ode to Duty, Poor Susan, The Cuckoo

وغیرہ شاہکار کی حیثیت رکھتی ہیں۔ دی پریلیوڈ خود نوشت سوانح ہے جسے انہوں نے 28 سال کی عمر میں 1798 سے بغیر کسی عنوان کے لکھنا شروع کیا اور اپنی زندگی کے آخری ایام تک جاری رکھا۔ ورڈس ورتھ نے 23 مارچ 1850 میں زندگی کی آخری سانس لی۔ ان کی موت کے تین مہینے بعد ان کی شریک حیات میری ہچنسن کے طے کردہ عنوان 'دی پریلیوڈ ورڈ' کے نام سے یہ خودنوشت سوانح شائع ہوئی۔ مذکورہ بالا نظموں کا تجزیہ طوالت کا باعث ہوگا لہٰذا نظم 'کوئل' کے تجزیہ پر اکتفا کرتے ہوئے یہاں ورڈس ورتھ کے شاعرانہ تخیل کا اجمالی جائزہ مناسب ہوگا۔

'کوئل' ان کی ایک مشہور نظم ہے۔ اس نظم میں انھوں نے فطرت کو مختلف زاویے سے دیکھنے اور اس سے فرط و انبساط حاصل کرنے کی کوشش کی ہے۔ انھوں نے زندگی کی تلخ کامیوں کے باوجود فطرت سے عشق کو نظم کا جامہ پہنایا۔ ورڈس ورتھ اپنی رجائیت کے باعث فطرت کی شکستہ حالی اور تباہی کی صورت میں بھی حوصلہ رکھتے ہیں۔ وہ دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی چیز سے بھی مانوس نظر آتے ہیں اور اس میں حسن تلاش کرتے ہیں۔ انھیں مختلف وادیوں، صحرا، جھیلوں سے قلبی سکون حاصل ہوتا ہے۔

کوئل کی آواز سن کر شاعر کو بے انتہا خوشی ہوتی ہے۔ وہ اپنے مرغوب پرندے کی کوک میں خوشیوں کے راز دیکھتا ہے، اس کی آواز سن کر اسے اپنے بچپن کے خوشگوار لمحات یاد آنے لگتے ہیں۔ ورڈس ورتھ لڑکپن سے ہی کوئل کی دردآشنا آواز کے شیدائی تھے۔ وہ جب بھی سبزہ زار میں ہوتے تو کوئل کی آواز ان کے کانوں میں گونجنے لگتی اور وہ اپنے ماضی میں گم ہوجاتے۔ شاعر نے پرواز تخیل سے کام لیتے ہوئے اپنے جذبات و احساسات کی دنیا میں امن وسکون تلاش کرنے کی سعی کی ہے جس کے لیے وہ سرگرداں رہا ہے۔ اس دوران وہ دوسروں کی خوشی کا بھی متلاشی ہے۔ اسی نظم میں شاعر آگے کہتا ہے کہ تو آفتاب کی کرنوں سے منور اور پھولوں سے معطر وادیوں کے درمیان اگرچہ نغمہ خواں ہے لیکن مجھے حسین تصوراتی اور تخیلاتی ایام کا پیغام سنائی دیتا ہے۔ مجھے بچپن کی گھڑیاں اور بے پرواساعتوں کے خواب دکھائی دیتے ہیں۔ تو کوئی معمولی پرندہ نہیں بلکہ ایک ایسی ناپید ہستی ہے جس میں بہت سے راز پوشیدہ ہیں۔

ورڈس ورتھ کے کلام میں زندگی کے مختلف پہلوؤں کی ترجمانی کے دوش بدوش مظاہر اور مناظر فطرت کا بیان بہت ہی دلکش پیرایے میں نظر آتا ہے۔ انھوں نے فطرت کے مناظر کو صرف مناظر فطرت ہی کی طرح نہیں دیکھا بلکہ ان میں زندگی کی خوشی بھی تلاش کی ہے اور اسے فلسفیانہ انداز میں بیان کرنے کی سعی کی ہے۔ مظاہر حسن کے بعض ایسے پہلوؤں کی تلاش کی ہے جن میں عام لوگ آزادی سے سانس لیتے ہیں، جہاں کسی طرح کی کوئی قید نہیں۔ ان کا تخیل فطرت کے مناظر کو دیکھ کر رواں دواں ہوجاتا ہے اور ان کو اپنی شاعری میں جگہ دینے کے لیے مجبور ہوجاتے ہیں۔

کوئل کی دل فریب آواز سن کر شاعر کو اپنی طالب علمی کا زمانہ یاد آتا ہے۔ اس کی کوک میں اسے وہی نغمہ سنائی دیتا ہے جس کے باعث وہ جھاڑیوں، درختوں اور آسمانوں کی خاک چھانتا تھا اور تجسس کی نگاہ ڈالنے پر بار بار مجبور ہوتا ہے۔ اس جستجو میں صحراؤں اور سبزہ زاروں کی گشت کیا کرتا ہے۔ شاعر ایک امید اور کشش کا ہمیشہ متلاشی رہا جو اسے کہیں بھی حاصل نہیں ہوئی۔ شاعر کی زمانہ طفلی کی تمنا کبھی بھی پوری نہیں ہوئی۔ شاعر لاحاصل کوشش سے بخوبی واقف ہے لیکن اس کے باوجود پرندے کی سحرانگیز آواز سے محظوظ ہوتا ہے اور اپنے بچپن کے عہد زریں کو حاصل کرلیتا ہے۔

مذکورہ نظم میں ایک خاص فضا پائی جاتی ہے۔ اس میں فطرت کے دلچسپ اور رنگا رنگ مناظر و مظاہر کے مشاہدے کے باوجود تصوری اور تخیلی عناصر کا غلبہ نظر آتا ہے۔ ان اشعار میں صداقت اور خلوص کے عناصر دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے فطرت نگاری سے متعلق ورڈس ورتھ کی جدت ادا، زور بیان اور منظر نگاری کا پتہ چلتا ہے۔ ان میں ایک خاص حسن اور نغمگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے پرتکلف زبان پر عام بول چال کی زبان کو ترجیح دی اور انگریزی زبان کو عوامی بنادیا۔ ورڈس ورتھ فطری زندگی کے قائل تھے اس لیے جدید تہذیب کی مصنوعیت اور مادیت کی مخالفت کی نیز سماج کی اصلاح سے زیادہ فرد کی آزادی پر توجہ دی۔ مادہ پرستی کے باعث انسان اپنے اصل مقصد سے دور ہوجاتا ہے اور اس کی روحانی آزادی بھی سلب ہوجاتی ہے۔ ورڈس ورتھ نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے دنیا کی توجہ انسانیت کے اہم اور ضروری اصولوں کی طرف منعطف کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ انھوں نے خود کو انسان دوستی کا مصلح قرار دیا اور سیاسی، سماجی، ادبی بیا کی گویا ہر شعبہ ہائے زندگی میں آزادی کی صدا بلند کی۔

■

Mohd Jaleel
Village: Qaziahi
Madhubani - 847211 (Bihar)

فاصلاتی تعلیم

ہندوستان کے تناظر میں

ایس آر سبحانی

اکیسویں صدی کے اس زمانے میں، کسی بھی ملک کی نشوونما و ترقی میں تعلیم ایک انتہائی اہم کردار ادا کرتی ہے۔ سوامی وی ویکانند سے لے کر آج تک کئی دانشوروں کا ماننا ہے کہ تعلیم وہ منشور ہے جس کے ذریعہ کوئی بھی ملک ترقی کی چوٹیوں کو چھوسکتا ہے۔ یہ نہ صرف فرد کی ذاتی ترقی کا ذریعہ ہے بلکہ ایک ملک کی مجموعی ترقی بھی اسی میں پوشیدہ ہے۔ ہندوستان کی کل آبادی 120 کروڑ ہے، جس میں نوجوانوں کی تعداد 60 کروڑ ہے۔ ہندوستان کی خواندگی کی شرح 70.04% ہے اور بے شمار تعلیمی اداروں اور بہترین انفرااسٹرکچر کی موجودگی کے باوجود ہم مزید 30% کے حصول میں ناکام ہیں۔ اس کی وجہ شعور کی کمی، غربت وغیرہ ہیں۔ جو لوگ اپنی کم آمدنی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے فاصلاتی تعلیم ایک بہترین ذریعہ ہے۔ فاصلاتی تعلیم، وہ طریقہ تدریس ہے جس میں استاد اور طالب علم الگ الگ جگہ پر موجود ہوتے ہیں اور لچکدار تعلیمی ماحول کی ایک شکل تیار کی جاتی ہے۔ ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم میں اندراج روز بروز بڑھتا جارہا ہے۔ عالمی سطح کی تعلیم کی موجودگی میں، ہندوستان ایک اہم کردار ادا کررہا ہے۔

جدید تاریخ کے لحاظ سے فاصلاتی تعلیم کا سب سے پہلا کورس 1840 کے دہے میں سر آئزک پٹ مین کا آئیڈیا تھا جس نے ایک ایسے نظام کے بارے میں سوچا تھا جس میں شارٹ ہینڈ میں لکھے پوسٹ کارڈ طلبا کو بھیجے جاتے اور بعد میں طلبا کو ان سے حاصل کرکے انھیں درست کیا جاتا۔ طلبا کا فیڈ بیک، پٹ مین کے اس نظام کی سب سے اہم اختراع تھی۔ 1840 میں پورے انگلینڈ میں ڈاک کی یکساں قیمتیں نافذ کرکے اس اسکیم کو نافذ کرنے کا راستہ ہموار کیا گیا۔ یہ شروعات کافی کامیاب رہی اور ان کورسز کو رسمی طور پر چلانے کے لیے تین سال بعد فونوگراف فاصلاتی سوسائٹی کا قیام عمل میں لایا گیا۔ یونیورسٹی آف لندن وہ پہلی یونیورسٹی تھی جس نے 1858 میں اپنا بیرونی پروگرام قائم کرتے ہوئے فاصلاتی طور پر ڈگریاں دینا شروع کیں۔ اس اختراع کا پس منظر اس حقیقت میں پوشیدہ ہے کہ یہ ادارہ (جسے بعد میں یونیورسٹی کالج لندن کا نام دیا گیا) غیر جانبدار تھا جیسا کہ اس وقت کی سخت مذہبی چپقلش کے پیش نظر یونیورسٹی کی مخالفت کی جارہی تھی۔

ہندوستان میں حکومت ہند نے ایسے طلبا کے لیے جو ریگولر کورسز میں داخلہ نہیں لے سکتے، ہندوستانی یونیورسٹیوں میں متبادل کورسز میں داخلے کے لیے کونسل برائے فاصلاتی تعلیم کی شروعات کی۔ فاصلاتی تعلیم کی بنیادیں مواصلاتی (Correspondent) تعلیم میں پوشیدہ ہیں جس کی شروعات عوامی شعبوں (Public Sector) میں روایتی یونیورسٹیوں نے کی تھی۔ حکومت ہند نے 1985 میں موقر اندرا گاندھی نیشنل اوپن یونیورسٹی (اگنو) کی شروعات کی جو طلبا کو ڈگریوں سے نوازتی ہے اور یہ ڈگریاں کسی بھی دیگر مسلمہ فاصلاتی تعلیمی کورس کی طرح جاب مارکیٹ میں مسلمہ ہیں۔ اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ سطح پر فاصلاتی تعلیم کے کورسز کی تعداد کے معاملے میں ہندوستانی یونیورسٹیاں سب سے اوپر ہیں۔ اب ہندوستان کی بیشتر یونیورسٹیاں فاصلاتی تعلیمی پروگرام چلاتی ہیں جن میں کئی متنوع کورسز کروائے جاتے ہیں۔

اب فاصلاتی تعلیم میں کسی کورس کے انتخاب و تکمیل میں کوئی رکاوٹ نہیں رہا جیسا کہ بیشتر یونیورسٹیوں کے تعلیمی اور امتحانی مراکز کئی شہروں میں واقع ہیں۔ ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم میں تیزی سے اضافہ ہورہا ہے۔ ہندوستان میں دوسو سے زیادہ فاصلاتی تعلیمی مراکز ہیں جو آرٹس، ہیومینیٹیز، قانون، مینجمنٹ، سائنس، انجینئرنگ وغیرہ کے کورسز فراہم کررہے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ فاصلاتی تعلیم میں طلبا کی تعداد، ریگولر یونیورسٹیوں میں داخلہ لینے والے طلبا کی تعداد سے زیادہ ہے۔ کیونکہ کہ فاصلاتی تعلیم ہر اس طالب علم کو پلیٹ فارم فراہم کرتی ہے جو اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا ہے۔ برسر روزگار مرد و خواتین، گھریلو خواتین، اپنے کمزور معاشی پس منظر کی وجہ سے محنت مزدوری کرنے والے، ہر ایک کو اس تعلیمی نظام سے فائدہ ہورہا ہے جسے فاصلاتی تعلیم کہا جاتا ہے۔ ان کورسز کی فیس کسی بھی دیگر تعلیمی ادارے کے مقابلے بہت ہی کم ہے جس سے محروم طبقہ انڈر گریجویٹ اور پوسٹ

گریجویٹ کورسز کی تکمیل کی جانب راغب ہوتا ہے۔

موجودہ صورت حال میں الکٹرانکس آلات کے انقلاب کے بعد ایک نیا نظام متعارف ہوا ہے جسے انفارمیشن کمیونکیشن ٹکنالوجی (آئی سی ٹی) اور ای۔لرننگ کہا جاتا ہے جہاں طالب علم کو مواد کے حصول اور فیس کی ادائیگی کے لیے کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ہر چیز متعلقہ فاصلاتی تعلیمی مرکز کی ویب سائٹ کے ذریعے طلبا کو مہیا کی جاتی ہے۔ ہندوستان سب سے بڑی جمہوریت ہے، اس کی آبادی پوری دنیا کی آبادی کا 17% ہے جس میں قابل ذکر تنوع پایا جاتا ہے۔ ہندوستان کی اکثریت دیہی علاقوں میں رہتی ہے جو مکمل طور پر زراعت اور اس سے وابستہ پیشوں پر منحصر ہیں۔ یہاں پر شعور و بیداری کی کمی اور اچھے تعلیمی ادارے نہ ہونے کی بنا پر نوجوانوں کے پاس نہ تو ہنر ہے اور نہ روزگار۔ ایسی صورتحال میں فاصلاتی تعلیم بے حد اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ہندوستان دنیا کے سب سے بڑے تعلیمی نظاموں میں سے ایک ہے۔ ایک عام ہندوستانی طالب علم کو ابتدائی اسکول بھیجا جاتا ہے یعنی پانچ سال کی عمر میں اسے رسمی تعلیم دی جاتی ہے۔ اعلیٰ تعلیم کی صورتحال دیہی علاقوں میں حیرت انگیز حد تک مختلف ہے جہاں عوام یا نوجوان آبادی اپنی تعلیم سیکنڈری جماعت یعنی دسویں جماعت میں ہی ترک کردیتے ہیں۔ اپنے کمزور معاشی پس منظر کی بنا پر انہیں ملازمت کے حصول کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے۔ ایسی صورتحال میں فاصلاتی تعلیم ایک منفرد کردار ادا کرتی ہے۔

فاصلاتی تعلیم وہ تعلیم ہے جہاں ایک طالب علم اور استاد ایک دوسرے سے فاصلے پر ہوتے ہیں اور مہینے میں ایک دو یا تین مرتبہ ایک دوسرے سے ربط قائم کرتے ہیں۔ داخلہ لینے والے طلبا کے لیے ہفتہ میں ایک مرتبہ کلاس منعقد کی جاتی ہے۔ ڈگری کے مضمون کا مواد طلبا کو کورس میں داخلے کے وقت دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد یہ طلبا کی ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ متعلقہ فاصلاتی تعلیمی مرکز سے رابطہ رکھیں اور ساتھ ہی انتظامیہ کی یہ ذمہ داری ہوتی ہے کہ وہ کلاس کے مقام اور وقت کے علاوہ امتحانات کی تواریخ سے آگاہ کرتے رہیں۔ لیکن اکیسویں صدی کے اس زمانے میں طلبا اور اساتذہ تعلیم کی تکمیل کے لیے ٹکنالوجی جیسے سٹلائیٹ، ٹیلی فون، ریڈیو، ای-میل کے ذریعہ ایک دوسرے سے رابطہ میں رہیں۔ اٹھارویں صدی کی ابتدا سے لے کر آج تک تعلیم نے ایسے طلبا تک پہنچنے کے لیے جو مختلف حالات کی بنا پر دوبدو تعلیم حاصل نہیں کرسکتے، تدریس کے اس طریقۂ کار کو استعمال کیا ہے۔ فاصلاتی تعلیم کو شروع ہوئے 200 سال سے زیادہ کا عرصہ ہوگیا ہے۔ تاریخ کہتی ہے کہ فاصلاتی تعلیم پہلے ایک مواصلاتی کورس کی صورت میں شروع ہوئی اور بعد میں اس طرز تعلیم میں سدھار آتا رہا۔

فاصلاتی تعلیم میں داخلہ لینے والوں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ ہوا ہے۔ اپنی شروعات کے بعد اس نے پیچھے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ فاصلاتی تعلیمی پروگراموں کے تحت کئی انڈر گریجویٹ اور پوسٹ گریجویٹ کورسز شروع کیے گئے۔ فاصلاتی تعلیم کے میدان میں تیزی سے اضافہ کے بعد اس کی سرگرمیوں اور پروگراموں کی نگرانی کے لیے 1985 میں ایک کونسل، فاصلاتی تعلیم بیورو کا قیام عمل میں آیا۔ ہندوستان میں اوپن اور فاصلاتی تعلیمی نظام سوسائٹی کے مختلف طبقات کو تعلیم فراہم کرنے کے ایک اہم وسیلے کے طور پر ابھرا۔ اس کے علاوہ اوپن تعلیمی نظام (ODL) میں پچھلے چھ دہائیوں میں ہونے والی تبدیلیاں بھی حوصلہ افزا رہی ہیں۔ آئی سی ٹی کے پھیلاؤ کے بعد سے کلاس روم یا کیمپس کی حدود دھندلی ہورہی ہیں۔ جیسا کہ کہا جارہا ہے زمانے اور فاصلے کی سرحدیں مٹ چکی ہیں۔ ملک میں اوپن تعلیمی نظام کے اداروں کی بڑھتی تعداد اس حقیقت کی گواہ ہے۔ آٹھویں پلان کی مدت میں واحد طریقہ تعلیم (Single Mode) اوپن یونیورسٹیوں کی تعداد 4 تھی جو دسویں پلان کی مدت میں بڑھ کر 14 ہوگئی۔

فاصلاتی طریقے سے تعلیم فراہم کرنے والی دوہرے طریقہ تعلیم (Dual Mode Universities) والی یونیورسٹیوں کی تعداد 200 تک پہنچ گئی ہے۔ یہ اس حقیقت کی وجہ سے ہے کہ دوبدو تعلیم کے انفرااسٹرکچر میں اضافہ ہوا ہے۔ فی الحال ملک میں اعلیٰ تعلیم کے 52% طلبا، او ڈی ایل سسٹم سے تعلیم حاصل کررہے ہیں۔ پچھلے چھ دہوں میں اوپن تعلیمی نظام نے اعلیٰ تعلیم میں توسیع اور تنوع کے معاملے میں حیرت انگیز ترقی کی ہے۔ 1962 میں ایک واحد ادارے سے لے کر اوپن تعلیمی نظام کے اداروں کی تعداد اب تقریباً 250 تک پہنچ چکی ہے جن میں مرکزی، ریاستی، نیم اور خانگی یونیورسٹیاں اور مخصوص ادارے شامل ہیں۔

آج کل دو اصطلاحات تقریباً ایک دوسرے کی جگہ استعمال کی جارہی ہیں وہ ہیں 'اوپن لرننگ اور فاصلاتی تعلیم' اور ان دونوں کو ملا کر اکثر اوپن اور فاصلاتی تعلیم (ODL) کہا جاتا ہے۔ اوپن لرننگ ایک فلسفہ ہے اور فاصلاتی تعلیم اسے حقیقت میں بدلنے کا ایک ذریعہ ہے جیسا کہ دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہیں۔

فاصلاتی تعلیم ایک وسیع اصطلاح ہے جو اس تمام تدریسی و اکتسابی نظم کو ظاہر کرتی ہے جس میں طالبعلم اور استاد زمانی اور مکانی لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ ہوتے ہیں۔ دراصل یہ ان طالب علموں کو تعلیم و تدریس فراہم کرنے کا ایک ذریعہ ہے جو جسمانی طور پر روایتی کلاس روم میں موجود نہ ہوں۔ خصوصی طور پر تیار شدہ مواد (خود اکتسابی تدریسی مواد) نصاب کی ترسیل کو موثر بناتا ہے جو کہ مختلف ذرائع جیسے پرنٹ، ٹیلی ویژن، ریڈیو، سٹلائیٹ، آڈیو/ ویڈیو ٹیپ، سی ڈی روم، انٹرنیٹ اور ورلڈ وائڈ ویب وغیرہ کے ذریعہ طلبا کی دہلیز تک پہنچایا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ٹکنالوجی پر مبنی ذرائع، استاد اور طلبا کے درمیان روایتی کلاس روم میں ہونے والی ذاتی ترسیل کا بدل ثابت ہوتے ہیں۔ ادارہ، استاد اور طلبا کے درمیان ترسیل و رابطہ الکٹرانک میڈیا (ٹیلی فون، انٹرایکٹیو ریڈیو کونسلنگ، ٹیلی کانفرنسنگ، ویڈیو کانفرنسنگ، چیٹ سیشن، ای میل، ویب سائٹ) وغیرہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

علمی معاشرے کی ایک بڑی ضرورت یعنی مجموعی اندراجی تناسب کو بڑھانے اور اعلیٰ تعلیم میں جمہوریت لانے سے لے کر ہندوستانی آبادی کے بڑے حصے بالخصوص نارسا ؤں تک پہنچنے اور تاحیات تعلیم کے تقاضوں سے نمٹنے تک میں اپنے اہم کردار کی بنا پر اوپن اور فاصلاتی تعلیم ہندوستانی اعلیٰ تعلیم کے نظام میں ایک خصوصی مقام رکھتا ہے۔

فاصلاتی تعلیم کے اہم مقاصد ہیں:

- آبادی کے بڑے حصے بالخصوص محروم طبقات جیسے دور دراز اور دیہی علاقوں میں رہنے والے، محنت مزدوری کرنے والے افراد، خواتین وغیرہ کے لیے اعلیٰ تعلیم کو جمہوری بنانا۔
- یونیورسٹی سطح کی تعلیم کا ایسا اختراعی نظام فراہم کرنا جو اکتسابی رفتار، کورسز کے امتزاج، داخلے کی اہلیت، داخلے کی عمر، امتحانات کے انعقاد اور تعلیمی پروگراموں کے نفاذ کے معاملے میں لچکدار اور کھلا ہو۔
- مہارتوں اور لیاقتوں کو بڑھانے کا ایک موقع فراہم کرنا اور
- تعلیم کو ایک تاحیات سرگرمی کے طور پر فروغ دینا تاکہ افراد کو اپنے علم کی تجدید کرنے یا نئے میدانوں میں علم کے حصول کے قابل بنایا جاسکے۔

ہندوستان میں فاصلاتی تعلیم کا بہت بڑا نیٹ ورک پایا جاتا ہے جو کہ چین کے بعد دوسرے نمبر پر آتا ہے۔ آج تین طرح کے ادارے کام کررہے ہیں:

زبان و تعلیم

1 قومی اوپن یونیورسٹی
2 ریاستی اوپن یونیورسٹیاں
3 فاصلاتی تعلیمی ادارے

ای لرننگ کے ذریعہ فاصلاتی تعلیم:

ایک ایسی تعلیم جو رسمی تعلیم پر مبنی ہو تاہم وہ الکٹرانک وسائل کی مدد سے فراہم کی جائے ، ای لرننگ کہلاتی ہے۔ جہاں ، تدریس کلاس روم کے اندر یا باہر دی جاسکتی ہے کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا استعمال ای لرننگ کا اہم جز تشکیل دیتا ہے۔ ای لرننگ کو ایک ایسا نیٹ ورک بھی کہا جاسکتا ہے جو مہارتوں اور علم کی منتقلی کے قابل بناتا ہے اور ایک ہی یا مختلف اوقات میں بے شمار طلبا کو تعلیم فراہم کی جاتی ہے۔ شروع میں اسے خوش دلی سے قبول نہیں کیا گیا جیسا کہ یہ سمجھ لیا گیا کہ اس سسٹم میں تعلیم کیلیے درکار انسانی عنصر ناپید ہے۔ تاہم ٹکنالوجی میں تیزی سے ترقی اور تعلیمی نظام میں پیشرفت کے ساتھ اسے بڑے پیمانے پر قبول عام حاصل ہو رہا ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ کمپیوٹر کا تعارف اس انقلاب کی بنیاد تھی جیسا کہ ہم اسمارٹ فون اور ٹیبلیٹ وغیرہ کے عادی ہو چکے ہیں اور اب یہ آلات تعلیم کے لیے کافی اہم بن چکے ہیں۔ اب کتابوں کی جگہ بتدریج الکٹرانک مواد جیسے آپٹیکل ڈسک اور پین ڈرائیو لے رہے ہیں۔ علم کو انٹرنیٹ کے ذریعہ بھی شیئر کیا جاسکتا ہے جو کہ کسی بھی جگہ سے اور کسی بھی وقت 24/7 دستیاب ہے۔

ای لرننگ ، کارپوریٹ سیکٹر میں ایک اچھا ذریعہ ثابت ہوا ہے بالخصوص جہاں کثیر القومی کمپنیاں ، دنیا بھر میں پھیلے پروفیشنل افراد کے لیے ترجیحی پروگرام منعقد کرتی ہیں اور ملازمین ایک بورڈ روم میں بیٹھے ، یا سیمینار کے ذریعے ، جو کہ ایک چھت تلے ایک یا مختلف تنظیموں کے ملازمین کے لیے منعقد کیے جاتے ہیں ، اہم مہارتوں کے حصول کے قابل ہوتے ہیں۔ ای لرننگ ٹکنالوجی استعمال کرنے والے اسکول ان روایتی اسکولوں سے ایک قدم آگے ہیں جو ابھی تک روایتی طریقہ تدریس اپنائے ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کتابوں اور لکچرز کی مدد سے دی جانے والی غیر الکٹرانک تعلیمی شکل کو آگے لے جانے کی بھی اتنی ہی ضرورت ہے تاہم ٹکنالوجی پر مبنی تعلیم کی اثر پذیری اور اہمیت کو یکسر نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ یہ مانا جاتا ہے کہ انسانی دماغ متحرک تصاویر یا ویڈیوز کے ذریعہ دیکھی گئی اور سنی گئی چیزوں کو آسانی سے یاد رکھتا اور جوڑتا ہے۔ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ بصری تصاویر (Visuals) نہ صرف طلبا کی توجہ برقرار رکھتے ہیں بلکہ ساتھ ہی یہ دماغ میں زیادہ عرصہ تک محفوظ رہتے ہیں۔

ای لرننگ کی اہمیت روز بروز بڑھتی جارہی ہے اور اس نے مجازی (Virtual) تعلیمی ماحول کو جنم دیا ہے اور یہ اس قسم کی تعلیم کی فراہمی کا ایک معروف طریقہ بن چکا ہے۔ ان میں ویب اور تختہ سیاہ سے لے کر مقامی نظام شامل ہیں جنھیں اداروں کے افراد نے اپنی مخصوص ضروریات کے تحت تیار کیا۔ مجازی (Virtual) کلاس روم کو حال ہی میں اس قسم کی تعلیم میں شامل کیا گیا۔ یہ بالعموم یا تو کمپیوٹر گروپس پر یا پھر سب سے اہم ورلڈ وائڈ ویب (WWW) کے ذریعہ انٹرنیٹ پر مبنی ہوتا ہے۔ طلبا کورس تک رسائی کے لیے اپنے پاس موجود ایک کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہیں۔ ایک مرتبہ لاگ ان کرنے کے بعد وہ مختلف کام انجام دے سکتے ہیں جیسے کورس مواد ڈاؤن لوڈ کرنا ، ویڈیو اور آڈیو مواد کا حصول تاکہ تدریس فراہم کی جاسکے۔ کلاس کو ہم آہنگ (Synchronous) یا غیر ہم آہنگ (Asynchronous) فارمیٹ میں لایا جاسکتا ہے۔ یہ ترسیل ویڈیو/آڈیو ریکارڈ شدہ مواد ، آن لائن ٹسٹنگ سافٹ ویئر ، ویب پر مبنی معلومات کے ذرائع ٹیلی فون کمیونکیشن کے ساتھ انجام پاتی ہے اور راست رابطہ کے بنا تعلیم فراہم کرنے کے قابل ہے۔

(Virtual) مجازی یونیورسٹی میں تمام معلومات محفوظ ہوتی ہیں ، ویب پر مبنی کورسز/ابواب/صفحات کی شکل میں منظم ہوتی ہیں اور ایک فاصلہ سے ڈیجیٹل شکل میں فراہم کی جاتی ہیں۔ اس ماحول میں مسلسل تفویضات اور امتحانات یا تو گروپ کے ذریعہ آن لائن ہوتے ہیں یا پھر طلبا کی نگرانی ، نظم اور ٹریکنگ کے ذریعہ ہوتے ہیں جسے آن لائن مدد اور ڈیجیٹل لائبریری سے تقویت فراہم کی جاتی ہے۔ ہندوستان ایک بہترین انفرااسٹرکچر والا ملک ہے بالخصوص اعلیٰ تعلیم کے معاملے میں جہاں 13500 سے زائد کالجز اور 250 سے زیادہ یونیورسٹیاں موجود ہیں۔ اتنے وسیع تعلیمی نظام سے نمٹنے کے لیے ہمیں ایک ویب پر مبنی ای لرننگ سسٹم کی ضرورت ہوتی ہے۔

دستور ہند نے تعلیم کو ملک کے ہر شہری کا بنیادی حق قرار دیا ہے۔ اس کے باوجود تعلیم تک رسائی اور معیاری تعلیم کا حصول خال خال نظر آتا ہے۔ حق تعلیم اور ابھی تک حاصل نہ ہونے والے معیار تعلیم کے تصور کو ای لرننگ کے ذریعہ حاصل کیا جاسکتا ہے۔ عوام کی ماہرانہ اور پیشہ ورانہ ٹریننگ میں بھی اس کا کردار کافی اہم ہے۔ بڑے پیمانے پر صنعتی افرادی قوت کی تشکیل کرنا ایک بڑا چیلنج ہے جسے تعلیم فراہم کرنے کے اس نئے نظام سے پورا کیا جاسکتا ہے۔ حالیہ عرصہ میں ، حکومت ہند نے اس میں بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کی ہے اور تمام شہریوں کو معیاری تعلیم فراہم کرنے اور نئی نئی ٹکنالوجیوں کو فروغ دینے کی قابل لحاظ کاوشیں کی ہیں۔

ہندوستان پہلے ہی 4G پر مبنی وائرلیس براڈ بینڈ لانچ کر چکا ہے اور ٹیلی ڈینسٹی تیزی سے بڑھ رہی ہے۔ حکومت ہند نے ای لرننگ کی ایک اہم میدان کے طور پر نشاندہی کی ہے۔ وزارت تعلیم ، حکومت ہند نے تکنیکی اداروں میں نئے کورسز کی شروعات کی اجازت دیتے ہوئے اور آئی ٹی انڈسٹریز کو مراعات فراہم کرتے ہوئے اہم اقدامات کیے ہیں۔ شعبہ انفارمیشن ٹکنالوجی (DIT) ملک میں انفارمیشن ٹکنالوجی اور الکٹرانکس کی ترقی و فروغ کا باعث بن رہا ہے۔ ای لرننگ پروگرام کا سب سے اہم مقصد ای لرننگ طریقہ کار اور روایتی تعلیمی نظام کو موثر طریقہ سے مربوط کرنا ہے تاکہ روایتی تعلیمی نظام کے فوائد میں اضافہ کیا جاسکے ، اس کی رسائی کو زیادہ سے زیادہ طلبا تک بڑھایا جاسکے اور ای لرننگ کو آئی ٹی سے متعلقہ مضامین کی تدریس سے دیگر مضامین کی تدریس تک پھیلایا جاسکے۔ آئی ٹی پر قومی ٹاسک فورس اور دسویں پلان ورکنگ گروپ کی جانب سے سفارش کے بعد آئی ٹی شعبے نے ای لرننگ کے میدان میں تعلیمی اور تحقیقی اداروں کو فروغ دینے والے منصوبے تیار کیے ہیں۔

ای لرننگ کو فروغ دینے والے کئی سرکاری اقدامات کیے گئے ہیں۔ ابتدا میں شعبہ انفارمیشن ٹکنالوجی (DIT) کی جانب سے آٹھ پراجکٹس کو امداد دی گئی۔ (آئی ٹی میں ایچ آر ڈی پر ٹاسک فورس کی تیاری کو ملاحظہ فرمائیں۔) ذیل میں ای لرننگ کو فروغ دینے والے چند اقدامات حسب ذیل ہیں جن سے بھی استفادہ کرسکتے ہیں:

1 مجازی (virtual) لیبس
2 استاد سے بات کریں
3 بول چال ٹیوٹوریل
4 ڈیجیٹل لائبریری بذریعہ انفلبنیٹ
5 Quantum-Nano CentreFina
6 ای آر پی مشن بری باپتی
7 ای-کلپ
8 مربوط قومی علمی نیٹ ورک (INKN)

■

Dr. S.R. Subhani
Associate Professor
Directorate of Distance Education
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli, Hyderabad-500032 (Telangana)
Mobile: 9848773538
E-mail: drssrabbe@gmail.com

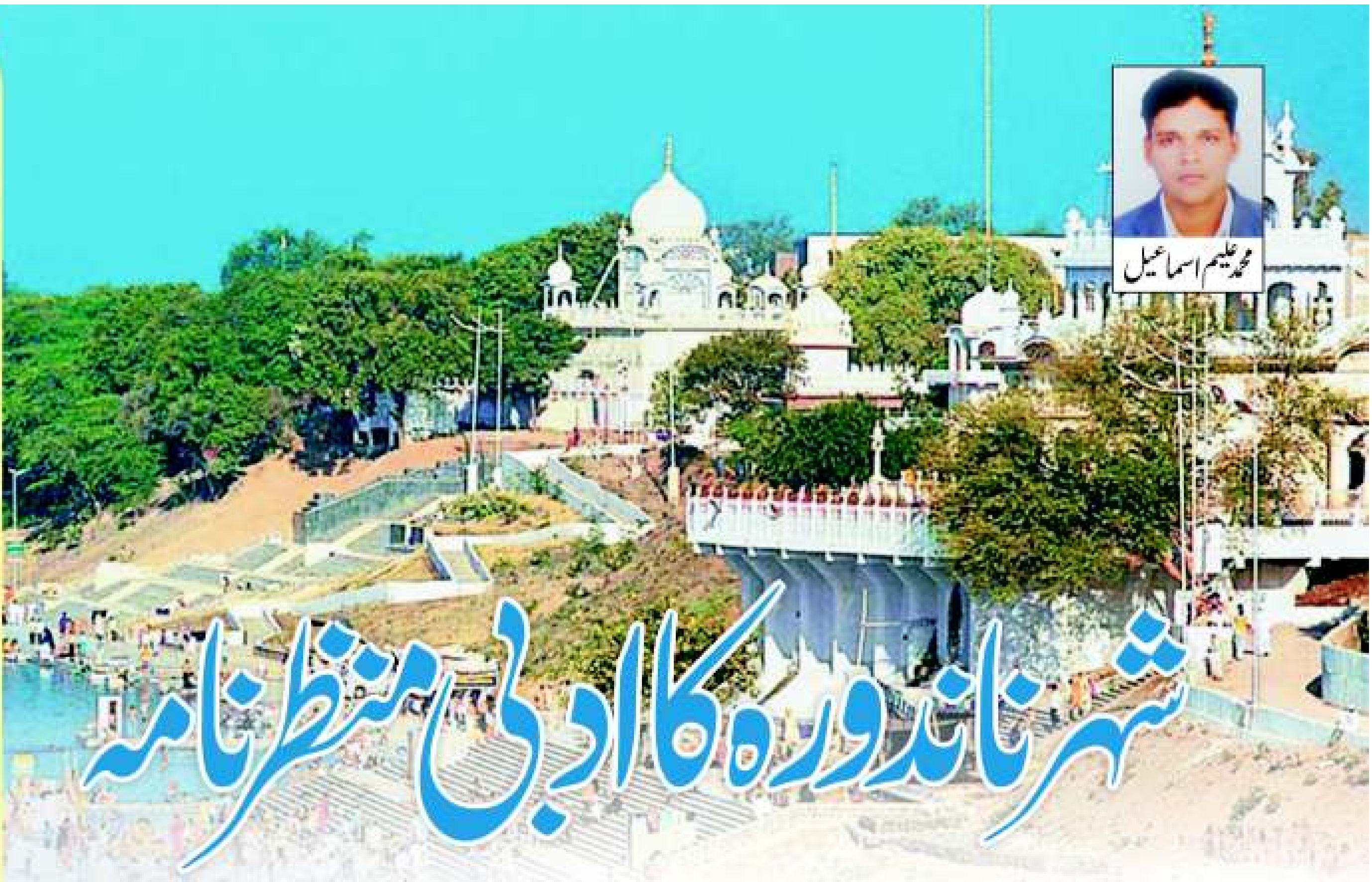

محمد علیم اسماعیل

شہر ناندورہ کا ادبی منظر نامہ

اردو زبان کی خدمت میں ضلع بلڈانہ کے شہر ناندورہ نے 'پھول نہ پھول کی پنکھڑی' کے مصداق اپنی خدمات انجام دی ہیں۔ یہاں چاروں طرف مراٹھی زبان کا غلبہ ہونے کے باوجود ہر دور میں اردو زبان و ادب کی شمع جلانے والے پیدا ہوئے ہیں۔ جن میں زیادہ تر شاعروں و ادیبوں کا تعلق متوسط طبقے سے رہا ہے۔

ناندورہ دو جڑواں شہر ہیں۔ ناندورہ (بزرگ) اور ناندورہ (خورد)، حالانکہ ناندورہ (خورد) سرکاری طور پر ناندورہ (بزرگ) کا ہی حصہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ دونوں شہروں کو گیان گنگا ندی جدا کرتی ہے۔ دراصل شہر ناندورہ 5 دیہات سے مل کر تشکیل پاتا ہے۔ جن کے نام احمد پور، محمد پور، خداوند پور، رسول پور اور پیٹھ ہیں۔ یہاں ہنومان کا 105 فٹ لمبا مجسمہ موجود ہے۔ جو ایک تاریخی حیثیت کا حامل ہے۔

بودھیسٹ ناول 'مہا گووند سوتنت' کے مطابق، ناندورہ قدیم زمانے میں قائم ہوا تھا۔ یہ 'اسا ک' بادشاہی (قدیم ہندوستان کی 16 سلطنتوں 'مہاجن پد' میں سے ایک CB2600) کا دارالحکومت تھا۔ اس وقت ناندورہ کو 'پوتن' کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ آئین اکبری کے مطابق، ناندورہ قرون وسطی کے دور میں گلشن بیرار کا لازمی جزو تھا۔ اس شہر پر اور یہاں کی عوام کے دلوں پر مہاراشٹر کے متعدد حکمرانوں اور سنتوں نے راج کیا۔ ناندورہ کی تاریخ میں پیشوا سے مختلف روابط پائے جاتے ہیں۔ یہ شہر سنہ 1800 کے آخر تک دکن کی نظام حکومت کے حکمراں نواب امیر اللہ خان کی ریاست میں شامل تھا۔ جب انگریزوں نے ہندوستان پر حملہ کیا تو نواب کی حکمرانی ختم ہو گئی۔ ناندورہ پہلے ضلع اکولا کے دائرہ اختیار میں تھا۔ اگست 1905 کے بعد یہ ضلع بلڈانہ کا حصہ بن گیا۔

اس شہر کو اولیاءِ کرام نے اپنے حصار میں لے رکھا ہے۔ یہاں حضرت غیبی شاہ، حضرت صوفی شاہ، حضرت عنایت اللہ صابری چشتی قادری، حضرت سید سادات، حضرت سید بدیع الدین زندہ شاہ مدار اور حضرت مردان شاہ کے مزار شریف موجود ہیں۔ مذکورہ تمام مزارات کو تمام مذاہب کے ماننے والے احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ تمام مزارات شہر کے شمال، جنوب مشرقی، مغرب اور وسط میں پھیلے ہوئے ہیں۔

نیشنل ہائی وے نمبر 6 اور ممبئی-کولکاتا ریلوے لائن ناندورہ سے ہو کر گزرتی ہے۔ شہر کی کل آبادی 45 ہزار ہے، جس میں 12 ہزار مسلم آبادی ہے۔ شہر میں 8 ایسے تعلیمی ادارے ہیں، جہاں بارہویں جماعت تک اردو زبان میں تعلیم حاصل کرنے کی سہولت دستیاب ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ دو سینئر کالجز بھی ہیں، جہاں اختیاری مضمون کے طور پر اُردو دستیاب ہے۔

ادبی لحاظ سے ناندورہ ایک غیر معروف شہر ہے۔ لیکن ان دنوں یہاں کی ادبی سرگرمیوں نے عام و خاص کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی ہے۔ ملکی سطح پر ادب سے تعلق رکھنے والے حضرات متاثر ہوئے ہیں۔ شاعری کے لیے شہر کی سرزمین کافی زرخیز رہی ہے۔ گزرے ہوئے زمانے میں یہاں سے میدانِ شعر وسخن میں، بسم اللہ خاں بسمل (حضرت داغ دہلوی کے شاگرد)، عباس خاں عباس، ساحر ادیبی، بسم اللہ خاں نیرنگ ناندوروی، ہرجس رائے جگر، قاسم یاس، سرور قریشی، الطاف حسین نشتر، ڈاکٹر رشید خاں شاد، بڈھن خاں عاصی اور اسد ناندوروی کے نام ملتے ہیں۔ آج بھی شہر میں تقریباً 15 شعرا میدانِ شعر وسخن میں طبع آزمائی کر رہے ہیں، جس میں ظفر ثاقب، قدرت ناظم، محمد ثقلین انجم، ایاز الدین اشہر، وسیم زاہد، احمد کاشف، اعجاز پروانہ، حسنین ساحل، سید اسمٰعیل گوہر، راحیل ابن انجم، نفیس احمد نفیس، متین طالب، اظہر عاطف اور وسیم انداز کے نام اہم ہیں۔ بات اگر نثر نگاری کی کی جائے تو حمید ادیبی ناندوروی، محمد شفیع قریشی، غنی غازی، ایاز الدین اشہر، قمر الزماں قمر، اعجاز پروانہ اور راقم الحروف کے نام لیے جا سکتے ہیں، جو باقاعدگی سے نثر لکھتے رہے ہیں۔

شاعری:

چند شعرا کا مختصر جائزہ پیشِ خدمت ہے۔

نیرنگ ناندوروی:

اصل نام بسم اللہ خاں اور تخلص نیرنگ کرتے تھے۔ 30 نومبر 1910 کو جاموہ (ضلع بلڈانہ) میں پیدا ہوئے۔ مراٹھی زبان میں تعلیم حاصل کی۔ ناندورہ نگر پریشد میں کلرک کے عہدے پر فائز ہوئے۔ سبکدوش ہونے کے بعد ناسک منتقل ہو گئے تھے۔ جب وہ ناسک جا رہے تھے تب ناندورہ میں 'جشنِ نیرنگ ناندوروی' منایا گیا تھا۔ 8 جولائی 1995 کو ناسک میں انتقال ہوا، اور وہیں پر سپردِ خاک ہوئے۔ انھوں نے اردو زبان کی باقاعدہ تعلیم

حاصل نہیں کی تھی اس کے باوجود ان کی شعری صلاحیت اور اردو زبان پر قدرت دیکھ کر لوگ رشک کرتے تھے۔ ان کی شاعری کے موضوعات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ان کے یہاں حسن وعشق کا بے باکانہ اظہار، شوخی و ظرافت اور زندگی و موت کا فلسفہ بھی ملتا ہے۔ ان کی شاعری میں منظرکشی نمایاں خصوصیات رکھتی ہے۔ شگفتگی، فصاحت وروانی ان کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔

نمونہ کلام

سہانا سماں ہے سہانی گھڑی ہے
خوشی کے سبب زندگی جھومتی ہے
یہی ہر طرف سے صدا گونجتی ہے
یہاں 'جشن نیرنگ ناندوروی' ہے

عبدالقادر راز:

عبدالقادر راز کی شاعری عام وخاص طبقے کو متاثر کرتی ہے۔وہ 1911 میں جلگاؤں جامود (ضلع بلڈانہ) میں پیدا ہوئے، اور 1991 کو کئی راز اپنے سینے میں دفن کیے اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ وہ نہایت ہی سادگی پسند اور شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ ان کی شاعری فطری، زبان سلیس اور رواں تھی۔ اعجاز پروانہ اپنے مضمون 'رازوں کے رازداں: عبدالقادر راز ناندوروی' میں لکھتے ہیں: ''راز صاحب کی شاعری میں عام آدمی کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ وقت کی دھوپ کی تپش محسوس ہوتی ہے اور زندگی کا جوار بھاٹا نظر آتا ہے۔''

(مطبوعہ: روز نامہ اردو ٹائمز ممبئی 14 مارچ 2010)

قدرت ناظم:

نام قدرت اللہ خاں، تخلص ناظم اور قلمی نام قدرت ناظم ہے۔ ولادت شہر ناندورہ کے ایک دیہات بدنیرہ میں 15 دسمبر 1950 کو ہوئی۔ شاعری کی ابتدا طالب علمی کے زمانے میں 18 برس سے ہوئی۔ 1968 میں CRPF میں بھرتی ہوئے لیکن جب اس کام کو مزاج کے خلاف پایا تو جلد ہی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ تلاش معاش کے سلسلے میں کچھ برس پونہ میں بھی رہے۔ پھر جلد ہی ناندورہ آگئے اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ رعب دار شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ اپنی شاعری کی طلسماتی دنیا میں قارئین اور سامعین کو جکڑ لینے اور اپنے الفاظ و اسلوب سے کائنات کے پوشیدہ راز کھولنے کا ہنر جانتے ہیں۔ قدرت ناظم کا شمار ودربھ کے معتبر شاعروں میں ہوتا ہے۔ بنیادی طور پر وہ غزل کے شاعر ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے شاعری کی مختلف اصناف آزاد غزل، رباعی، مثلیث، ہائیکو، ماہیے اور دوہے میں بھی طبع آزمائی کی ہے۔ وہ چھوٹی بحروں میں غزل کہتے ہیں جس کی بلندی اور دل کشی بے ساختہ داد دینے پر مجبور کر دیتی ہیں۔قدرت ناظم کی شاعری روایت وجدیدیت کا امتزاج ہے۔ جذباتیت اور فطری لطافت نے ان کے کلام کو پر اثر بنا دیا ہے۔قدرت ناظم کو زبان پر مہارت حاصل ہے۔زبان و بیان کی باریکیوں کو وہ بخوبی سمجھتے ہیں۔ خدا نے انھیں شاعری کی بھرپور صلاحیتوں سے نوازا ہے۔ وہ عہد حاضر کے واقعات کو نہایت ہی مہارت سے شعری پیکر عطا کرتے ہیں۔ان کی شاعری میں سماجی مسائل کی عکاسی ہے تو ستم گر زمانے کی شکایتیں بھی۔ زندگی کی مسرتوں کا تذکرہ ہے تو ناہمواریوں کی تصویر کشی بھی۔ غم روزگار کی تلخی ہے تو ہجر 'وصال اور حسن' عشق کی چاشنی بھی۔ جس کی رواں لہروں کے ساتھ سامعین وقارئین ڈوبتے ابھرتے بہتے چلے جاتے ہیں۔ان کی شاعری فکر واحساس کی جلوہ گاہ معلوم ہوتی ہے۔

نمونہ کلام

غزل کے اشعار

جنھیں آداب محفل تک نہیں معلوم ہیں ناظم
کریں گے وہ ہماری ترجمانی کون کہتا ہے
ہم کہاں ساز پہ گانے کو غزل کہتے ہیں
اپنے دکھ درد بھلانے کو غزل کہتے ہیں
پھر بھی روز سنورتی ہے قدرت ناظم
کہنے کو وہ پریوں کی شہزادی ہے

حمید ادیبی ناندوروی:

حمید ادیبی ناندوروی کے دو شعری مجموعے 'تاثرات' 2017 اور 'خون کے آنسو' 2019 میں شائع ہوئے۔ انھوں نے غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کی شاعری میں سادگی و پرکاری بدرجہ اتم موجود ہے، اور بہت سے اشعار تو گہرا فلسفہ لیے ہوئے ہیں جو غور وفکر کا مطالبہ کرتے ہیں۔ شکوہ وشکایت، ہجر کا رونا، وصل کی آرزو، جوش جذبات، نالہ وفریاد اور سوز وگداز ان کے کلام کی خصوصیات ہیں۔

نمونہ کلام:

لاکھ غم اپنا چھپاتا ہوں زمانے سے حمید
پھر بھی آجاتا ہے شعروں میں اتر کے سامنے
خوب قسمت سے مسیحا بھی ملا ہے مجھ کو
زہر دیتا ہے ستم گر نہ دوا دیتا ہے

ظفر ثاقب:

ظفر ثاقب 1936 میں ناندورہ میں پیدا ہوئے۔ انھیں شروع سے ہی ادب میں دلچسپی رہی۔ ادبی محفلوں میں شرکت کرنے لگے۔ جب شاعری کا ذوق پروان چڑھا تو نیرنگ ناندوروی سے اصلاح لینے لگے۔ دسویں جماعت تک تعلیم حاصل کی اس کے بعد کاشت کاری کے پیشے سے منسلک ہو گئے۔ طبیعت سے بڑے ہی سنجیدہ مزاج واقع ہوئے ہیں۔ خوش اخلاقی ان کے مزاج میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ غزل ان کا خاص میدان ہے۔ عشق مجازی اور عشق حقیقی دونوں موضوعات ان کے کلام میں ملتے ہیں۔ کلام میں سادگی، سلاست اور روانی پائی جاتی ہے۔

نمونہ کلام:

مجھے دیکھ دنیا کا سرتاج ہوں میں
جو کل تھا جہاں میں وہی آج ہوں میں
چمن والوں سے سمجھوتا ہی ایسا کر لیا میں نے
گلوں کو چھوڑ کر کانٹوں سے دامن بھر لیا میں نے

ساحر ادیبی:

اصل نام قاضی سعید الدین اور تخلص ساحر کرتے تھے۔ ادیب مالیگانوی کے شاگرد تھے اس مناسبت سے ساحر ادیبی قلمی نام اختیار کیا۔ 16 جون 1934 کو ناندورہ (ضلع بلڈانہ) میں ولادت ہوئی۔ ابتدائی تعلیم ناندورہ میں ہی حاصل کی۔ ڈی ایڈ (ڈپلومہ ان ایجوکیشن) پونہ سے کیا۔ اور 1954 میں جلگاؤں (خاندیش) میں مدرسی پیشے سے وابستہ ہو گئے، اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ 9 اپریل 1992 کو اس دارفانی سے رخصت ہوئے۔ آپ کا شعری مجموعہ 'فسون سخن' پس مرگ 1934 میں 'بزم یاراں جلگاؤں' کے توسط سے شائع ہوا۔ ساحر ادیبی کے کلام میں سادگی و پرکاری اور معنی آفرینی خوب تھی۔ سادگی سے گہری بات کہنا ان کے کلام کا خاصہ تھا۔ جہاں انھوں نے اپنے جذبات کو شعری پیکر عطا کیے ہیں وہیں معاشرے کی اصلاح کا کام بھی کیا ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ انھوں نے سیاست کی کج روی کو بھی طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

نمونہ کلام:

مسکراہٹ اداس چہروں کی
عظمت زندگی بڑھاتی ہے
دل میں ساحر جو غم سماتے ہیں
شعر بن بن کے لب پہ آتے ہیں

نئے چہرے نئے شعرا:

وسیم زاہد سادہ مزاج طبیعت کے مالک ہیں، اور یہی رنگ ان کی شاعری میں بھی جھلکتا ہے۔ قلبی واردات اور سوز وگداز احمد کاشف کے کلام کی خصوصیت ہے۔ حکومت اور زمانے کی کج روی اور اس کج روی کی شکایتیں اعجاز پروانہ کے کلام میں بدرجہ اتم موجود ہیں۔ حسنین ساحل نے اپنی شاعری میں انقلابی موضوعات کے ساتھ ساتھ اصلاحی پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی ہے۔ سید اسمٰعیل گوہر سنجیدہ طبیعت کے مالک ہیں۔ ان کے یہاں اصلاحی و مذہبی پہلو نمایاں نظر آتے ہیں۔ اعجاز طارق نے مفلسی، غربت اور بے بسی کو خاص موضوع بنایا ہے۔ راحیل انجم کی شاعری ہر

عام وخاص کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ ان کا ایک خاص انداز ہے، جو انھیں دوسروں سے الگ کرتا ہے۔ وہ ہمیشہ اچھوتے موضوعات کی تلاش میں رہتے ہیں۔ نفیس احمد نفیس کے اشعار جہاں غم دوراں وغم ہجراں کی روداد بن جاتے ہیں وہیں حکومت کی ناانصافیوں کے خلاف بغاوت کا اعلان بھی کرتے نظر آتے ہیں۔ متین طالب تیزی سے ابھرتے ہوئے جواں سال شاعر ہیں۔ وہ غزل اور نظم دونوں اصناف میں طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ ان کے پاس منفرد لب ولہجہ ہے اور ان کے یہاں موضوعات میں کافی تنوع پایا جاتا ہے۔ اظہر عاطف شاعری کے میدان میں نوآموز ہیں۔ ان کے اشعار میں تغزل کا رنگ پایا جاتا ہے۔ وسیم انداز نومشق شاعر ہیں۔ نئے مضامین کو شعری پیکر عطا کرنے میں وہ کامیاب نظر آتے ہیں۔

نثر نگاری:

نئے قلم کاروں کے تناظر میں اگر جائزہ لیا جائے تو 2017 سے پہلے شہر کے کچھ شاعر وادیب صرف ڈائریوں میں محدود تھے۔ اپنا کلام ڈائری میں لکھ کر رکھ دیتے تھے، جو اچھے تخلیق کار ہونے کے باوجود گمنامی کی زندگی جی رہے تھے۔ کچھ شاعر وادیب ایسے بھی تھے، جو ممبئی سے نکلنے والے روزناموں میں اپنی تخلیقات برائے اشاعت بھیجتے تھے۔ اور یہ تخلیقات ان ہی اخبارات کو بھیجی جاتی تھیں، جو شہر ناندورہ میں آتے تھے۔ ایسے تخلیق کار شہر میں ایک نمایاں مقام تو حاصل کر ہی لیتے تھے، ساتھ ہی ساتھ ریاستی سطح پر بھی پہچانے جاتے تھے، مگر قومی سطح پر وہ گمنام ہی رہتے تھے۔ لیکن الحمدللہ! آج ماحول مختلف ہے۔ یہاں کے زیادہ تر تخلیق کار ریاستی اخبارات کے علاوہ دوسری ریاستوں کے اخبارات ورسائل میں تواتر سے شائع ہو رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ رسائل کی خریداری بھی قبول کر رہے ہیں۔

31 دسمبر 2017 کو شہر ناندورہ میں ایک نثری تنظیم بہ نام 'فکشن ایسوی ایشن ناندورہ' (FAN) کا قیام عمل میں آیا۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام چند افسانوی نشستیں منعقد کی گئیں، کچھ اعزازی پروگرام ہوئے، جس میں ڈاکٹر ایم اے حق، معین الدین عثمانی، رشید قاسمی، عزیز خاں عزیز، شبیر احمد شاد، نعیم شیخ، سلیم الدین عامر اور ڈاکٹر عابدالرحمٰن کے اعزاز میں ہوئے ادبی پروگرام قابلِ ذکر ہیں۔ دھیرے دھیرے سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ لکھنا لکھانا شروع ہوا اور چھپنا چھپانا بھی اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ نشر واشاعت سے قلم کاروں کے حوصلوں کو نئی اڑان ملی اور دیکھتے ہی دیکھتے نئے نثر نگار میدان میں آگئے۔ اسی کے ساتھ ساتھ وہ لوگ جو اب تک شاعری کر رہے تھے، وہ بھی نثر لکھنے لگے۔

یکم جنوری 2018 کو 'بزمِ اربابِ سخن' کی بنیاد ڈالی گئی۔ اس تنظیم نے شہر میں شاعری کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا۔ اس تنظیم کے زیرِ اہتمام کئی شعری نشستوں اور مشاعروں کا انعقاد کیا گیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے شہر کی سب سے پرانی ادبی انجمن 'بزم تحریک شعروادب' پھر سے فعال ہوگئی، اور 'گلشن اردو ادب' کا قیام بھی عمل میں آیا۔ سرگرمیاں بڑھتی گئیں۔ قلم کاروں میں رسہ کشی اور مقابلہ آرائی شروع ہوئی، لیکن فائدہ تو ادب کو ہی ہوا۔ 2019 میں یہاں سے سہ ماہی برقی مجلہ 'آئینۂ ادب' جاری ہوا۔ اس طرح 2017 کے بعد کا دور ناندورہ کے ادبی منظر نامے کا اہم اور انقلابی دور مانا جائے گا۔

چند نثر نگاروں کا مختصر جائزہ پیش خدمت ہے:

حمید ادیبی ناندوروی:

بیک وقت ناول نگار، افسانہ نگار، مضمون نگار اور شاعر بھی ہیں۔ 3 جولائی 1938 کو ناندورہ میں پیدا ہوئے۔ اب تک ان کی سات کتابیں منظرِ عام آ چکی ہیں جن میں پھول کھل گئے (ناول، 1986)، جہاں چاہ وہاں راہ (افسانے، 2000)، ہمیں انصاف چاہیے (تنقیدی مضامین، 2004)، میں، شاعری اور مشاعرہ (مزاحیہ مضامین، 2008)، کامیابی کا راز (مضامین، 2016) اور دو شعری مجموعے شامل ہیں۔ ان کا تعلق شہرِ ناندورہ سے ہے۔ لیکن روزگار کے سلسلے میں 1958 میں ممبئی چلے گئے تھے اور وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ لیکن ان کا دل ناندورہ میں ہی بستا ہے۔ وطن سے دوری نے ان کے ہاتھوں میں قلم تھما دیا، اس پر ممبئی کے علمی وادبی ماحول نے سوئے ہوئے قلم کار کو جگانے کا کام کیا۔ عمر کی بیاسی بہاریں دیکھ چکے ہیں اور آج بھی اُن کا قلم جواں رواں دواں ہے۔ وہ پیشے سے اسٹینو گرافر ہیں۔ اردو، انگریزی، ہندی اور مراٹھی زبانیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ بڑے ہی سیدھے سادے اور سچے دل کے انسان ہیں۔ تصنیف وتالیف ان کا شوق ہے۔ اونچے پورے، لمبے تڑنگے، دبلے پتلے، سانولی رنگت والے حمید ادیبی ممبئی کی گلیوں میں اتنی تیز رفتار سے تڑنگ تڑنگ پیدل چلتے ہیں کہ نوجوانوں کی سانسیں اکھڑ جائیں۔ جیسا کہ ذکر کیا گیا ہے کہ 1986 میں ان کی پہلی تصنیف 'پھول کھل گئے' ناول کی شکل میں منظرِ عام آئی۔ یہ ایک یتیم لڑکی شمیم کی کہانی ہے، جو شرم وحیا کا پیکر ہے۔ لیکن اپنے سینے میں ایک دھڑکتا دل بھی رکھتی ہے۔ یہ دل اس وقت مزید دھڑکنے لگتا ہے جب اس کی نگاہِ انتخاب خالد پر جا ٹکتی ہے۔ اور خالد بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ خالد اس کے محسن کا لڑکا ہے، جہاں شمیم پلی بڑھی ہے۔ شمیم چونکہ بے سہارا ہے، یتیم ہے اور زیرِ احسان بھی، اس لیے وہ اظہارِ محبت نہیں کر پاتی۔ کیونکہ اسے اپنے محسن کی رسوائی کا ڈر ہے۔ خالد اس سے بے پناہ محبت کرنے لگتا ہے اور اس کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ لیکن وہ ہر بار انکار ہی کرتی ہے۔ اور اس طرح ان کی محبت ایک عجیب کشمکش میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ حمید ادیبی نے محبت کی اس کشمکش کا اس ہنرمندی سے نقشہ کھینچا ہے کہ قاری بھی کشمکش میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ ناول عشقیہ ہے لیکن کہیں بھی جنسیات کا بے باکانہ بیان نہیں۔ ناول کے بعد ان کی دوسری تصنیف 'جہاں چاہ وہاں راہ' جو 2000 میں منظرِ عام آئی، صنفِ افسانہ سے تعلق رکھتی ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں کے موضوعات آس پاس کے ماحول سے ہی منتخب کیے ہیں۔ اور زندگی کی چھوٹی موٹی باتوں کو بنیاد بنا کر کہانیاں لکھی ہیں۔ غریب وامیر طبقے، حتیٰ کہ اپنے گھر کے حالات کو بھی انھوں نے موضوع بنایا ہے۔ اس مجموعے میں کل 22 افسانے شامل ہیں۔ ان کی کہانیوں کے کردار ہمارے سماج کے جیتے جاگتے، چلتے پھرتے حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں۔ سادہ بیانیہ اسلوب میں لکھی گئی ان کہانیوں میں زبان نہایت ہی صاف ستھری ہے۔ تحریر میں روانی اس قدر ہے کہ قاری یوں محسوس کرتا ہے کہ وہ کسی اونچے ٹیلے پر سے بڑی تیزی سے نیچے کی جانب پھسل رہا ہے۔ مضمون نگاری میں بھی ان کا فن عروج پر نظر آتا ہے۔ وہ اپنے مضامین میں بات کو سمجھانے کے لیے مثالیں پیش کرتے ہیں، حوالے دیتے ہیں اور کہانیاں سناتے ہیں۔ ان کی زنبیل میں طرح طرح کا مال موجود ہیں، جس میں مقامی اور بیرونی، محاورے، کہاوتیں اور کہانیاں شامل ہیں۔ جنھوں نے ان کی تحریر کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ 'کامیابی کا راز' نہایت ہی مفید کتاب ہے۔ 202 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں کل 35 مضامین شامل ہیں۔ سبھی مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ کتاب ایک حسین گلدستے کی مانند ہے۔ خاص کر نوجوانوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ اسکول اور کالج کی تعلیم میں محض معلومات حاصل کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ جس میں اصل تعلیم کہیں کھو کر رہ جاتی ہے۔ تعلیمی اقدار کیا ہے؟ تعلیم کا اصل مقصد کیا ہے؟ یہ ہمیں معلوم ہی نہیں پڑتا۔ اس کتاب کے متعلق میں یوں کہوں گا کہ دودھ میں سے مکھن نکال کر ہمارے ہاتھ پر رکھ دیا گیا ہے۔

محمد شفیع قریشی:

30 جولائی 1950 میں ناندورہ میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے افسانہ نگاری اور مضمون نگاری کے میدان میں خامہ فرسائی کی۔ وہ ادبی، سیاسی، تعلیمی، سماجی اور اصلاحی نوعیت کے مضامین قلم بند کرتے تھے۔ محمد شفیع قریشی، نگر پریشد

ناندورہ کے دو دفعہ رکن اور ایک بار نائب صدر بھی رہے۔ ان کی بہت سی کہانیاں اور مضامین اُردو ٹائمز اور انقلاب ممبئی میں شائع ہوئے۔ وہ بزمِ تحریکِ شعر و ادب ناندورہ کی نشستوں میں برابر شریک ہوتے تھے۔ بزمِ ہٰذا نے ان کی صدارت میں نشستیں بھی منعقد کی تھیں۔ ان کا افسانہ 'ایک اکیلی لڑکی' خوب پسند کیا گیا تھا۔ انھوں نے سماج کے ساتھ ساتھ ادب کی بھی خدمت کی۔ اور 10 اگست 2006 کو مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ آج بھی، ان کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ تخلیقات اُن کے فرزندِ ارجمند ریاض احمد قریشی، جو ایک ادب نواز شخصیت ہیں، نے بڑے قرینے سے سنبھال رکھی ہیں۔

غنی غازی:

کہانی کار، افسانچہ نگار، مترجم اور بچوں کے ادیب کے طور پر پہچانے جاتے ہیں۔ 27 مئی 1959 میں ناندورہ میں پیدا ہوئے۔ 1980 میں روزگار کے سلسلے میں ممبئی چلے گئے تھے۔ وہاں روزنامہ اُردو ٹائمز میں نامہ نگار کے عہدے سے ترقی کرتے ہوئے نیوز ایڈیٹر کے فرائض انجام دیے۔ روزنامہ 'قومی آواز' اور ہفت روزہ 'اخبارِ عالم' میں کالم نگار رہے۔ ماہنامہ 'نقش کوکن' اور ماہنامہ 'صبحِ امید'، ممبئی میں سب ایڈیٹر کی ذمہ داری سنبھالی۔ روزنامہ 'قومی آواز' اور 'قومی راج' ممبئی میں بطور مترجم کام کیا۔ 1985 میں ان پہلی تصنیف 'ریت کے گھروندے' کو مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے ایوارڈ سے سرفراز کیا۔ 1991 میں مہاراشٹر اسٹیٹ اردو ساہتیہ اکادمی نے صحافت ایوارڈ سے بھی نوازا۔ انھوں نے روزنامہ 'اردو ٹائمز' میں 20 سال تک خدمات انجام دیں۔ ممبئی میں ان کا قیام 1980 سے 2004 تک رہا۔ اب تک ان کی سات کتابیں، بعنوان ریت کے گھروندے (1984)، مٹی کے گھروندے (1986)، شبنم کے موتی (1987)، شعری کہکشاں (2015)، پھول پتے (2015)، مردہ گھر (2016)، اور سات رنگ (2016) منظرِ عام آ چکی ہیں۔ 1989 میں ممبئی کے جوگیشوری میں عبداللہ قریشی پرائمری و ہائی اسکول قائم کیا۔ 1992 میں لاکھن واڑہ (کھام گاؤں) میں لشکریہ اردو پرائمری، ہائی اسکول اینڈ جونیئر کالج کی بنیاد رکھی۔ فی الحال وہ 2004 سے لاکھن واڑہ (تعلقہ: کھام گاؤں) میں مقیم ہیں۔ اور اپنے تعلیمی ادارے میں چیئرمین کی ذمے داری بحسن و خوبی نبھا رہے ہیں۔ غنی غازی تحریر کے ساتھ ساتھ فنِ خطابت میں بھی مہارت رکھتے ہیں۔ وہ ایک بہترین مقرر اور مبصر بھی ہیں۔

محمد علیم اسماعیل:

یہاں راقم الحروف اپنا تعارف کرا دینا چاہتا ہے۔ 2013 سے لکھنے کی شروعات ہوئی۔ 2016 سے باقاعدہ افسانہ نگاری کی جانب راغب ہوا۔ افسانے و افسانچے اور اسی صنف پر مضامین، پسندیدہ اصناف میں شامل ہیں۔ افسانوں کے دو مجموعے، 'الجھن' (2018) اور 'رنجش' (2020) شائع ہو چکے ہیں۔ مزید تین کتابیں زیرِ ترتیب ہیں، جن میں ایک افسانچوں کا مجموعہ، ایک بچوں کی کہانیوں کا مجموعہ اور ایک سنیئر افسانہ نگار دوستوں کی شخصیت اور فن پر لکھے گئے مضامین کا مجموعہ شامل ہیں۔

سید قمر الزماں قمر:

ایک مضمون نگار کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ 8 نومبر 1959 میں جلگاؤں جامود میں پیدا ہوئے۔ 1968 سے ناندورہ میں مقیم ہیں۔ وہ ایک بے باک قلمکار ہیں۔ 'بیباک قلم سے' ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو 2019 میں منظرِ عام آ چکا ہے۔ کتاب میں شامل بھی مضامین معاشرتی اور سیاسی تجزیاتی نوعیت کے حامل ہیں۔ وہ عنایتیہ ہائی اسکول ناندورہ سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔ اور ان دنوں فرصت کے لمحات کو لکھنے پڑھنے میں استعمال کر رہے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ خوب شائع ہوتے تھے۔ لیکن آج دورِ جدید میں نشر و اشاعت کے طریقے بدل گئے ہیں۔ اور وہ انٹرنیٹ کے اس دور سے قدم ملا نہیں پا رہے ہیں۔

ایاز الدین اشہر: شہر کے ادبی حلقے میں اہم مقام رکھتے ہیں۔ وہ ایک شاعر اور مضمون نگار کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ 'بزمِ تحریکِ شعر و ادب' اور 'بزمِ اربابِ سخن' کے سرپرست بھی ہیں۔ جوان بیٹے کی موت کے غم نے ان کے قلم کو خاموش کر دیا ہے۔ میں دعاگو ہوں کہ وہ جلد ہی اس صدمے سے ابھر آئیں۔

اعجاز پروانہ ناندوروی شہر کے جانے مانے قلم کار ہیں۔ 27 جولائی 1972 میں اکولہ (ننھیال) میں پیدا ہوئے۔ 1977 سے ناندورہ میں مقیم ہیں۔ ابتدا میں اپنے والد کے ڈر سے ایم۔ اے۔ پروانہ کے فرضی نام سے لکھتے تھے۔ انھوں نے شاعری اور نثر نگاری دونوں میدانوں میں اپنے قلم کا جادو جگایا ہے۔ ایک وقت ایسا بھی تھا جب اردو ٹائمز ممبئی میں وہ مسلسل شائع ہوتے تھے۔ اس وقت تخلیقات برائے اشاعت ارسال کرنے کے طریقے پرانے تھے۔ کاغذ پر لکھ کر تخلیقات پوسٹ کی جاتی تھیں۔ ابھی تک ان کا ایک بھی مجموعہ شائع نہ ہونے کے باوجود شہر کے نثر نگاروں کی فہرست ان کے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ شعرا و ادبا کی حیات و خدمات پر ان کے تحریر کردہ تحقیقی مضامین خوب پسند کیے گئے تھے۔ انھوں نے ناندورہ کے پرانے شاعروں پر بھی سلسلہ وار مضامین قلمبند کیے ہیں۔ ان کے علاوہ افسانے اور افسانچے بھی لکھے ہیں۔ 1988 سے ادب کی خدمت کر رہے ہیں، لیکن آج کل ان کا قلم کچھ خاموش نظر آتا ہے۔ اس کے باوجود انہوں نے اتنا کچھ لکھ لیا ہے کہ دو شعری، ایک ناول، ایک افسانہ اور دو مضامین کے مجموعے شائع ہو سکتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ وہ جلد ہی اس جانب توجہ فرمائیں گے۔

سید اسمٰعیل گوہر شہر کے ادبی منظر نامے پر بڑی تیزی سے ابھرنے والے ادیب ہیں۔ 8 فروری 1971 کو ناندورہ میں پیدا ہوئے۔ وہ افسانہ نگار، افسانچہ نگار، ناول نگار، مضمون نگار اور شاعر بھی ہیں۔ 1992 میں مضمون 'اقبال ایک قومی شاعر' سے لکھنے کی شروعات کی۔ اس کے بعد مسلسل شاعری میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ لیکن ان دنوں باقاعدگی سے نثر نگاری کر رہے ہیں۔ ان کا افسانہ ''شکوہ'' روزگار کے سلسلے میں کی گئی ہجرت اور ماضی کی یادوں کو بیان کرتا ہوا ایک اچھا افسانہ ہے۔ ان کے افسانچے بھی سماجی برائیوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ان دنوں وہ ایک ناول بھی لکھ رہے ہیں اور حالاتِ حاضرہ پر لکھے ان کے تجزیاتی مضامین بھی شائع ہو رہے ہیں۔ حالانکہ افسانہ اور افسانچہ نگاری میں انھوں نے ابھی ابھی قدم رکھا ہے۔ لیکن ان کے عزم و حوصلے کو دیکھتے ہوئے، اس میدان میں ان سے کافی امیدیں وابستہ ہیں۔ موصوف بڑے ہی خوش اخلاق و سلیقہ مند شخصیت کے مالک ہیں اور ہر کام بڑے ہی منصوبہ بند طریقے سے کرتے ہیں۔

اشفاق حمید انصاری 2017 کے بعد ابھرنے والے قلم کار تھے۔ انھوں نے افسانے اور افسانچے قلمبند کیے تھے۔ جو اودھ نامہ لکھنؤ اور دیگر اخبارات میں شائع ہوئے تھے۔ وہ نثری تنظیم 'فیمن' کے فعال رکن تھے اور ہر پروگرام میں پیش پیش رہتے تھے۔ لیکن زندگی ان کے ساتھ وفا نہ کر سکی۔ 19 اکتوبر 2019 میں سڑک حادثے میں وہ اس دارِ فانی سے رخصت ہو گئے۔

راحیل ابن انجم نئے قلم کاروں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ بچپن سے ہی لکھنے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ 2007 سے شاعری کر رہے ہیں۔ کئی مشاعروں میں شرکت کر چکے ہیں۔ ادبی ماحول وراثت میں ملا ہے۔ ان کے والد محمد ثقلین انجم اور بڑے بھائی حسنین ساحل بھی شاعر ہیں۔ ان دنوں باقاعدگی سے افسانہ، افسانچہ اور مضمون نگاری کی جانب راغب ہوئے ہیں۔ ابن صفی کو انھوں نے خوب پڑھا ہے اور اسی کا اثر ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔

■

Mohd Alim Ismail (Asst.Teacher)
Ward No. 13
Behind Police Station
Nandura - 443404 (MS)
Mob.: 8275047415

اردو کے اہم محققین

محمد راشد اقبال

اردو میں تحقیق کا آغاز تذکروں سے ہوتا ہے۔ تذکروں میں اولیت کا شرف میر تقی میر کی کتاب 'نکات الشعرا' کو حاصل ہے۔ 'نکات الشعرا' اردو شعرا کا سب سے پہلا تذکرہ ہے، جو فارسی زبان میں ہے۔ 'نکات الشعرا' کے بعد یکے بعد دیگرے کئی تذکرے (مثلاً حمید اورنگ آبادی کا 'گلشن گفتار' فتح علی گردیزی کا 'ریختہ گویاں' قیام الدین قائم چاندپوری کا 'مخزن نکات' لچھمی نرائن شفیق کا 'چمنستان شعرا' مرزا علی لطف کا 'گلشن ہند' وغیرہ) منظر عام پر آئے۔ اس سلسلے کی آخری کڑی محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' ہے جسے ہم روایتی تذکرے سے بڑھ کر اردو ادب کی تاریخ بھی قرار دے سکتے ہیں۔

انیسویں صدی کے وسط میں سر سید احمد خاں کی کتاب 'آثار الصنادید' منظر عام پر آئی۔ یہ اردو کی غالباً پہلی کتاب ہے، جس میں تحقیق کا اچھا نمونہ پیش کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی ہی کے اواخر میں اردو ادب کے عناصر ثلاثہ حالی، شبلی اور آزاد کی تحقیقی کاوشیں منظر عام پر آنے لگیں۔ حالی نے 'یادگار غالب'، 'حیات جاوید' اور 'حیات سعدی' لکھی۔ شبلی، حالی کے بعد دوسرے بلند پایہ سوانح نگار سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے علمی کارناموں میں 'شعر العجم' نہایت ہی اہمیت کی حامل ہے۔" یہ ان کی بلند پایہ اور معرکہ آرا ادبی تصنیف ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے اپنے حاصل شدہ مواد کو ترتیب دے کر سلیقے اور دلکشی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ 'شعر العجم' کے علاوہ شبلی کی اکثر و بیشتر کتابوں کا موضوع سیرت و سوانح ہے۔ محمد حسین آزاد کی 'آب حیات' کو زبان و بیان کے اعتبار سے اردو ادب میں بلند مقام حاصل ہے۔

حالی، شبلی اور آزاد کے بعد اردو میں تحقیق کو مزید فروغ دینے کا کام مولوی عبدالحق نے کیا۔ انھوں نے دکنی متون کو بڑی ہی محنت و جانفشانی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا۔ وجہی کی 'سب رس' کی ترتیب و تدوین آپ کا اہم تحقیقی کارنامہ ہے۔ آپ نے اس کتاب کو شائع کر کے ایک اہم سرمایہ کو ضائع ہونے سے بچالیا۔ دکنیات سے متعلق کتابوں میں نصرتی کی مثنوی 'گلشن عشق'، وجہی کی 'قطب مشتری'، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کی طرف منسوب 'معراج العاشقین' کو بھی مرتب کر کے شائع کیا۔

اس کے علاوہ انھوں نے شعرائے اردو کے تذکروں میں چمنستان شعرا، مخزن نکات، تذکرہ ریختہ گویاں، تذکرۂ ہندی، ریاض الفصحا، عقد ثریا، نکات الشعرا وغیرہ کو دریافت کیا اور انھیں مرتب کر کے شائع کیا۔ دکنیات اور اردو شعرا کے تذکروں کے علاوہ انھوں نے شعرا کے دواوین میں خواجہ میر اثر کا 'دیوان اثر' اور میر عبدالحی تاباں کا 'دیوان تاباں' کو بھی مرتب کر کے شائع کیا۔

بیسویں صدی تحقیق کے لیے کافی اہمیت کی حامل سمجھی جاتی ہے۔ اس صدی میں مولوی عبدالحق نے نہ صرف تحقیق کے لیے فضا قائم کی، بلکہ انھوں نے اس کے لیے ذہنوں کو بھی ہموار بھی کیا۔ جس کی وجہ سے اس صدی میں تحقیق کے عمدہ نمونے منظر عام پر آئے۔ یہاں چند محققین کا اجمالی تعارف پیش کیا جا رہا ہے۔

حافظ محمود شیرانی

حافظ محمود شیرانی کو تحقیق کا معلم اول سمجھا جاتا ہے۔ انھوں نے تحقیق کو ایک مستقل موضوع کی حیثیت عطا کی۔ آپ اردو میں تحقیق کے لیے روایت ساز کی حیثیت رکھتے ہیں۔

شیرانی صاحب کی تحقیقی زندگی کا آغاز 1920 سے شروع ہو کر زندگی کے آخری ایام تک جاری رہتا ہے۔ انھوں نے اصول تحقیق پر اگرچہ کوئی کتاب نہیں لکھی، لیکن اصول تحقیق اور طریقۂ کار کی تفصیلات ان کے مختلف مقالوں سے مرتب کی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے تحقیق کے لیے جو خاکہ بنایا اور جس طرح اس میں رنگ آمیزی شروع کی تھی، اور جو طریقۂ کار اختیار کیا تھا، اس کے بعد بھی اسی طریقۂ کار کی پیروی کی گئی۔

تحقیق کے طریقۂ کار میں جو اجزا اہمیت کے حامل ہیں، ان میں ایک داخلی شواہد کا تعین بھی ہے۔ داخلی شواہد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کتاب میں جو واقعہ بیان کیا جائے، اس وقت تک معتبر نہیں مانا جاتا، جب تک کہ دوسروں کی شہادت نہ مل جائے۔ شیرانی صاحب نے داخلی شواہد کو متعارف کرانے کے ساتھ داخلی شواہد کی بنیاد پر تحقیق کی روایت کو آگے بڑھایا۔

'شاہنامہ فردوسی' جو ساٹھ ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں فردوسی سے متعلق جو باتیں عام تھیں، شیرانی صاحب نے داخلی شواہد کی بنیاد پر حقیقت پر سے پردہ اٹھایا۔ انھوں نے 'شاہنامہ فردوسی' سے متعلق باتوں کو 'فردوسی پر چار مقالے' میں پیش کر کے وہ کارنامہ انجام دیا ہے، جس سے اہل ایران بھی قاصر تھے۔

لسانی تحقیق سے متعلق آپ کا بے مثال کارنامہ

'پنجاب میں اردو' ہے۔ اس کتاب میں آپ نے اردو زبان کی قدامت پر مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ بالخصوص ان مسائل پر جن کی رو سے پنجاب کو اس زبان کی ابتدا اور اس کی نشوونما کا گہوارہ مانا جا سکے۔

آپ کے کارناموں میں قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ 'مجموعۂ نغز' بھی ہے۔ 'مجموعۂ نغز' کا واحد نسخہ پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور میں محفوظ تھا۔ آپ نے اسے بڑی دیدہ ریزی کے ساتھ ترتیب دے کر شائع کیا۔ 'مجموعۂ نغز' کی روشنی میں آپ نے محمد حسین آزاد کی کتاب 'آبِ حیات' میں جہاں جہاں لغزش ہوئی تھی، اس کی نشاندہی کی ہے۔ 'مجموعۂ نغز' کی ترتیب آپ کا وہ لازوال کارنامہ ہے، جس کو اگر آپ نے انجام نہیں دیا ہوتا تو شاید 'مجموعۂ نغز' دنیا سے ختم بھی ہو گیا ہوتا۔

آپ نے شبلی کی 'شعر العجم' کے جواب میں 'تنقید شعر العجم' لکھ کر یہ واضح کیا کہ شبلی نے سوانح سے متعلق جو تذکرہ لکھا ہے، یا تاریخ کے بارے میں جو بتایا ہے، ان میں تحقیق سے متعلق اصول کو نظرانداز کیا گیا ہے۔ آپ نے 'تنقید برائے آبِ حیات' لکھ کر یہ واضح کیا کہ جس طرح شبلی 'شعر العجم' میں سوانح سے متعلق معتبر نہیں ہیں، اسی طرح محمد حسین آزاد بھی 'آبِ حیات' میں معتبر نہیں ہیں۔

امیر خسرو کی طرف منسوب 'خالق باری' کے بارے میں پہلی بار آپ نے داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ بتایا کہ یہ کتاب امیر خسرو کی نہیں ہے، بلکہ ضیاء الدین خسرو کی ہے۔ اس سلسلے میں آپ نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ اس کتاب میں تمباکو کا ذکر آیا ہے، جب کہ تمباکو پرتگالیوں کے ذریعے اکبر کے زمانے میں ہندوستان آیا۔

'پرتھی راج راسا' کے بارے میں یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ کتاب چندر بردائی کی تصنیف ہے، جو دہلی کے راجہ پرتھوراج چوہان کا درباری شاعر تھا۔ اسی بنا پر اس کتاب کو دیسی زبانوں میں سب سے قدیم کتاب کا درجہ دیا جاتا ہے۔ آپ نے داخلی شواہد کی بنیاد پر یہ ثابت کیا کہ یہ کتاب بہت بعد کی ہے، یعنی سولہویں صدی کے نصف آخر کی یادگار ہے۔

حافظ محمود شیرانی دراصل بے لاگ، بے لوث اور غیر جانب دار محقق تھے۔ انھوں نے پہلی بار تحقیق کو اس طریقہ کار سے روشناس کرایا۔ درحقیقت ان میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ایک محقق کے لیے لازمی خیال کی جاتی ہیں۔ حافظ محمود شیرانی کے بارے میں ڈاکٹر خلیق انجم رقم طراز ہیں:

''قاضی عبدالودود سے قبل اردو محققین میں اہم ترین نام حافظ محمود شیرانی کا ہے۔ حافظ محمود شیرانی 15 اکتوبر 1880 کو اور قاضی عبدالودود 8 مئی 1896 کو پیدا ہوئے تھے۔ گویا حافظ محمود شیرانی قاضی صاحب سے پندرہ سولہ سال بڑے تھے۔ شیرانی مرحوم کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ مبالغہ نہ ہوگا اگر میں کہوں کہ شیرانی صاحب نے تحقیق سے متعلق جو علوم حاصل کیے تھے، وہ کسی اور محقق کو نصیب نہیں ہوئے''[1]

قاضی عبد الودود

قاضی عبدالودود نے تحقیقی طریقہ کار میں حافظ محمود شیرانی کی روایت کو ہی آگے بڑھایا۔ ان کے تحقیقی طریقۂ کار میں یہ بات بہت اہم ہے کہ وہ ہمیشہ غیر جانب دارانہ اور دو ٹوک باتیں کہنے کی کوشش کرتے ہیں، خواہ ان کے آبا و اجداد ہی پر حرف کیوں نہ آ جائے، یا احباب و متعلقین ناراض ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

قاضی صاحب کا حافظہ بہت مضبوط تھا، لیکن انھوں نے حافظے کی بنیاد پر کبھی کوئی بات نہیں کہی۔ وہ ماخذ اور ثبوت کی اہمیت سے خوب واقف تھے۔ اس لیے ہمیشہ اصل ماخذ اور ثبوت کے بغیر حتمی طور پر کوئی بات کہنے کی کوشش نہیں کرتے تھے۔

غالب سے متعلق قاضی صاحب کی تحریریں علی گڑھ میگزین 1948-49 کے غالب نمبر میں شائع ہوئیں۔ اس میگزین میں انھوں نے اپنے مضمون 'غالب کا ایک فرضی استاد' میں انیس دلائل پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ دنیا کا کوئی بھی شخص غالب کے سوا عبدالصمد سے ذاتی واقفیت کا مدعی نہیں ہے۔ اس لیے عبد الصمد کا کوئی وجود نہیں ہے، بلکہ یہ فرضی ہے۔

خواجہ احمد فاروقی کی کتاب 'میر تقی میر: حیات اور شاعری' پر قاضی صاحب کا نہایت مفصل تبصرہ شائع ہوا۔ اس تبصرے میں انھوں نے سخت اعتراضات کیے، اور ایک جگہ لکھا ہے کہ اصل ماخذ اگر موجود ہوں تو ان سے ہی کام لینا چاہیے۔ مصنف نے اس قاعدے کو بہت جگہ بے سبب نظرانداز کیا ہے۔

نورالحسن ہاشمی کی کتاب 'دلی کا دبستان شاعری' ابواللیث صدیقی کی 'لکھنؤ کا دبستان شاعری' اور اختر اورینوی کی 'بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا' پر بھی انھوں نے شرح و بسط کے ساتھ اظہار خیال کیا، اور ان کتابوں میں مصنفین سے جو سہو ہوا ہے، اس کی طرف توجہ مبذول کروائی۔

اس کے علاوہ انھوں نے 'آوارہ گرد اشعار' کے تحت سیکڑوں اشعار جن کی نسبت ایک سے زیادہ شاعروں کی طرف کی جاتی ہے، شواہد کی بنیاد پر شاعر کا نام دریافت کیا نیز 'تعین زمانہ' عنوان کے تحت مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ جس میں انھوں نے شعرائے اردو و فارسی کی تاریخ ولادت اور تاریخ وفات سے متعلق بحث کی ہے، اور شواہد کی بنیاد پر ان کی صحیح تاریخ ولادت اور تاریخ وفات کا تعین کیا ہے۔ مصحفی اور ان کے اہم معاصرین کا جائزہ پیش کیا۔ 'تذکرہ ابن امین اللہ طوفان' اور 'قاطع برہان' کی اشاعت اور 'آثار غالب' کی تدوین و اشاعت قاضی صاحب کے اہم کارنامے ہیں۔

اس کے علاوہ ان کے ادبی کارناموں میں جریدہ 'معاصر'، 'معیار' اور 'تحقیق' کا اجرا بھی ہے۔ قاضی صاحب کی تحریروں اور ان کی تحقیق نے اردو میں تحقیق کے معیار کو بلند کرنے میں اہم رول ادا کیا ہے۔ قاضی عبدالودود کے بارے میں رشید حسن خاں رقم طراز ہیں:

''شیرانی صاحب سے جس روایت کا آغاز ہوا تھا، قاضی صاحب نے متعدد اضافوں کے ساتھ اس کی توسیع کی، اس فرق کے ساتھ کہ شیرانی صاحب کی توجہ کا بڑا حصہ فارسی ادب پر صرف ہوا تھا، اس کے مقابلے میں قاضی صاحب کی بیشتر نگارشات کا تعلق اردو زبان اور ادب سے ہے''[2]

امتیاز علی خاں عرشی

مولانا امتیاز علی خاں عرشی کا شمار صفِ اول کے محققین میں ہوتا ہے۔ آپ نے تحقیق اور تدوین متن میں گراں قدر کارنامے انجام دیے، اور اپنی ادبی کاوشوں کو تحقیق کے لیے وقف کر دیا۔ آپ کی تحقیق کا دائرہ اردو، فارسی اور عربی تینوں زبانوں کی ادبیات سے متعلق ہے۔ مستقل تصانیف کے علاوہ بہت سے علمی و تحقیقی مقالات بھی آپ کی یادگار ہیں۔

اردو ادب میں آپ کا نام ماہر غالبیات کی حیثیت سے سرِ فہرست ہے۔ آپ نے غالبیات کے شعبے میں نت نئے اضافے کیے، جن میں مکاتیب غالب، انتخاب غالب، فرہنگ غالب اور دیوان غالب (نسخۂ عرشی) شامل ہیں۔ آپ نے تحقیق و تدوین میں تاریخی ترتیب کا جو التزام کیا ہے، وہ تحقیق کے باب میں ایک سنہرا اضافہ ہے۔

آپ نے کثیر تعداد میں علمی و تحقیقی مضامین و مقالات بھی لکھے، جو مختلف رسائل و مجلات میں شائع ہوئے۔ 1970 میں آپ کے مقالات کا ایک مجموعہ 'مقالات عرشی' کے نام سے مجلس ترقی ادب، لاہور کی جانب سے شائع ہوا۔ مضامین و مقالات کے علاوہ آپ نے دوسروں کی نادر و نایاب تصانیف کو عالمانہ مقدمہ اور محققانہ حواشی کے ساتھ ترتیب

دینے کا اہم کارنامہ انجام دیا۔

عرشی صاحب نے تنہا غالب ہی پر جو کچھ لکھا ہے وہی ان کو شہرت عام اور بقائے دوام کے دربار میں جگہ دینے کے لیے کافی ہے، مگر ان کے ذوق کے تنوع اور طبیعت کی رنگا رنگی نے انھیں کسی ایک ہی وادی میں محصور نہیں رکھا، بلکہ ان کے قلم کی گلکاریوں کے نمونے ایک سے بڑھ کر ایک تینوں زبانوں اردو، فارسی اور عربی میں منظر عام پر آئے۔

ان کے تحقیقی کارناموں میں ایک اہم اور خاص کارنامہ 'نادرات شاہی' کی ترتیب واشاعت ہے۔ یہ کتاب مغلوں کے سولہویں فرمانروا شاہ عالم ثانی آفتاب (1728-1806) کے اردو، فارسی، ہندی اور پنجابی کلام پر مشتمل ہے۔ عرشی صاحب نے اسے ترتیب دے کر 60 صفحات پر مشتمل مبسوط دیباچے اور آخر میں 17 صفحات پر مشتمل 'اختلاف الفاظ' اور 'اشاریہ' (اشخاص و مقامات) لکھ کر شائع کیا۔ اس کے علاوہ انھوں نے اردو زبان وادب کے قواعد سے متعلق حکیم سید احمد علی خاں یکتا لکھنوی کی کتاب 'دستور الفصاحت' کے علاوہ فارسی میں 'وقائع عالم شاہی'، 'تاریخ محمدی'، 'تاریخ اکبری' معروف بہ تاریخ قندھاری وغیرہ کو بھی مرتب کر کے شائع کیا۔

عرشی صاحب کے کارناموں میں ایک بڑا کارنامہ امام سفیان ثوری (متوفی 161ھ) کی تفسیر القرآن الکریم کی اشاعت بھی ہے۔ یہ تفسیر ناپید تھی۔ اکثر لوگوں کو اس کے وجود کا بھی علم نہیں تھا، لیکن عرشی صاحب نے رضا لائبریری میں اس کا ایک ناقص نسخہ ڈھونڈ نکالا اور اسے اپنے عالمانہ مقدمے اور محققانہ حواشی سے مزین کر کے 1965 میں شائع کیا۔ یہ سورہ بقرہ تا سورہ طور کی تفسیر پر مشتمل ہے۔

رشید حسن خاں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اردو میں جس طرح ادبی تحقیق کے روایت ساز شیرانی صاحب ہیں، اسی طرح تدوین کی روایت اپنی معیاری اور مثالی شکل میں مولانا امتیاز علی خاں عرشی کی مرہون ہے۔ عرشی صاحب نے جو کام کیے، ان کاموں نے تدوین کے اصولوں کو اور طریق کار کو روشناس کرایا۔ ان کی مرتبہ کتابوں میں مکاتیب غالب، دستور الفصاحت، تاریخ محمدی، اردو دیوان غالب، یہ کتابیں معیاری اور مثالی حیثیت رکھتی ہیں''[3]

مالک رام

مالک رام کا شمار اہم محقق و مدون کی حیثیت سے ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیفات و تالیفات سے اردو ادب میں معتد بہ اضافے کیے، اور اپنے تحقیقی و تنقیدی مضامین سے اردو ادب میں ایک خاص مقام حاصل کیا لیکن علمی وادبی دنیا میں آپ کی شہرت غالب شناسی سے زیادہ ہوئی۔

مالک رام کی غالبیات سے متعلق پہلی اور اہم تصنیف 'ذکر غالب' ہے۔ اس میں انھوں نے غالب کے حالات زندگی کو محققانہ انداز میں بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ سپرد قلم کیا ہے۔ اب تک اس کتاب کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، اور ہر ایڈیشن پہلے کے مقابلے زیادہ مواد کے ساتھ منظر عام پر آیا۔

غالبیات سے متعلق مالک رام کی دوسری تصنیف 'تلامذۂ غالب' ہے۔ اس میں غالب کے 181 شاگردوں کے حالات اور ان کے کلام کا انتخاب ہے۔ متعلقات غالب میں اس کتاب کی بڑی اہمیت ہے۔ یہ اپنے موضوع سے متعلق منفرد کتاب ہے۔ اس کتاب کی وجہ سے غالب کے بیشتر شاگردوں کو نئی زندگی ملی، جو گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔ مالک رام نے اس کتاب میں بڑی تلاش وجستجو اور برسوں کی محنت شاقہ کے بعد غالب کے شاگردوں کے حالات درج کیے ہیں۔

غالبیات سے متعلق مالک رام کی تیسری کتاب 'گل رعنا' ہے۔ 'گل رعنا' دراصل غالب کے اردو اور فارسی کلام کا اولین انتخاب ہے۔ مالک رام نے اسے مرتب کر کے شائع کیا۔ غالب کے فارسی کلام کا ایک مختصر مجموعہ 'سبد چین' کے نام سے مرتب کر کے شائع کیا۔ اس مجموعے میں غالب کا وہ کلام شامل ہے جو کلیات میں شامل نہیں ہوا تھا، یا اس کے بعد کا کلام ہے۔ موخر الذکر دونوں کتابوں کے سلسلے میں مالک رام کو اولیت حاصل ہے۔ اس کے علاوہ 'فسانۂ غالب'، 'گفتار غالب'، 'دیوان غالب' کی ترتیب اور خطوط غالب، مرتبہ، منشی مہیش پرشاد کو دوبارہ حذف واضافے کے بعد مرتب کرنا یہ وہ کارنامے ہیں جن سے صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔ مالک رام کے بارے میں پروفیسر نثار احمد فاروقی لکھتے ہیں:

''جناب مالک رام جو نصف صدی سے اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں، ممتاز ماہر غالبیات ہیں۔ اگر انھوں نے اور کچھ نہ کیا ہوتا اور صرف ذکر غالب ان کے پاس ہوتی تب بھی وہ ہماری ادبی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھے جاتے، اس لیے کہ ذکر غالب سے زیادہ جامع، محیط اور مستند سوانح عمری دوسری نہیں لکھی گئی''[4]

مالک رام کی اہم تدوینی کتابوں میں 'غبار خاطر'، 'تذکرہ' اور ''خطبات آزاد' کا شمار ہوتا ہے، جو کہ ابوالکلام آزاد سے متعلق ہیں۔ انھوں نے ان کتابوں کی تدوین میں متن کی صحت کا خیال رکھتے ہوئے توضیحی حواشی تحریر کر کے تدوین کے اعلیٰ نمونے پیش کیے ہیں۔

مالک رام کے بارے میں پروفیسر نذیر احمد رقم طراز ہیں:

''مالک رام صاحب نے اردو تحقیق کی روایت کو آگے بڑھانے میں کافی حد تک کامیابی حاصل کی ہے۔ متنی تحقیق میں تخریج اور تعلیق نویسی کا جو مقام ہے اس سے ہر محقق ادب واقف ہے، لیکن یہ زمین بڑی سنگلاخ ہے، اس لیے عام طور پر محققین اس سے گریز کرتے ہیں، مالک رام صاحب نے تحقیق کی اس ضرورت کو بڑی حد تک پورا کیا ہے۔ کربل کتھا ہو یا غبار خاطر یا ان کی دوسری اور تحقیق ان میں یہ عنصر بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے''[5]

رشید حسن خاں

رشید حسن خاں کو تحقیق وتدوین دونوں فنون پر یکساں قدرت ومہارت حاصل تھی۔ آپ کی تقریباً دو درجن کتابیں ہیں، جن میں تحقیق وتدوین کے اصول وضوابط پر دو کتابیں 'ادبی تحقیق: مسائل اور تجزیہ' اور 'تدوین: تحقیق اور روایت' اہم سمجھی جاتی ہیں۔

تحقیق کے معاملے میں آپ قاضی عبدالودود کی طرح کسی مروت یا رعایت کے قائل نہیں ہیں، اور تحقیقی اصولوں اور ضوابط کی سختی کے ساتھ پابندی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ دوسروں کی تحقیقی کاوشوں کو بھی اسی معیار پر پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔

تحقیق وتدوین سے متعلق آپ کے کارنامے بے شمار ہیں۔ آپ نے جہاں ایک طرف تحقیق، تنقید اور لسانی بحثوں کو اعلیٰ سطح پر موضوع بحث بنایا، وہیں دوسری طرف ابتدائی درجات کے طلبہ کے لیے بھی ان بحثوں کو اٹھایا، اور ان کے لیے بھی زبان کے قواعد اور املا کے قواعد ومسائل پر بہت کچھ لکھا۔ اس سلسلے میں اردو املا، زبان اور قواعد، اردو کیسے لکھیں، عبارت کیسے لکھیں، انشا اور تلفظ، کو پیش کیا جا سکتا ہے۔

آپ کا ادبی تحقیق میں اہم کارنامہ کلاسیکی متون کی تدوین ہے۔ آپ نے اس سلسلے میں فسانۂ عجائب، باغ وبہار، مثنوی سحر البیان، مثنوی گلزار نسیم، مثنویات شوق، اور زٹل نامہ وغیرہ کو جس طرح تدوین کے جدید اصولوں کی روشنی میں صحت اور جامعیت کے ساتھ مرتب کیا ہے، اس کا اندازہ اہل نظر حضرات ہی کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پروفیسر گیان چند جین رقم طراز ہیں:

''اب تک اردو نثر میں بہترین تدوینات مولانا عرشی اور مالک رام ومختار الدین احمد کی تھیں۔ رشید حسن خاں نے فسانۂ عجائب اور باغ وبہار کو اس انداز سے مدون کیا

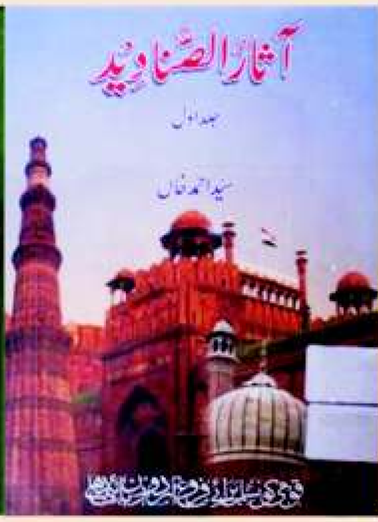

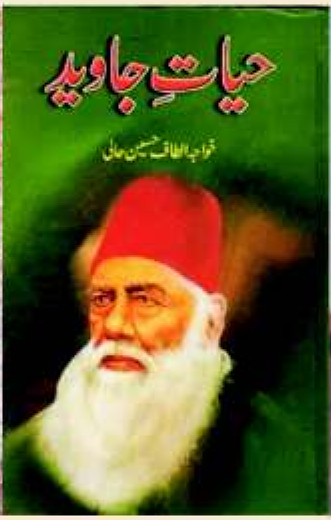

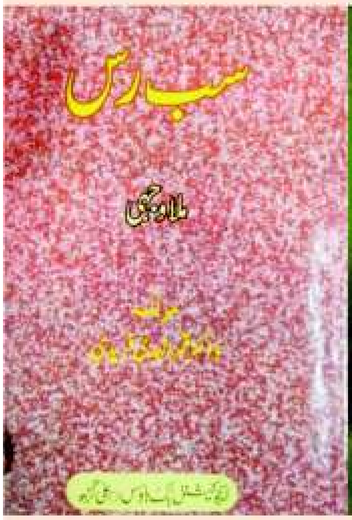

ہے کہ یہ ایسے مکمل و مثالی کام ہیں جن کی نظیر نہ ماضی میں ملتی ہے، نہ عرصے تک مستقبل میں ملنے کی امید ہے۔ یہ کتابیں تدوین کا ایسا بیش بہا خزینہ ہیں جن میں متناہی دولت چھپی ہوئی ہے۔ میرے نزدیک ایسی کتاب تیار کرنے کے لیے پندرہ بیس سال کا عرصہ درکار ہے''[6]

اس کے علاوہ آپ سے متعدد کتابیں مثلاً انتخاب ناسخ، انتخاب سودا، انتخاب نظیر اکبرآبادی، کلاسکی ادب کی فرہنگ، تلاش و تعبیر، تفہیم، املائے غالب، انشائے غالب، غالب فکروفن، فرہنگ مصطلحات ٹھگی وغیرہ منسوب ہیں۔

پروفیسر حنیف نقوی

پروفیسر حنیف نقوی کا شمار اردو کے ان محققین میں ہوتا ہے، جنھوں نے اردو تحقیق کو رفعت و بلندی عطا کی۔ ان کی متعدد تحقیقی و تنقیدی تصانیف منظر عام پر آکر مقبول ہو چکی ہیں۔ ان کی پی، ایچ، ڈی کا تحقیقی مقالہ 'شعرائے اردو کے تذکرے' اردو تذکروں کی تحقیق کے سلسلے میں معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اس میں انھوں نے 'نکات الشعرا' سے لے کر گلشن بے خار تک کے تذکروں کا جائزہ پیش کیا ہے۔

نقوی صاحب کی دوسری اہم کتاب 'انتخاب کربل کتھا' ہے جس کو انھوں نے تفصیلی مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ 1987 میں ان کے سات تحقیقی مقالات پر مشتمل مجموعہ 'تلاش و تعارف' کے نام سے شائع ہوا۔ ان مقالات میں 'حاتم علی بیگ مہر' اور ولایت علی خاں ولایت و عزیز پر بھی مقالات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ رجب علی بیگ سرور سے متعلق چار تحقیقی مقالوں پر مشتمل مجموعہ 'رجب علی بیگ سرور۔ چند تحقیقی مباحث' منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے ذریعے نقوی صاحب نے رجب علی بیگ سرور کے استاذ نوازش کا پتہ چلایا، جو گمنامی کی زندگی گزار رہے تھے۔

نقوی صاحب نے 'میر و مصحفی' کے نام سے چھ مقالات پر مشتمل ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب کے مقالات میں انھوں نے میر اور مصحفی کے شعری اور ادبی رویوں یا تخلیقی محاسن کے بجائے ان کی زندگی اور زمانے سے متعلق حقیقتوں کو بیان کیا ہے۔ رائے بنی نرائن کی حیات وشخصیت اور اس کے 'دیوان جہاں' پر ایک مونوگراف لکھا، جسے انجمن ترقی اردو ہند نے شائع کیا۔ اس کے علاوہ نقوی صاحب نے قاضی عبدالودود کی مرتب کردہ 'مآثر غالب' کو دوبارہ عالمانہ حواشی کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا اور یہ نئی ترتیب و اضافے بہت ہی اہمیت کے حامل ہیں۔

نقوی صاحب نے غالبیات کے سلسلے میں بھی بہت کچھ لکھا۔ انھوں نے اس سلسلے میں اپنے پیش رو اور معاصر محققین کے تحقیقی کارناموں کا باریک بینی سے مطالعہ کیا، اور ان کی فروگزاشتوں کی طرف توجہ بھی دلائی۔ غالبیات کے سلسلے میں ان کی نو تحقیقی مقالات پر مشتمل ایک اہم کتاب 'غالب کی چند فارسی تصانیف' ہے۔ اس کتاب کے ذریعے انھوں نے 'مے خانۂ آرزو سرانجام' کی بحث پر قول فیصل پیش کیا ہے۔ اس کے علاوہ 'پنج آہنگ' سے متعلق بھی عمدہ بحث کی ہے۔

نقوی صاحب کی غالب سے متعلق سوانحی تحقیق پر مشتمل دس مقالات کا مجموعہ 'غالب: احوال و آثار' اور پندرہ مقالات پر مشتمل 'غالب اور جہان غالب' ہے۔ مذکورہ کتابوں کے مقالات میں نقوی صاحب نے اپنے پیش رو اور معاصر محققین سے اختلافات بھی کیے ہیں، اور ان کی فروگذاشتوں کی طرف توجہ بھی دلائی ہے۔ پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی نقوی صاحب کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حنیف نقوی کو میں ایک مدت سے پڑھتا رہا ہوں اور شاید ہی کوئی تحریر ان کی ایسی ملی ہو جسے پڑھ کر میری معلومات میں اضافہ نہ ہوا ہو، یا میری غلط فہمی دور نہ ہوئی ہو۔ یہ ضرور ہے کہ ایک زمانے تک ان کی شہرت کچھ، شہرت شکن، لوگوں کی سی تھی۔ یعنی وہ بڑے بڑے محققین کی غلطیاں یا فروگذاشتیں ڈھونڈنے اور بیان کرنے میں ماہر تھے۔ لیکن آہستہ آہستہ ان کے کام کی بعض ایسی خوبیاں مجھ پر کھلیں جن میں مجھے ان کا کوئی ثانی نظر نہیں آیا''[7]

اس کے علاوہ نقوی صاحب کی تحقیق و تدوین اور ان کے متعلقات پر مشتمل کتاب 'تحقیق و تدوین: مسائل اور مباحث' ہے۔ اس کتاب میں تحقیق و تدوین اور ان کے متعلقات سے متعلق ان کے چودہ مضامین و مقالات شامل ہیں، جو تحقیق و تدوین کے سلسلے میں کافی اہمیت کے حامل ہیں۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اردو میں تحقیق کی روایت کافی مستحکم ہے، لیکن بیسویں صدی بالخصوص اردو تحقیق کے لیے کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس لیے کہ اس صدی میں جو تحقیقی کارنامے منظر عام پر آئے، انھیں بلا مبالغہ اعلیٰ پائے کی تحقیقی کاوشوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔

حواشی

(1) ڈاکٹر خلیق انجم، قاضی عبدالودود سے قبل اردو تحقیق اور متنی تنقید، مشمولہ 'قاضی عبدالودود تحقیقی و تنقیدی جائزے' مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص140

(2) رشید حسن خاں، قاضی عبدالودود بہ حیثیت تبصرہ نگار، مشمولہ 'قاضی عبدالودود تحقیقی و تنقیدی جائزے' مرتبہ پروفیسر نذیر احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ، نئی دہلی، ص131

(3) رشید حسن خاں، تدوین، تحقیق روایت، ایس اے پبلی کیشنز، دہلی، ص179

(4) پروفیسر نثار احمد فاروقی، ایک ممتاز ماہر غالبیات، مشمولہ 'مالک رام محقق اور دانشور' غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی، ص31

(5) پروفیسر نذیر احمد، مالک رام: ایک تاثر، مشمولہ 'مالک رام محقق اور دانشور' غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی ص14

(6) ڈاکٹر گیان چند جین، خدائے تدوین، مشمولہ 'رشید حسن خاں شخصیت اور ادبی خدمات' مرتبہ اطہر فاروقی، ماہنامہ کتاب نما، جامعہ نگر نئی دہلی، ص73

(7) شمس الرحمٰن فاروقی، حنیف نقوی کی جاسوسیاں، مشمولہ 'ارمغان علمی نذر حنیف نقوی' مرتبہ ڈاکٹر سید حسن عباس، مرکز تحقیقات اردو و فارسی گوپال پور، سیوان، بہار، ص92-191

■

Md. Rashid Iqbal
Research Scholar, Dept of Urdu
Aligarh Muslim University
Aligarh - 202001 (UP)
Mob.:8410517510

محمد اسد

سیاسی و مذہبی جبر اور 'انگارے'

جبر دراصل مقتدر طبقات یا صاحب اختیار کی جانب سے طاقت کا بے جا، غیر منصفانہ اور کبھی کبھی ظالمانہ استعمال ہوتا ہے۔ جبر کی اس تعریف میں عوام کے مصائب و آلام اور اس کے بوجھ تلے دبے ہونے کا احساس بھی شامل ہے۔ ہندوستان میں تقریباً دو سو سال کے برطانوی تسلط کے عہد میں برطانوی حکومت نے اپنے مقاصد کی تکمیل کے لیے ہر طرح کے جبر کو روا رکھا اور مختلف حربے استعمال کیے۔ انگریز مورخین نے دانستہ اور منصوبہ بند طریقے سے مخصوص طرز کی تاریخ نویسی کی بنیاد ڈالی، انھوں نے یہ نظریہ پیش کیا جسے 'وہائٹ مینس برڈین تھیوری' کے نام سے جانا جاتا ہے، جس کا لب لباب یہ ہے کہ سفید فام نسل کو خدا نے یہ ذمے داری سونپی ہے کہ وہ بنی نوع انسان کو مہذب بنائیں۔ انگریزی استعمار کا یہ نظریہ کچھ اور نہیں بلکہ سیاسی و تہذیبی جبر کی ہی ایک صورت ہے۔

بغور دیکھیں تو جبر کے کئی اقسام ملتے ہیں، مثلاً سیاسی، سماجی، اقتصادی، مذہبی و ریاستی جبر۔ ساتھ ہی ساتھ صنفی امتیاز کا جبر بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ یہ بالکل فطری بات ہے کہ جہاں جبر ہوگا وہاں مختلف قسم کے حقوق اور آزادی سلب ہوگی اور ان کی بازیابی کے لیے احتجاج و مزاحمت اور جدو جہد بھی ناگزیر ہوگی۔ جدو جہد کی یہ نوعیت عوامی سطح پر الگ ہوگی اور ادبی سطح پر مختلف۔ دنیا کی مختلف زبانوں کی ادبیات میں ہر قسم کے جبر کے خلاف احتجاج و مزاحمت کا رویہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس کے لیے 'مزاحمتی ادب' نام سے باضابطہ ڈسکورس یا کلامیہ موجود ہے۔

انقلاب 1857 سے پورے برصغیر میں کہرام برپا ہوا۔ برطانوی سامراج کی ملک گیری کی ہوس اور سیاسی جبر کے برے نتائج و اثرات دنیا کے دیگر براعظموں کے ساتھ ساتھ پورے برصغیر پر بھی مرتب ہو رہے تھے اور مرزا غالب جیسے حساس شاعر نے ان المناک واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور اپنے تجربات و مشاہدات کو اپنی تخلیقات میں جگہ دی لیکن عملی طور پر غالب انگریزوں کے خلاف احتجاج و مزاحمت میں مصلحتاً شامل نہیں ہوئے اس لیے کہ انھیں خدشہ تھا کہ کہیں ان کا بھی انجام، صہبائی، مولوی محمد باقر، اور مولانا فضل حق خیر آبادی جیسا نہ ہو۔ اس عہد میں انگریزوں نے پورے ملک کو چھاونی اور کیمپ میں تبدیل کر دیا تھا۔ بعد کے ادوار میں اکبر الہ آبادی کے یہاں جو طنز کی صورت ملتی ہے وہ برطانوی سامراج کے ریاستی، مذہبی جبر کے خلاف مخصوص انداز میں احتجاج و مزاحمت کی بالواسطہ مثال ہے۔ دیکھا جائے تو اردو شاعری کا بیشتر حصہ نظام جبر کے خلاف سراپا احتجاج ہے۔ اردو شاعری سے قطع نظر اردو افسانوی ادب کی بیشتر تخلیقات میں بھی ریاستی و مذہبی اور صنفی تفریق کے جبر کے خلاف احتجاج و مزاحمت کی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔

مجموعہ 'انگارے' کے افسانوں کے مرکزی خیال پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ زیادہ تر افسانوں میں مذہبی ریاکاری، منافقت اور سماج میں عورتوں کی ناگفتہ بہ حالت کے خلاف ایک احتجاج کی آواز بلند کی گئی تھی۔ آج بھی ہم پدری نظام معاشرت اور مذہبی ریاکاری و منافقت سے برسر پیکار ہیں اور عورتوں کے خلاف ہونے والے امتیازی سلوک کے خلاف نبرد آزما ہیں۔ ان افسانوں میں ہندوستانی سماج کے جن خطرناک رجحانات اور مذہبی جبر کے خلاف خامہ فرسائی ہوئی ان میں سجاد ظہیر کا لہجہ شدید تر تھا اور وہ اس معاملے میں پیش پیش تھے جبکہ دیگر مصنفین کے یہاں اتنی شدت نہیں تھی۔ بات یہ ہے کہ سجاد ظہیر مذہبی اجارہ داروں کے سخت خلاف تھے۔

مجموعہ 'انگارے' کے خلاف پورے ہندوستان میں فتوے جاری کیے گئے، جن میں 'انگارے' کو مذہبی جذبات کو ٹھیس پہنچانے والا، فحش، اخلاقیات کے خلاف، مذہب دشمن اور مسلمانوں کے مذہبی عقائد و جذبات کو مجروح کرنے کی گھناؤنی سازش قرار دیا گیا لیکن دوسری طرف مجموعے کی ستائش اور حمایت کرنے والے ادیبوں مثلاً نیاز فتح پوری، مولوی عبدالحق اور مدیر 'زمانہ' کانپور دیا نرائن نگم وغیرہ کی بھی کمی نہیں تھی۔ مخالفت اور تنقید کرنے والوں کا اپنا نقطہ نظر، ان کے اپنے دلائل رہے ہوں لیکن سچائی تو یہ ہے کہ 'انگارے' کے مصنفین اس دور کے سب سے بڑے روایت شکن ثابت ہوئے جو جیمس جوائس کے

گرویدہ اور ڈی ایچ لارینس، چیخوف اور میکسم گورکی کے افکار و نظریات سے متاثر تھے۔

انگارے کی اشاعت کا بنیادی مقصد ادبی تھا لیکن مجموعی طور پر یہ مجموعہ چونکہ اس دور کے زوال پزیر اور شکست خوردہ سماج اور فرسودہ تہذیبی عناصر کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا اس لیے بیشتر نقادوں کو اس کے پس منظر میں مارکسی شعور کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ اور یہی بات حکومتِ وقت کے لیے بھی زیادہ پریشان کن تھی کیونکہ برطانیہ اس وقت دنیا کے کئی محاذوں پر مارکسزم کے خلاف ایک نظریاتی جنگ بھی لڑ رہا تھا۔ انگارے کی اشاعت سے مذہب کے ان جامد تصورات پر براہِ راست کاری ضرب لگی جو صدیوں سے معاشرے میں حرفِ آخر گردانے جاتے تھے۔ دیکھا جائے تو مذہبی جبر اور فرسودہ سماجی اصولوں (سماجی جبر) کے خلاف لکھنا کسی بند معاشرے میں نہایت مشکل کام ہے لیکن پھر بھی مصنفین نے ان موضوعات پر کھل کر اظہار کیا۔ ڈاکٹر انور سدید نے انگارے کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ:

''انھوں نے ماحول کے نئے تقاضوں کے مطابق ادیب کی آزادی کا حق طلب کیا۔ ادب اور زندگی کے مقاصد کا تعین کیا اور ادب کو زندگی اور ماحول کا ترجمان قرار دیا۔'' (ڈاکٹر انور سدید، اردو ادب کی تحریکیں، ص 459)

'انگارے' کے سبھی مصنفین کے خیالات و نظریات ایک دوسرے سے مختلف تھے لیکن روایت سے انحراف اور بغاوت کا عنصر اور حق تک رسائی حاصل کرنے کے جذبات ضرور مشترک تھے۔ رشید جہاں نے ہر طرح کے جبر کی شکار اس عورت کو پیش کیا جو مرد کے بنائے ہوئے سماجی اصولوں پر عمل پیرا ہونے کو مجبور ہے دراصل یہی زاویہ نگاہ سجاد ظہیر کے ڈرامے 'بیمار' اور ان کے دوسرے افسانے 'نیند نہیں آتی' میں مختلف شکلوں میں سامنے آتا ہے اور دونوں جگہ جنس مخالف کے تئیں اس ناہموار رویے کو ظاہر کیا گیا ہے جو معاشرے میں رائج تھا۔

'انگارے' معاشرے کی بوسیدہ رسوم، فرسودہ تصورات کے جبر پر شدید اعتراض تھا۔ یہ مروجہ سماجی سیاسی اور مذہبی اداروں کے خلاف متوسط طبقے کے نوجوان قلمکاروں کی طرف سے ایک اعلان جنگ تھا۔ بعض فنی خامیوں کے باوجود اس مجموعے کی اہمیت یہ ہے کہ اس نے جدید ہندوستانی معاشرے میں پدری نظامِ معاشرت کے غلبے اور جنسی تفریق کے جبر کی طرف توجہ دلائی تھی اور معاشرت کے چہرے پر صدیوں پرانے مصنوعی رنگ و غازہ کو دھل دیا تھا۔ مولویوں کی جھوٹی مذہبیت پر، جس کا دین و مذہب سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، ان کو بڑی قوت کے ساتھ نشانہ بنایا گیا تھا۔ اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے کے لحاظ سے اردو افسانہ نگاری جیسی نوزائیدہ صنف نے ابتدا ہی سے معروضی زندگی کی پیش کش کو اپنا شعار بنا لیا تھا۔ انگارے نے ان ممنوعہ موضوعات پر بھی اظہار کو ممکن بنایا جن پر ابھی تک قدغن لگے ہوئے تھے۔ اس کے علاوہ اس نے اس طرف بھی توجہ دلائی کہ اخلاقیات، مذہب سے علاحدہ بھی کوئی شئے ہے جو سوشلائزیشن، جغرافیائی ماحول اور تعلیم و تربیت سے فروغ پاتی ہے۔ اس تصور نے جہاں دقیانوسیت کے اجارہ داروں اور روایت پرستوں کو بوکھلا دیا وہیں دوسری جانب لکھنے والوں کو نئی بصیرت اور حوصلہ بھی عطا کیا۔

آگے چل کر ترقی پسندوں نے انگارے کی ہی رکھی بنیادوں پر ادب میں قنوطیت، یاسیت اور رجعت پسندی کی شدت سے مخالفت کی کیونکہ کی یہ سبھی منفی عناصر معاشرے کی فطری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں خصوصاً یاسیت امید کا گلا گھونٹ دیتی ہے جس کے نتیجے میں معاشرے میں بے عملی کی زندگی اور کاہلی کا دور دورہ ہو جاتا ہے، زندگی کا تحرک رک جاتا ہے، اس طرح ادب میں بھی منفی عناصر در آتے ہیں۔ ترقی پسندوں کے ہاں روشن خیالی تھی اور ان کی تصانیف میں باغیانہ تیور کی کارفرمائی تھی۔ ترقی پسند تحریک کے عہد کا فکشن بنیادی طور پر پریم چند کی سماجی حقیقت نگاری کا ہی اگلا مرحلہ ہے۔ لہٰذا جن ترقی پسند افسانہ نگاروں نے زندگی کو غیر جانبداری و معروضی انداز سے دیکھا اور نظریاتی انتہا پسندی کا شکار ہوئے بغیر اسے تخلیقی رعنائی سے موضوع بنایا ان کے افسانوں میں حقیقت اور تخیل کے امتزاجی عمل کی کارفرمائی ملتی ہے انھوں نے شاہکار اور زندہ و جاوید افسانے لکھے۔ ترقی پسند افسانے کا دورِ عروج انھیں افسانہ نگاروں سے عبارت ہے اور ان کی عظمت و اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ ان کے یہاں ہر طرح کے جبر کے خلاف احتجاج و مزاحمت کے واضح نقوش ملتے ہیں۔ ترقی پسند افسانے کی روایت کا آغاز پریم چند کی حقیقت نگاری سے ہوتا ہے اور ان کا افسانہ 'کفن' اس کی بہترین مثال ہے، ان کی کہانیوں میں ہندوستانی سماج اپنے اصل روپ میں دکھائی دیتا ہے۔ انھوں نے انسانی عظمت اور محنت کو اپنے فن کا محور و مرکز بنایا ہے، اس لیے پریم چند اولین ترقی پسند افسانہ نگار تسلیم کیے جاتے ہیں۔

انگارے کی اشاعت کا بنیادی مقصد ادبی تھا لیکن مجموعی طور پر یہ مجموعہ چونکہ اس دور کے زوال پزیر اور شکست خوردہ سماج اور فرسودہ تہذیبی عناصر کے خلاف اعلانِ بغاوت تھا اس لیے بیشتر نقادوں کو اس کے پس منظر میں مارکسی شعور کی جھلکیاں نظر آتی تھیں۔ اور یہی بات حکومت وقت کے لیے بھی زیادہ پریشان کن تھی کیونکہ برطانیہ اس وقت دنیا کے کئی محاذوں پر مارکسزم کے خلاف ایک نظریاتی جنگ بھی لڑ رہا تھا۔

'انگارے' میں شامل افسانوں اور اس عہد کے دیگر افسانوں کے تفصیلی مطالعے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان میں ہندوستان کے سماجی و معاشرتی جبر اور ناہمواریوں کے خلاف ایک کڑی تنقید ہے۔ ساتھ ہی اس پورے عہد میں انگریزی استعمار کے سیاسی جبر اور بدعنوانیوں کے خلاف بھی آواز بلند ہوئی تھی۔ خاص طور سے برطانوی نوآبادیات کے استحصالی نظام پر کاری ضرب لگائی گئی تھی۔ برطانوی حکومت نے غربت و افلاس، طبقاتی نظام اور زمیندارانہ روایات کی پاس داری اور عوام کو جہالت کے اندھیرے میں ڈوبے رہنے پر مجبور کیا اور اپنے اقتدار کو جاری رکھنے کا آزمودہ نسخہ اپنایا لیکن 'انگارے' کے مصنفین نے اپنے افسانوں کے ذریعے اسی سیاسی جبر کو چیلنج کیا۔ لہٰذا اس کی پاداش میں 'انگارے' کو مذہبی و سیاسی جبر کا شکار ہونا پڑا۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرتی دباؤ اور نقضِ امن کے لیے لاحق خطرات کو جواز بنا کر اس پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس عہد کے بیشتر افسانے بنیادی طور پر سیاسی جبر کے خلاف سراپا احتجاج و مزاحمت تھے۔ ایسا کہا جاتا ہے کہ جبر و استبداد کے دور میں ادیب و شاعر اور بھی حساس و سرگرم ہو جاتا ہے اور جب سماجی و سیاسی جبر کے نتیجے میں قدغنیں بڑھتی ہیں تو ادیب و فن کار اپنے فن کے ذریعے اتنی ہی شدت کے ساتھ اس کی مخالفت بھی کرتا ہے۔ لہٰذا عام ادوار کے مقابلے اس عہد میں اردو افسانوں نے زیادہ ترقی کی اور اسی پس منظر میں بے شمار افسانے تخلیق کیے گئے۔ ترقی پسندوں نے بھی اپنے مخصوص انداز میں 'انگارے' کی روایت کو آگے بڑھایا اور آگے چل کر جدیدیت کے رجحان سے متاثر افسانہ نگاروں نے بھی جبر کے خلاف علامت و استعارہ کے پردے میں احتجاج ہی کو پیش کیا۔

■

Mohammad Asad
Research Scholar
Department of Urdu, Delhi University, Delhi
Mobile: 7531908218
Email : mohammadasad87@gmail.com

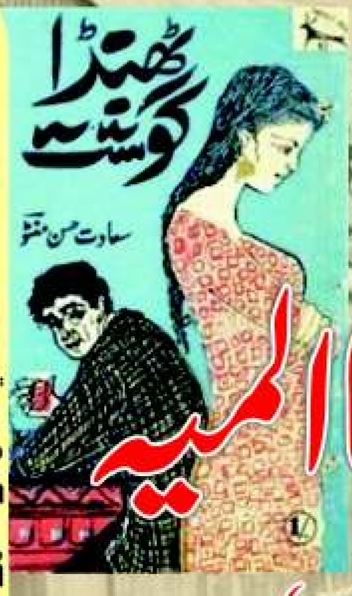

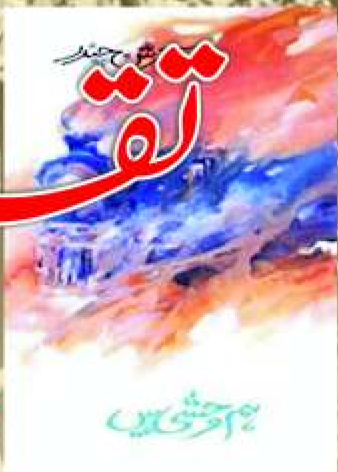

رضوان احمد

تقسیم ہند کا المیہ

(اردو افسانے کے حوالے سے)

انسانی زندگی میں کچھ لمحے ایسے بھی آتے ہیں جو اس میں ہلچل مچا دیتے اور سکون وچین کو غارت کر دیتے ہیں۔ آج سے تقریباً 70 سال قبل بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا جب ایک دن ایک عظیم سازش کے تحت ہندوستان کے دو ٹکڑے کر دیے گئے۔ اس کے بعد برصغیر کے نقشے پر ابھرنے والے دو ملکوں میں قتل وغارت اور خوں ریزی کا حیوانی کھیل کھیلا گیا۔

ہزاروں جانیں تلف ہوئیں، عورتیں، مرد، بوڑھے اور بچے بے دریغ موت کے گھاٹ اتار دیے گئے۔ فرقہ وارانہ فسادات پورے ملک میں پھوٹ پڑے۔ ان میں نہ صرف ہندوؤں نے مسلمانوں کو اور مسلمانوں نے ہندوؤں کو لوٹا بلکہ خود ہندوؤں نے ہندوؤں کو اور مسلمانوں نے مسلمانوں کو لوٹا۔ بڑے پیمانے پر اجتماعی عصمت دری اور آبروریزیاں کی گئیں اور گاؤں اور محلوں کو نذر آتش کر دیا گیا۔ ان واردات نے افسانہ نگاروں کو بہت شدت سے متاثر کیا۔ سماج کی خوف ناک صورت حال نے ان کے قلم کا رُخ موڑ دیا۔ وہ تقسیم ملک کو غیر فطری اور فسادات کو غیر انسانی عمل قرار دینے لگے۔ افسانہ نگاروں کو ایک سلگتا ہوا موضوع ملا اور اس پر بہت کچھ لکھا گیا۔

ادب اپنے عہد کے سماجی جذبات، احساسات، فکر و فلسفہ، مسرتوں اور حیرتوں، مصائب و مسائل، نیز خواہشات وخطرات کا ترجمان اور عکاس ہوتا ہے لہٰذا اردو افسانوں نے بھی ان موضوعات کو سمیٹا اور سرحد کے دونوں جانب جغرافیائی اور بازآبادکاری کے مسائل کو اس وقت کے ادب میں پیش کیا گیا۔

فسادات پر لکھنے والوں میں منٹو، کرشن چندر اور بیدی کے نام اہمیت کے حامل ہیں۔ کرشن چندر نے ان حالات کے سیاسی پہلوؤں کو زیر غور رکھا ہے اور انسان کے اندر چھپے وحشیانہ جذبات کو اجاگر کیا۔ اسی طرح بیدی نے سماجی پس منظر میں فسادات کے نتائج کو بیان کیا ہے اور سماجی رشتوں اور اقدار کی شکست وریخت کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا لیکن منٹو نے ان کے نفسیاتی اور جنسی پہلوؤں کو اجاگر کیا اسی طرح قومی ومذہبی جوالامکھی کو پھٹتے ہوئے دکھایا ہے۔ جہاں انسانیت ٹوٹ کر بکھر چکی تھی۔

فسادات پر منٹو نے سب سے زیادہ اور سب سے اچھا بھی لکھا۔ یہ بات الگ ہے کہ اس موضوع پر کرشن چندر کا افسانوی مجموعہ 'ہم وحشی ہیں' 1947 میں سب سے پہلے منظر عام پر آ گیا تھا۔ اس میں چھ اہم افسانے تھے جن میں 'پشاور ایکسپریس'، 'امرتسر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' اور 'ایک طوائف کا خط'، بہت اہم ہیں 'امرتسر آزادی سے پہلے اور آزادی کے بعد' میں کرشن چندر نے ہندو مسلم اور سکھ عیسائی کے آپسی میل ملاپ اور قومی بھائی چارے کو دکھایا ہے۔ کس طرح وہ آپس میں مل کر ملک کی آزادی کے لیے انگریزوں سے لڑ رہے تھے اور شہادت حاصل کرنے کے لیے ایک دوسرے سے سبقت لے جا رہے تھے۔ کرشن چندر نے تمثیلی حقائق بھی اس میں بیان کیے ہیں۔ مثلاً امرتسر کی چار عورتیں زینب، بیگم، شام کور اور پارو جب بازار سے لوٹ رہی ہوتی ہیں، یکایک شہر میں کرفیو لگ جاتا ہے اور انگریز سپاہیوں کو ان پر ظلم کرنے کا موقع مل جاتا ہے، وہ گولی سے تینوں کو بھون دیتا ہے اور آخر میں پارو کی باری آتی ہے تو وہ چاہتی تو بھاگ سکتی تھی لیکن وہ قومی حمیت کا ثبوت دیتی ہے اور یہ کہہ کر جام شہادت نوش کر لیتی ہے کہ:

''میرے پتی دیو، میرے بچو، میری ماں جی، میرے پتا جی، میرے ویرو مجھے چھما کرنا— آج مجھے بھی مرنا ہوگا۔ میں مرنا نہیں چاہتی پھر بھی مجھے مرنا ہوگا۔ میں اپنی بہنوں کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔'' (امرتسر آزادی سے پہلے)

لیکن آزادی کے بعد امرتسر کا بھائی چارہ ختم ہو گیا۔ امرتسر قتل وغارت گری اور وحشت وبربریت کا مرکز بن گیا۔

''پھر آزادی کی رات آئی۔ دیوالی پر بھی ایسا چراغاں نہیں ہوا تھا کیونکہ دیوالی پر تو دیے جلتے ہیں یہاں گھروں کے گھر جل رہے تھے۔ دیوالی پر آتش بازی ہوتی ہے۔ پٹاخے چھوٹتے ہیں، یہاں بم پھٹ رہے تھے اور مشین گنیں چل رہی تھیں۔'' (امرتسر آزادی کے بعد)

پشاور ایکسپریس کی تکنیک بہت دل چسپ ہے۔ اس میں ریل جیسی بے جان چیز سے کرشن چندر نے فسادات کی روداد سنوائی ہے۔ ٹرین ہندو اور مسلمان پناہ گزینوں کو لے کر ہندوستان اور پاکستان آ جا رہی تھی۔ ان میں سرحد بدلنے کے ساتھ سپاہی بھی بدل رہے تھے۔ ٹرین پاکستان سے ہندو پناہ گزینوں کو لے کر ٹیکسلا اسٹیشن پر پہنچتی ہے تو مسلمانوں کا جتھا اس پر حملہ کر دیتا ہے پورے دو سو آدمی نکالے جاتے ہیں۔ بلوچی سپاہی ان دو سو آدمیوں کو گولی سے مارتے جاتے ہیں۔ اسی کے ساتھ ساتھ کرشن چندر ٹیکسلا شہر کی عظمت رفتہ بھی یاد دلاتے جاتے ہیں۔ مثلاً یہاں ایشیا کی سب سے بڑی یونیورسٹی تھی، عجائب گھر تھا، کنشک نے یہاں حکومت کی تھی، بدھ کا نغمۂ عرفان یہاں گونجا تھا، یہ شہر کبھی علم وادب، تہذیب وفنون، مذہب وملت اور امن وآشتی کا گہوارہ تھا جو آج فسادات کی آگ میں جل رہا تھا۔

کرشن چندر نے اسی افسانے میں ہندوستان سے

پاکستان جاتے ہوئے مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا ذکر بھی اسی طرح کیا ہے۔ اٹاری پہنچ کر فضا بدل گئی بلکہ مغل پورہ سے ہی بلوچی سپاہی بدل چکے تھے اور ان کی جگہ ڈوگروں اور سکھ سپاہیوں نے لے لی تھی۔ آگے کا حال پیشاور ایکس پریس اس طرح بیان کرتی ہے:

''اٹاری پہنچ کر تو مسلمانوں کی اتنی لاشیں ہندو مہاجرین نے دیکھیں کہ ان کے دل فرط مسرت سے باغ باغ ہو گئے۔ آزاد ہندوستان کی سرحد آگئی تھی ورنہ اتنا حسین منظر کہاں دیکھنے کو ملتا۔ میں جب امرتسر اسٹیشن پر پہنچی تو یہاں بھی مسلمانوں کی لاشوں کے ڈھیر کے ڈھیر تھے۔'' (پیشاور ایکسپریس)

سعادت حسن منٹو نے بھی ان موضوعات پر شاہکار افسانے لکھے ہیں۔ مثلاً ٹوبہ ٹیک سنگھ، ٹھنڈا گوشت، موذیل، کھول دو، یزید، سہائے وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو بھرپور تاثر دیتے ہیں اور ان میں موضوع کے ساتھ فنی حسن کا بھی پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔

منٹو نے فسادات کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ ہجرت کے کرب اور انسانیت کی چیخ و پکار نے انھیں 'سیاہ حاشیے' جیسا افسانوی مجموعہ شائع کرنے پر مجبور کر دیا۔ ان میں قتل، عصمت دری، لوٹ مار، پولیس کی بدعنوانی جیسے موضوعات کو طنز و مزاح کے پیرائے میں بیان کیا گیا تھا جس سے انسان کی حیوانیت اور وحشت سامنے آجاتی ہے۔ تقسیم، مناسب کارروائی، کرامات، جیلی، تعاون، حلال اور جھٹکا، مزدوری، پٹھانستان، گھاٹے کا سودا، صفائی پسند، الہانا، ہمیشہ کی چھٹی، آرام کی ضرورت وغیرہ اس کی عمدہ مثالیں ہیں۔

''مرا نہیں— دیکھو ابھی جان باقی ہے۔''

''رہنے دو یار— میں تھک گیا ہوں۔'' (آرام کی ضرورت)

اسی طرح صفائی پسندی میں ایک شخص ٹرین میں چھپے ایک آدمی کو قتل کرتا ہے تو اس کی صفائی پسندی دیکھیے۔

''جی معلوم نہیں، آپ اندر جا کر سنڈاس میں دیکھ لیجیے۔''

''نیزا بردار داخل ہوئے، سنڈاس توڑا گیا تو اس میں سے ایک مرغا نکل آیا، ایک نیزا بردار نے کہا۔

''کر دو حلال۔''

''نہیں، یہاں نہیں، ڈبہ خراب ہو جائے گا۔ باہر لے چلو۔'' (صفائی پسند)

منٹو نے 'سیاہ حاشیے' کے تمام افسانوں میں شیطان صفت خصلت کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے نیز قاری کے لیے ان واقعات کو بلا تبصرہ چھوڑ دیا۔

دوسرے افسانہ نگاروں کی بہ نسبت منٹو کے افسانے دلوں کے زیادہ قریب ہیں اور تمام تر فنی تقاضوں کو بھی پورا کرتے ہیں۔ 'سیاہ حاشیے' کے بعد منٹو نے فسادات پر بار بار لکھا ہے۔ مثلاً 'ٹھنڈا گوشت' اس کا پس منظر فسادات کے مقابلے میں نفسیاتی زیادہ ہے۔ ایشر سنگھ ایک رات ایک ہی خاندان کے چھ افراد کو قتل کر کے ان کی نوجوان لڑکی کو لے بھاگتا ہے تا کہ اس کی عصمت سے کھیل سکے۔ لیکن عین وقت پر معلوم ہوتا ہے کہ لڑکی کا جسم ٹھنڈا پڑ چکا ہے۔ وہ مردہ ہے اس کے بھڑکے ہوئے جذبات یکا یک سرد ہو جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ کے لیے مفلوج ہو کر رہ جاتا ہے۔

''اسی طرح 'موذیل' کا پس منظر بھی فرقہ وارانہ فساد ہے جو بمبئی میں برپا ہوا تھا:

''ترلوچن سنگھ اپنی منگیتر کو لینے جاتا ہے، لیکن فسادیوں کے گروہ میں پھنس جاتا ہے، ایسے موقع پر 'موذیل' جو سماج کی عصمت فروش لڑکی ہے، ترلوچن اور اس کی منگیتر کو بچانے لیے جھوٹ بھی بولتی ہے، ڈھونگ بھی رچتی ہے اور وقت آنے پر خود عریاں ہو کر اسے پوشاک بھی بخش دیتی ہے۔ اس نے مذہب اور اخلاق کی اونچی کتابیں نہیں پڑھ رکھی تھیں لیکن کسی کی زندگی بچانا اولین فرض جانتی تھی، اپنی عصمت سے بھی زیادہ قیمتی اور اہم— موذیل زخمی ہو کر گر جانے کے بعد کہتی ہے۔'' لے جاؤ، اپنے اس مذہب کو۔'' اس کے بعد اس کا مضبوط بازو اس کی چھاتیوں پر بے حس ہو کر گر جاتا ہے۔'' (موذیل)

اسی طرح 'شریفن' میں جنونی اور انتقامی کیفیت کو دکھایا گیا ہے۔ قاسم جب گھر میں داخل ہوتا ہے تو وہاں اس کی بیوی اور بیٹی کی مردہ اور برہنہ لاشیں ملتی ہیں، وہ انتقام کی آگ میں جھلستا ہوا باہر نکلتا ہے اور بلوائیوں پر دیوانہ وار ٹوٹ کر تین لاشیں مار گراتا ہے۔

منٹو کے افسانوں میں یہ جنونی کیفیت مختلف انداز سے نظر آتی ہے۔ اپنے ایک اور افسانے 'کھول دو' میں منٹو نے دکھایا ہے کہ فساد میں بچھڑی ہوئی ایک مسلم نوجوان لڑکی سکینہ کی کس طرح خود مسلم رضا کار نوجوانوں کی ذریعے آبروریزی ہوتی ہے۔ ان رضا کاروں نے سراج الدین جیسے بوڑھے شخص کے آخری سہارے کو بھی باقی نہیں چھوڑا۔ دس دنوں تک وہ ان کی عفت و عصمت سے کھلواڑ کرتے رہے، پھر سکینہ کی نیم مردہ لاش ریلوے لائن پر پھینک کر چلے گئے۔ منٹو کے دیگر افسانوں کی طرح یہ افسانہ بھی فنی اعتبار سے مکمل اور شاہ کار ہے نیز حقیقت پر مبنی انتہائی چبھتا سوال ہے۔ جس کے جواب کے لیے انسانیت کے گریبان میں جھانکنا پڑے گا۔

اس سلسلے میں ایک تیسرا نام راجندر سنگھ بیدی کا آتا ہے۔ انھوں نے تقسیم اور فسادات کو بہت قریب سے دیکھا بلکہ خود بھی اس سانحے سے دوچار ہوئے۔ ''لاجونتی'' ان کا ایسا ہی افسانہ ہے جو ایسی عورتوں کی داستان بیان کرتا ہے جنھیں بلوائی پکڑ کر لے گئے، پھر وہ اپنی لٹی عصمتوں کے بعد ان کے رشتے داروں کو کہیں مل گئیں، اب مسئلہ تھا انھیں کس طرح دوبارہ دلوں میں بسایا جائے۔ یہ ایک صرف لاجونتی کا ہی المیہ نہیں تھا بلکہ ایسی سارائیں، نازنین، اختری اور کچھ دوسری خواتین بھی تھیں، جنھیں سماج نے صرف اس لیے قبول نہیں کیا کہ وہ اپنی عصمتیں لٹا کر آئی تھیں۔

عصمت چغتائی کے شاہکار افسانے 'جڑیں' اور 'اپنا وطن' عزیز احمد کا افسانہ 'کالی رات' حیات اللہ انصاری کا افسانہ 'شکر گزار آنکھیں' خواجہ احمد عباس کے افسانے 'کون ہوں میں'، 'انتقام'، 'اجنتا میں' سہیل عظیم آبادی کا افسانہ 'اندھیارے میں ایک کرن' اختر اور ینوی کا افسانہ 'آج کل اور آج' ست پرکاش کا افسانہ 'آوازیں' قدرت اللہ شہاب کا افسانہ 'یا خدا!' پرکاش پنڈت کا افسانہ 'سراغ' ممتاز حسین کے افسانے 'سورج سنگھ' اور 'بن لکھی رزمیہ' خدیجہ مستور کے افسانے 'تین عورتیں'' اور 'منیوں بے چلا بابلا' رام لعل کا افسانہ 'ایک شہری پاکستان کا' یہ سب وہ افسانے ہیں جن میں تقسیم اور فسادات کے دل فگار واقعات بیان ہوئے ہیں، انھیں وہی پڑھ سکتا ہے جس کا دل پتھر کا ہو یا وہ مضبوط اعصاب کا مالک ہو۔

تقسیم ہند نے برصغیر کی سائیکی پر بہت منفی اثر ڈالا، خوف و دہشت نے سارے خواب چھین لیے، ساری آرزوئیں سلب کر لیں۔ آج بھی جب ان واقعات پر لکھے افسانے نظر سے گزرتے ہیں تو روح کانپنے لگتی ہے۔ تقسیم ہند پر مبنی اردو افسانوں کے حوالے سے انگریزی میں بھی بہت کچھ لکھا گیا ہے کہ اردو میں بہت ہی فنکارانہ انداز میں تقسیم ہند کی عکاسی کی گئی ہے۔ آلوک بھلا نے Stories about the partition of India مرتب کی تو محمد عمر میمن جیسے افسانہ نگار، مترجم نے An Epic Unwritten: The Pengiuin Book of partition stories کے نام سے ایڈٹ اور ترجمہ کیا ہے۔ اسی طرح کی اور بھی کتابیں انگریزی میں شائع ہوئیں جس سے یہ اندازہ لگانا بہت آسان ہے کہ اردو میں تقسیم ہند اور فسادات پر بہت ہی عمدہ افسانے لکھے گئے ہیں۔

■

Rizwan Ahmad
S-13/1 Pahalwan Chowk,
Jogabai Extension, Jamia Nagar
New Delhi-110025
rizwanalauddin1985@gmial.com

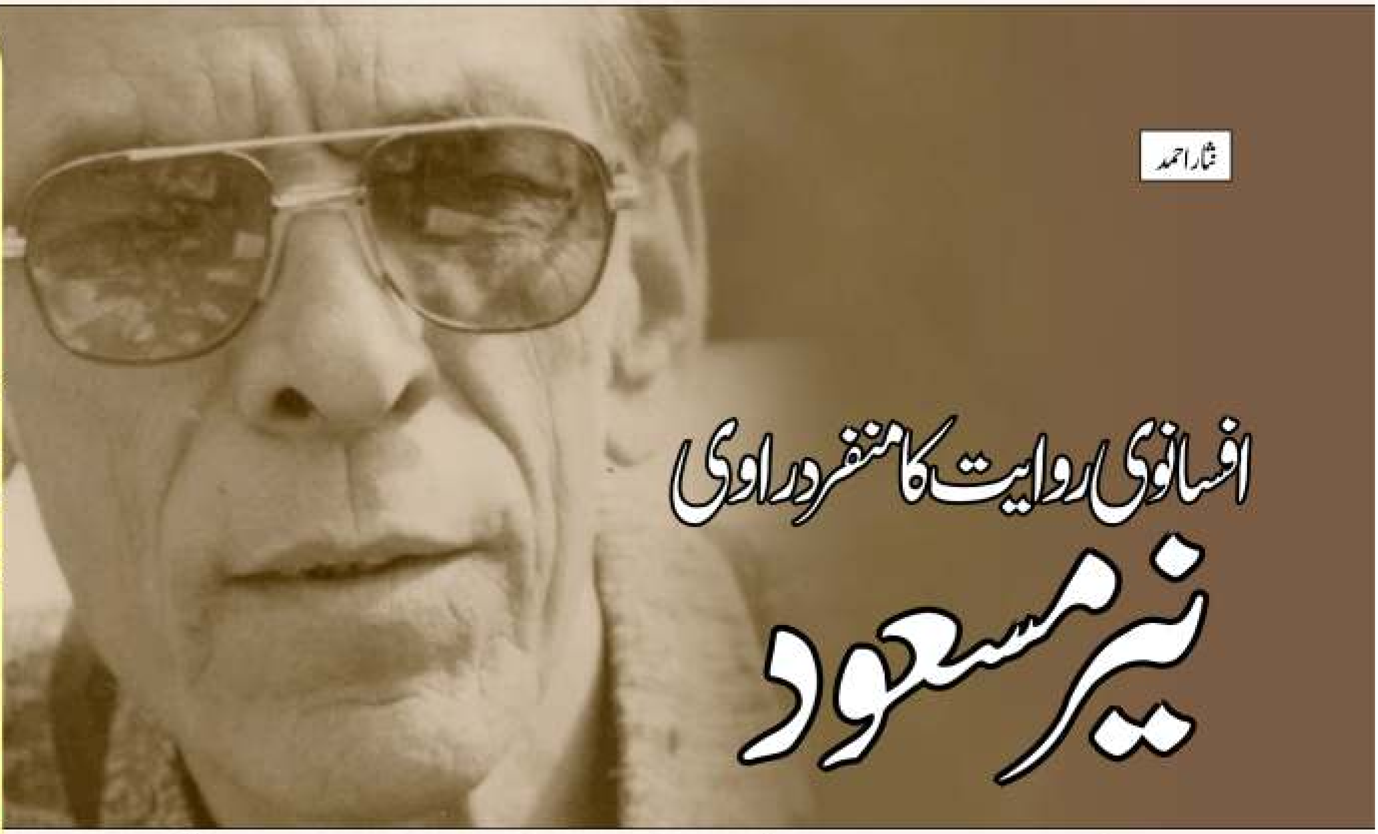

نثار احمد

افسانوی روایت کا منفرد راوی
نیر مسعود

نیر مسعود اردو کے ایک ممتاز افسانہ نگار ہیں۔ ان کے افسانوی امتیاز کی بہت سی وجوہات ہیں جو انھیں ان کے تمام معاصرین سے منفرد بناتی ہیں۔ نیر مسعود نے ایسے وقت میں افسانے لکھنے شروع کیے جب افسانہ نگار جدیدیت کے زیر اثر خالص علامتی اور ابہام زدہ افسانے لکھ رہے تھے۔ ترقی پسند افسانے کے بعد افسانہ نگاری کا یہ اسلوب افسانوی تخلیقات کی شناخت بن چکا تھا۔ اس عہد میں شاید ہی کوئی ایسا افسانہ نگار ہو جس نے اس مخصوص رنگ میں لکھنے کی کوشش نہ کی ہو مگر نیر مسعود واحد ایسے افسانہ نگار ہیں جن کا افسانہ جدیدیت کے پیدا کیے ہوئے اسالیب کے ساتھ ان کے منفرد اسلوب سے بھی پہچانا گیا۔

نیر مسعود نے افسانہ نگاری ایک بہت بھر پور علمی اور تحقیقی زندگی گزارنے کے بعد شروع کی، وہ ایک لمبے عرصے تک لکھنؤ کی تہذیب وثقافت اور اس کی خاک میں چھپی ہوئی بہت سی نایاب صورتوں کو سنوارنے میں لگے رہے، انھوں نے فارسی اور انگریزی سے بہت سے تراجم بھی کیے۔ ان تمام حوالوں سے ان کی ایک شناخت مستحکم ہو چکی تھی۔ اسی لیے ان کی اولین کہانیوں کے ساتھ ہی ان کے پڑھنے والوں کا ایک حلقہ بن گیا لیکن کہانیاں پڑھنے کی روایتی تربیت نے ان کے قارئین کو بہت دیر تک ان سے جوڑے نہیں رکھا۔ نیر مسعود کے بارے میں بہت شدت کے ساتھ یہ بات کہی گئی اور کہی جاتی ہے کہ ان کی کہانیاں مبہم، مشکل اور پیچیدہ ہیں۔ اور یہ کہہ کر ان کا نام بھی جدیدیت کے ابہام پسندوں کے ساتھ لیا جانے لگا۔ جبکہ نیر مسعود کا افسانہ اپنے بیانیے، محل وقوع، تکنیک اور واقعات کی ترتیب کے لحاظ سے ایک الگ ہی مزاج کا افسانہ ہے۔ وہ ہماری افسانوی روایت میں ان دو چار لکھنے والوں میں ہیں جنھوں نے اپنے وقت کے حاوی تخلیقی رجحان کو ذرا بھی قابل اعتنا نہیں سمجھا، ان کے لیے ان کا اندرون اور تخلیقی وجدان ہی اول وآخر رہا۔ نیر مسعود کے افسانوں میں پیچیدگی اور ابہام کا مسئلہ بھی بہت مختلف ہے، ان کے افسانوں کی اس جہت پر جس طرح گفتگو ہونی چاہیے تھی وہ نہیں ہوئی۔ بظاہر بہت حقیقی اور سچی صورتوں سے متشکل بیانیہ کیسے ایک غبار میں چلا جاتا ہے اور معنی کاری کا ایک نیا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے نیر مسعود کے افسانوں کے مطالعے کا یہ ایک اہم پہلو ہے۔ نیر مسعود کے یہاں کہانی کا مرکز متن کے کسی ایک حصے میں نہیں ہوتا بلکہ لامرکز میں ہوتا ہے، اس لامرکز کی تلاش ہی ان کے افسانوں کی ایک بامعنی قرأت کا استعارہ ہے۔

نیر مسعود کے افسانوں کے بارے میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ ایک پورے تہذیبی علاقے کی دریافت سے صورت پذیر ہوتے ہیں۔ ان کا محل وقوع اور زمانی عرصہ ایک بھرے پرے اور پر وقار شہر کا ماضی ہے۔ اس ماضی کی پراسراریت، تحیر اور اس کے تہذیبی رنگ نیر مسعود کے افسانوں کے متن میں رچے بسے ہوتے ہیں۔ ان کے بعض افسانوں کے حوالے سے اس ماضی کو لکھنؤ شہر کا ماضی بھی کہا جاسکتا ہے لیکن زیادہ تر اس کے سائے اس حد بندی سے نکل کر دور تک دراز ہوتے چلے جاتے ہیں۔ نیر مسعود کے افسانوں کو پڑھنا شہروں کے پرانے کرداروں، پرانے مقامات اور کھنڈرات کی خاموشیوں کی پراسراریت سے بھی گزرنا ہے۔

نیر مسعود کے بیشتر افسانے ان کی اسی تخلیقی انفرادیت کو سامنے لاتے ہیں۔ ان کا تفصیلی مطالعہ معاصر افسانوی صورتِ حال میں ان کے امتیاز کو واضح کرنے اور اس نئی افسانوی روش کے خدوخال کو نمایاں کرنے سے عبارت ہے۔

اردو کی افسانوی روایت میں نیر مسعود کے بالکل منفرد اسلوب، موضوعات اور تکنیک کے نئے انداز کی وجہ سے ان کے تخلیقی جہان میں اترنا ایک خاص ادبی ضرورت ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ اردو کے پہلے ایسے افسانہ نگار ہیں جو علم وتحقیق کی وسیع تر دلچسپیوں کے ساتھ افسانہ لکھنے کی طرف مائل ہوئے۔ انھوں نے کافکا کا اردو میں ترجمہ کیا، ان کے اور کافکا کے تخلیقی محرکات میں بھی ایک خاص قسم کی مماثلت پائی جاتی ہے۔ دونوں نے خواب کی معدوم ہوتی پرچھائیوں کو کاغذ پر نقش کرنے کی کوششیں کیں۔ اس کے علاوہ لکھنؤ کی مٹتی ہوئی تہذیب کے نقوش کو بھی انھوں نے اپنی افسانوی بافت کا حصہ بنایا۔ سب سے بڑی بات یہ کہ انھوں نے کہانیوں میں حقیقت کو ایک دھند کی شکل دینے کے لیے بالکل نئے انداز اختیار کیے جو نہ ان کے معاصرین میں کسی کو سوجھے اور نہ ہی ان کے بعد اس طرز پر کسی نے کہانی کہی۔ دھند کی اس معنی کاری کا عمل نیر مسعود کے یہاں بالکل ہی

منفرد انداز کا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کے افسانوں کی باضابطہ قرأت کی جائے اور اردو کی افسانوی روایت میں ان کے مقام اور اختصاصی پہلوؤں کو نمایاں کیا جائے۔

نیر مسعود اپنی کہانیوں کی پیچیدگی اور ابہام کی وجہ سے اردو کے بہت کم قارئین کی توجہ حاصل کر سکے، زیادہ تر قارئین ان کی چند کہانیوں کے بعد ہی ان سے دور ہو گئے۔ اس لیے باقاعدہ طور پر نیر مسعود پر کوئی تحقیقی و تنقیدی کام نہ ہو سکا۔ اردو کے کچھ اہم ناقدین نے ان پر ضرور بہت اچھے مضامین لکھے جن سے نئے قارئین کو نیر مسعود کے افسانوں میں داخل ہونے کے آداب سیکھنے کو ملے اور ساتھ ہی ان کے افسانوں میں موجود خاموشیوں کو سمجھنا آیا۔ نیر مسعود پر مضامین لکھنے والوں میں سکندر احمد، شمیم حنفی، قاضی افضال حسین، شارب ردولوی، لطف الرحمٰن، عابد سہیل، ناصر عباس نیر، حمید شاہد، آصف فرخی، محمد خالد اختر اہم ہیں۔

نیر مسعود کو سمجھنے کے لیے اس ماحول کو سمجھنا بھی ضروری ہے جہاں ان کی پرورش و پرداخت ہوئی، نیر مسعود خالص ادبی فضا کے پروردہ تھے، ادبستان جہاں بڑے بڑے ادیبوں، شاعروں اور نقادوں کا آنا جانا لگا رہتا تھا، والد ماجد مسعود حسن رضوی ادیب کا خود ادب میں ایک بڑا نام تھا، اس کے علاوہ قدیم لکھنؤ کی تہذیبی معاشرت تھی جس کا اثر ان پر ہونا لازمی تھا، یہی وجہ ہے کہ نیر مسعود کی تحریروں میں بھی اتنی ہی متانت و سنجیدگی ہے جتنی ان کی شخصیت میں ہے۔ سادہ اور سلیس اسلوب لیکن اس کے پیچھے تہداری کا انبار لگا ہوا ہے۔ ان کی اس ادبی اور تہذیبی پرورش میں ادبستان کا انتہائی اہم کردار رہا ہے۔

نیر مسعود اس وقت افسانہ تحریر کر رہے تھے جب

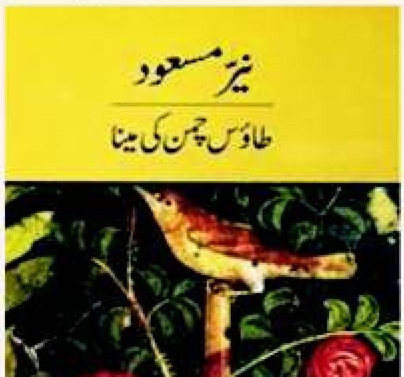

اودھ کا تہذیبی نظام درہم برہم ہو گیا تھا، قدیم اور جدید رواج کا ٹکراؤ زوروں پر تھا افلاس غربت بھوک مری بے روزگاری آوارہ گردی لوٹ کھسوٹ میں سماج جکڑتا جا رہا تھا، مگر پھر بھی ماضی پر فخر تھا، جینے کی موہوم آس تھی اور یہی نیر مسعود کے افسانوں کا موضوع قرار پائے، طاؤس چمن کی مینا ان کا مشہور افسانہ ہے، افسانہ پہلی نظر میں بہت سادہ ہے لیکن اس کی تہہ میں زوال پذیر اودھ کا پورا منظر نامہ موجود ہے، سادہ اور سلیس الفاظ کے پیچھے طعن و تشنیع کے تیر ہیں جو زوال پذیر اودھ کے نوحہ خواں ہیں، افسانہ طاؤس چمن کی مینا زوال پزیر اودھ کا شاندار استعارہ ہے، مذکورہ افسانے کا یہ اقتباس ملاحظہ کریں:

کچھ دور تو میں اپنی دھن میں نکلا چلا، پھر مجھے سب کچھ بدلا بدلا معلوم ہونے لگا، شہر پر عجیب مردنی سی چھائی ہوئی تھی۔ چوڑے راستوں پر گوروں کے فوجی دستے گشت کر رہے تھے، اور میں جس گلی میں مڑتا اس کے دہانے پر انگریزی فوج کے دو تین سپاہی جمے ہوئے نظر آتے تھے۔ گلیوں کے اندر لوگ ٹولیاں بنائے چپکے چپکے آپس میں باتیں کر رہے تھے، مجھے گھر پہنچنے کی جلدی تھی اس لیے راستے میں کہیں رکا نہیں۔ لیکن ہر طرف ایک ہی گفتگو تھی، رکے بغیر بھی مجھے معلوم ہو گیا کہ اودھ کی بادشاہی ختم ہو گئی، سلطان عالم واجد علی شاہ کو تخت سے اتار دیا گیا ہے۔ وہ لکھنؤ چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ اودھ کی سلطنت انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئی ہے اور اس خوشی میں انہوں نے بہت سے قیدی کو آزاد کر دیا ہے۔

ایک طرف بھوک اور کسمپرسی کا عالم ہے، فاقہ کشی ہے لیکن دوسری طرف کرداروں کی ایسی نزاکت اور متانت، یہ کردار گزشتہ اودھ کا استعارہ ہیں، جنھیں نیر مسعود نے اپنے افسانے کا موضوع بنا کر اس پر طنز کیا ہے اسی طرح کے واقعات و حادثات نیر مسعود کے افسانوں کا موضوع ہیں، جس کا انھوں نے بذات خود مشاہدہ کیا تھا۔

ادب اور ادیب اپنی تہذیب کا آئینہ دار ہوتا ہے، وہ اپنے عہد کا ترجمان ہوتا ہے، نیر مسعود کے افسانے اپنے عہد کا آئینہ ہیں، انھوں نے موضوع کے انتخاب میں بہت نبرد آزمائی نہیں کی، ہیر رانجھا، لیلی مجنوں کے قصوں کو اجاگر کرنے کی ضرورت نہیں پڑی بلکہ سامنے خود ان کا زوال آمادہ معاشرہ تھا، جس کو برتتے ہوئے ان کا افسانوی سفر تمام ہو گیا۔

نیر مسعود کا شمار اردو کے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنھوں نے ایک روایتی اسلوب سے الگ ہو کر افسانہ نگاری میں الگ شناخت قائم کی، انھوں

نیر مسعود کا شمار اردو کے ان معدودے چند افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے جنہوں نے ایک روایتی اسلوب سے الگ ہو کر افسانہ نگاری میں الگ شناخت قائم کی.انہوں نے ان بندھے ٹکے اصولوں سے شعوری اور لا شعوری طور پر اجتناب کیا جو افسانہ نگاری کے حوالے سے رائج تھے اور برتے جارہے تھے.انجام کار بعض لوگوں نے تو انہیں سرے سے افسانہ نگار ہی تسلیم نہیں کیا.

نے ان بندھے ٹکے اصولوں سے شعوری اور لاشعوری طور پر اجتناب کیا جو افسانہ نگاری کے حوالے سے رائج تھے اور برتے جا رہے تھے، انجام کار بعض لوگوں نے تو انہیں سرے سے افسانہ نگار ہی تسلیم نہیں کیا۔ نیر مسعود کا شمار قرۃ العین حیدر اور انتظار حسین کے بعد ہمارے یہاں سب سے زیادہ روایت سے منحرف افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے، لیکن انھیں ذرہ برابر بھی اس کا افسوس نہیں، انھیں اس بات کا قطعی ملال نہیں تھا کہ لوگ انھیں ایک افسانہ نگار کے بجائے قصہ گو سمجھتے ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ درپردہ تہمتیں واہوتی گئیں اور نیر مسعود ایک معتبر افسانہ نگار گردانے جانے لگے، خود انہی کا اقتباس پڑھیے، اندازہ ہو جائے گا کہ وہ اپنے تئیں کیا سوچتے تھے:

3 جون 1924 کو کافکا کی وفات ہوئی تو اسے کوئی بڑا ادبی سانحہ نہیں سمجھا گیا وہ اس وقت تک جرمن کا ایک غیر معروف افسانہ نگار تھا جس کی تحریر اپنے صاف بیانیہ انداز کے باوجود مفاہیم کے اعتبار سے کمال کی حد تک مبہم تھیں۔ اس وقت کافکا کو دستایفسکی کی طرح ادبیات میں پیچیدہ ترین دماغ کا مالک سمجھا جاتا ہے اس کی تحریروں کی مذہبی، روحانی، صوفیانہ، فلسفیانہ، مابعد الطبعیاتی، سماجی، اخلاقی نفسیاتی اور جنسی تاویلیں کی جا رہی ہیں، اور اس کی تحریروں میں ہر تاویل کا جواز موجود ہے، خود کافکا ان تحریروں کو اپنی خواب نما باطنی زندگی کی عکاسی قرار دیتا ہے، اور تاویلیں اب تک اس باطنی زندگی کو پوری طرح گرفت میں نہیں لا سکی ہیں، البتہ اتنا یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ کافکا کی باطنی زندگی ان کی ظاہری زندگی سے مختلف تھی۔

نیر مسعود کو احساس تھا کہ انھوں نے افسانہ لکھنے کے لیے اس نہج کا استعمال کیا ہے جو روایت سے ہٹ کر ہے، بطور افسانہ نگار شاید ان کا اعتراف دیر سے ہو، یا نہ

بھی ہو لیکن جوان کا اندرون تھا ان کا جو احساس تھا اس کا استعمال افسانہ میں انہوں نے تب بھی کیا، یہ مسئلہ قاری اور نقاد کا تھا کہ وہ ان تحریروں کو کس صورت میں دیکھتے ہیں۔

پورے مشرقی ادبیات میں ہمیشہ سے ہی مافوق الفطرت عناصر اور رنگین فضاؤں اور تصوراتی ادب کی روایت رہی ہے، داستان امیر حمزہ اور دیگر داستانیں اس کی واضح مثالیں ہیں، نیر مسعود اس روایت سے الگ ہیں، حقیقت پسندی کی طرف ان کا رجحان زیادہ ہے، اور ان کا یہی جھکاؤ انہیں منفرد افسانہ نگار بناتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کی کہانیاں بہت سپاٹ ہوتی ہیں، پلاٹ بہت سیدھا سادہ ہوتا ہے، بعض اوقات تو قاری کو یہ گمان ہوتا ہے یہ کوئی سادہ سا ترجمہ یا مضمون ہے جسے افسانہ کہہ دیا گیا ہے۔ نیر مسعود کا یہی سادہ پن ان کو الگ صف میں لا کھڑا کرتا ہے، خود اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

لوگوں کو میری کہانیوں کے بارے میں یہ خیال رہا کہ یہ مثلاً کہیں سے ترجمے ہیں اس وجہ سے مجھے اور ڈر لگا رہتا ہے مگر خیر اب تک کوئی چوری پکڑی تو نہیں گئی۔

نیر مسعود اردو کے ان چند ادیبوں میں سے ایک ہیں جنھیں مغرب میں بھی پڑھا گیا، اردو میں ادبی روایت پسندی کی بنیاد پر نیر مسعود یکسر نکار دیے گئے، ظاہر ہے اردو قارئین کی ذہنی پرورش جس ادبی فضا میں ہوئی تھی وہاں نیر مسعود کا ٹکنا دشوار تھا، مشرقی ادبیات میں ابتدا سے ہی مافوق الفطرت عناصر اور تصوراتی ادب کا رجحان حاوی تھا، حالانکہ بعد میں ترقی پسندی اور جدیدیت کے رجحان کے بعد ادب میں حقیقت پسندی کو تھوڑی بہت جگہ ضرور نصیب ہوئی، ادب برائے ادب سے ادب برائے زندگی کی روایت ضرور وقوع پذیر ہوئی۔ اس میں بہت حد تک حقیقت پسندی کا عمل دخل تھا، مغرب میں یہ رجحان بہت پہلے سے اتم درجے میں موجود تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ نیر مسعود ابتدا میں اردو سے زیادہ انگریزی اور دیگر مغربی زبانوں میں پڑھے گئے۔ محمد عمر میمن نے ان کی کئی کہانیوں کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے۔ The Annual of Urdu Studies نے نیر مسعود کے تنقیدی مضامین و انٹرویو اور ان کی دس کہانیوں کو انگریزی میں شائع کیا، اس کے علاوہ مریم ابوذہاب نے پیرس سے نیر مسعود کی سات کہانیاں کافور کے نام سے شائع کیں۔ ان کا مشہور افسانہ طاؤس چمن کی مینا کا انگریزی ترجمہ بھی عمر میمن نے کیا جو امریکہ کے مشہور رسالہ Wisdom Madison میں 1997 میں شائع ہوا؟

نیر مسعود کو انگریزی میں نہ صرف پڑھا گیا بلکہ ان پر تبصرے بھی کیے گئے، محمد عمر میمن نے نیر مسعود پر اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

کلیتاً غیر ماخوذ اور اردو فکشن کی تاریخ میں اپنے سے پہلے ظہور پذیر ہونے والی ہر شے سے غیر مماثل یہ کہانیاں اپنے آپ میں ایک علیحدہ قسم کہی جا سکتی ہیں، ایک طرف تو یہ کہانیاں (اردو کے) اولین رومانیوں اور مصلحوں (کی تخلیقات) سے مختلف ہیں، دوسری طرف منشی پریم چند جیسے حقیقت نگار اور ترقی پسند ادیبوں سے بھی مختلف ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ یہ کہانیاں اس تجدد پسندانہ تجریدیت اور علامتیت کے کسی عنصر کی تقلید بھی نہیں کرتیں، جس نے 1960 اور اس کے بعد کے برسوں میں شدت کے ساتھ اردو کے افسانوی منظر نامے پر دھوم مچا رکھی تھی۔ (بحوالہ: نیر مسعود ادیب اور دانشور 33)

انگریزی نقاد Eliza Beth Both نیر مسعود کے بارے میں لکھتے ہیں:

نیر مسعود کی اپنی نجی دنیا ہے جسے وہ اپنے نفس (اپنی ہستی) کے حوالے سے دیکھتے ہیں یا آئینے سے جھانکتے ہوئے عکسوں ابہامات اور بیک وقت نمایاں اور دھندلی بے خیالیوں کی دنیا ہے جو اپنے خلا کے کھینچاؤ سے ہمیں سراسیمہ بھی کرتی ہے، ماضی یہاں حال پر مسلط رہتا ہے لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں معنی پیدا کرنے کی ہر کوشش کی تادیب بھی کرتا رہتا ہے۔ (ایضاً ص 35)

اردو قاری جس وقت نیر مسعود کو نکار رہا تھا انھیں ایک قصہ گو، روایت سے منحرف، مبہم لکھاری کہہ کر سرے سے افسانہ نگار تسلیم کرنے سے منحرف تھا، انگریزی میں وہ نہ صرف پڑھے جا رہے تھے بلکہ ان کی کہانیوں پر مناسب رائے کا اظہار بھی کیا جا رہا تھا۔ نیر مسعود کو انگریزی کے علاوہ فرانسیسی فارسی اور دیگر زبانوں میں بھی ترجمہ کیا گیا، جو ان کی عالمی ادب میں بطور افسانہ نگار مقبولیت کی نشاندہی کرتا ہے، بعد میں اردو نقادوں نے بھی ان پر لکھا۔

نیر مسعود کے افسانوں میں سادگی کے ساتھ بہت گہرائی ہے، الفاظ کی سطح پر بلا کی سنجیدگی ہے لیکن معانی میں عجیب شور ہے، افسانوں کی قرأت جتنی آسان ہے ان کی تفہیم اتنی ہی مشکل ہے شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے بارے میں یہ رائے قائم کر لی گئی کہ وہ مبہم افسانہ نگار ہیں، اسی بنا پر بہت سے نقاد اور قاریوں نے ان سے پلہ جھاڑ لیا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان افسانوں کی بامعنی قرأت کے ساتھ ان کی صحیح تفہیم درکار تھی جہاں تک خال خال نقاد ہی پہنچ سکے۔ نیر مسعود کا یہ مسئلہ کبھی رہا ہی نہیں کہ قاری پر ان کی تحریر کا کیا تاثر قائم ہوگا۔ ان کی تخلیق ان کے اندرون کا اظہار تھی اور بس۔ انھوں نے کبھی یہ باور کرانے کی کوشش نہیں کی کہ اس کی تفہیم اس طرح کی جا سکتی ہے۔ ملمع سازی، جملوں کا ادھیڑ بن، استعاروں، کنایوں اور مقفّیٰ و مسجع عبارتوں کا استعمال ان کا مسئلہ نہیں رہا، خیال کا ایک تسلسل تھا جسے ایک لڑی میں پروتے چلے گئے، اک خواب تھا جسے بیان کرتے چلے گئے، اس سے بے نیاز ہو کر کہ معبر اس کی کیا تعبیر دیتا۔ نیر مسعود خود کہتے ہیں:

میری کہانیوں میں بلکہ میری پوری زندگی میں خوابوں کا بہت بڑا کردار رہا ہے، بعض خواب تو اس قدر مربوط گویا پورے بنے بنائے افسانے کے طور پر دیکھے، بہت لمبے خواب بھی دیکھے، قسطوں میں میں کوئی خواب نہیں دیکھ سکا اب تک، بار بار دکھائی دینے والے خواب بھی دیکھے اب بھی اپنے خواب دیکھتا ہوں اور ان پر لکھتا رہتا ہوں۔

نیر مسعود کے افسانے انھیں خوابوں کی تحریری صورت ہے، انھوں نے کھلی آنکھوں سے سے اودھ کی تاراجی دیکھی، معاشرے کو دوسرے قالب میں ڈھلتے ہوئے دیکھا، ان کا خواب کھلی آنکھوں کا خواب تھا جس میں زندگی کے چھوٹے سے لے کر بڑے موضوعات تک شامل تھے، ننگی آنکھوں سے دیکھے گئے خواب کو انھوں نے صفحۂ قرطاس پر بہت ہی سادہ الفاظ میں درج کر دیا، ان سادگی میں تہذیبی اور معاشرتی کشمکش کی ایک دنیا آباد ہے جس کی بازیابی پوری طرح نقاد اور حساس قاری پر منحصر ہے۔

■

Nisar Ahmad
Room No.: 217, Chandrabhaga Hostel, JNU
New Delhi - 110067

سوال نامہ برائے انٹرویو

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں مشاہیر ادب کے انٹرویوز شائع کیے جاتے تھے، یہ ایک مقبول کالم تھا۔ یہ کالم ہنوز جاری ہے۔ بس اس کی شکل وصورت ذراسی تبدیل کر دی گئی ہے تاکہ اردو کے تعلق سے غیر ضروری مباحث کے بجائے قارئین اردو زبان کی حقیقی صورت حال سے آگاہ ہو سکیں۔

س: زبانوں کی موت کی وجوہات کیا ہیں؟

س: زبانوں کو زندہ رکھنے کے لیے کون سا طریقہ کار اختیار کیا جانا چاہیے؟

س: زبان کا تہذیب وثقافت سے کیسا رشتہ ہے؟

س: کیا زبانوں کی موت سے انسانی وراثت کے تحفظ کا مسئلہ بھی جڑا ہوا ہے؟

س: کیا کسی زبان میں خواندگی، سائنسی، سماجی مواد کی کمی سے زبان پر منفی اثرات پڑتے ہیں؟

س: موجودہ حالات میں اردو زبان کو کس طرح کے خطرات لاحق ہیں؟

س: کیا اردو کا چہرہ مسخ ہو رہا ہے؟ کیا اردو کی شکل بگڑ رہی ہے؟

س: اردو کا مستقبل کیا ہے؟

س: زبان کی سطح پر جو بگاڑ پیدا ہو رہا ہے اس کو روکنے کے لیے کون سی ترکیبیں استعمال کی جاسکتی ہیں؟

س: کیا اردو کے ادارے، تنظیمیں، زبان سے زیادہ ادب پر توجہ دے رہے ہیں اور زبان سے متعلق کتابوں کی اشاعت تقریباً رک سی گئی ہے؟

س: کیا کلاسیکیت، جدیدیت وغیرہ پر گفتگو سے زبان کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے اردو میڈیم اسکول ہیں اور ان میں اساتذہ کی کتنی تعداد ہے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی لائبریریاں ہیں اور وہاں کون سے اخبارات اور رسائل آتے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں کتنی اردو تنظیمیں، ادارے اور انجمنیں ہیں اور وہ کس نہج پر اردو کے فروغ کے لیے کام کر رہے ہیں؟

س: آپ کے علاقے میں اردو سے جڑی ہوئی کتنی شخصیات ہیں جن کی خدمات کا اعتراف علاقائی، قومی سطح پر نہیں کیا گیا ہے؟

س: آپ مقامی سطح پر اردو کے فروغ کے لیے کیا کوششیں کر رہے ہیں؟

س: آپ کے ذہن میں فروغ اردو کے لیے کیا تجاویز اور مشورے ہیں؟

س: اردو رسم الخط کی بقا کے لیے کیا کوششیں کیا جاسکتی ہیں؟

س: دوسری علاقائی زبانوں میں اردو کے فروغ کی کیا صورتیں ہو سکتی ہیں؟

س: کیا آپ کے اہل خانہ اردو زبان لکھنا پڑھنا اور بولنا جانتے ہیں؟

س: آپ کے بعد کیا آپ کے گھر میں اردو زندہ رہے گی؟

س: غیر اردو حلقے میں فروغ اردو کے لیے کیا حکمت عملی اختیار کی جانی چاہیے؟

س: آپ کے علاقے میں کتنے کالج یا یونیورسٹیز ہیں جن میں اردو کی تعلیم دی جاتی ہے اور وہاں اردو پڑھنے والوں کی تعداد کتنی ہے؟

س: ملکی سطح پر غیر سرکاری تنظیموں سے اردو کی ترویج واشاعت کے سلسلے میں کس طرح سے مدد لی جاسکتی ہے؟

س: سینٹرل اسکولوں اور نوودے ودیالیہ میں اردو کی تعلیم کا کوئی معقول انتظام ہے؟

ماہنامہ 'اردو دنیا' میں اسی سوالنامے کی روشنی میں ان لوگوں کے انٹرویوز شائع کیے جائیں گے جو اردو زبان وادب سے جڑے ہوئے ہیں اور اردو کی خدمت کا بے پناہ جذبہ رکھتے ہیں مگر انھیں اپنے خیالات کے اظہار کا موقع نہیں ملتا۔ یہ سوالنامہ ہر اس فرد کے لیے ہے جو اردو کاز اور مشن سے جڑا ہوا ہے۔ اس سوالنامے کے ذریعے ہمیں اردو زبان کے تعلق سے حقیقی صورتِ حال کا علم ہوگا اور اسی کی روشنی میں فروغ اردو کے لیے ایک روڈ میپ تیار کیا جائے گا۔ اپنے جوابات کے ساتھ سوانحی کوائف مع تصویر درج ذیل ای میل آئی ڈی پر بھیجیں: editor@ncpul.in ➢ urduduniyancpul@yahoo.co.in ➢

ورک شیٹ کو از سر نو ترتیب دینا

(Rearranging Worksheet)

6	Int-00003	SR1530AH, LGA77	619.9	3
7				3
8	Int-00004	SR1530AHLX, LGA	661.9	4
9				4
10	Int-00005	SR1530CL, LGA77	733.9	5
11				5
12	Int-00006	SR1550ALSAS, LG	1289.9	6
13				6
14	Int-00007	SR2500ALBRP, LG	1409.9	7
15				7
16	Int-00008	SR2500ALLX, LGA	1539.9	8

تصویر E-3.12: بیچ میں قطار ڈالنے کے بعد ورک شیٹ

بیچ میں کالم ڈالنا (Inserting Columns)

قطاروں کی طرح خالی کالم بھی بیچ میں کہیں بھی ڈالے جاسکتے ہیں۔ اس کا طریقہ بھی لگ بھگ وہی ہے، جو قطاریں ڈالنے کا ہے۔ اس کے لیے سب سے پہلے اس کالم کو چن لیجیے، جہاں آپ نیا کالم ڈالنا چاہتے ہیں۔ اب 'insert" مینو (تصویر E-3.11) میں Insert Sheet Columns ہدایت دیجیے۔ ایسا کرتے ہی ایک نیا کالم اس جگہ پر گھس جائے گا اور اس کے بعد کے سبھی کالموں کا ڈاٹا ایک کالم دائیں جانب سرکا دیا جائے گا اور فارمولوں کو درست کردیا جائے گا۔

مثال کے طور پر، تصویر E-3.12 کی ورک شیٹ میں کالم B (Name) اور C (Designation) کے بیچ میں نیا خالی کالم ڈالنے کے لیے کالم C کو چن کر 'Insert | Insert Sheet Columns' ہدایت دینے پر ورک شیٹ تصویر E-3.13 کی طرح دکھائی دے گی۔

اس طرح کئی کالم چن کر اور 'Insert' مینو میں 'Insert Sheet Columns' ہدایت دے کر آپ ایک ساتھ کئی کالم بھی بیچ میں ڈال سکتے ہیں۔

بیچ میں سیل ڈالنا (Inserting Cells)

آپ کسی ورک شیٹ میں بیچ میں خالی سیل (یا رینج) بھی ڈال سکتے ہیں۔ اس طرح سیلوں کو بیچ میں گھسانے سے متاثر ہونے والے سارے ڈاٹا کو آپ کی خواہش کے مطابق یا تو دائیں طرف یا نیچے کی طرف کھسکا دیا جائے گا۔

خالی سیل بیچ میں ڈالنے کے لیے پہلے ایک یا زیادہ سیلوں کی اس رینج کو چنیے، جہاں آپ نئے سیل ڈالنا چاہتے ہیں پھر 'Insert' مینو کا '...Insert Cells' ہدایت دیجیے۔ ایسا کرتے ہی آپ کو تصویر E-3.14 کی طرح 'Insert Cells' کا ڈائیلاگ باکس دیا جائے گا۔ اس ڈائیلاگ باکس میں آپ سے پوچھا جاتا ہے کہ متاثر ہونے والے سیلوں کو آپ دائیں طرف سرکانا چاہتے ہیں یا نیچے کی طرف یا آپ پوری قطار یا کالم کو جوڑنا چاہتے ہیں۔ آپ کے جواب کے مطابق خالی سیل ڈال کر ورک شیٹ کو مرتب کردیا جائے گا۔

1	Item ID	Name	Price	
2	AM-001	Intel B85/LGA 1150	525.4	1
3	AM-002	Intel Z97/LGA 1150	182.1	2
4	AM-003	Intel B85/LGA 1150	730.3	3
5	AM-004	Intel H81/LGA 1150	889.4	4
6	AM-005	AMD A88X/Socket FM2+	412.1	5
7	AM-006	AMD 970/Socket AM3+	276.7	6
8	AM-007	Intel H61/LGA1155	696.1	7
9				1

تصویر E-3.13: بیچ میں کالم ڈالنے کے بعد ورک شیٹ

مثال کے طور پر، اگر آپ تصویر E-3.10 کی ورک شیٹ میں سیل D8 کی جگہ ایک نیا سیل ڈالتے ہیں اور متاثر ہونے والے سیلوں کو نیچے کی طرف سرکاتے ہیں، تو آپ کی ورک شیٹ تصویر E-3.15 کی طرح دکھائی دے گی۔

1	ID	Question 1	Question 2	Question 3	Question 4	Question 5
2	1	NO	YES	NO	NO	NO
3	2	NO	NO	NO	NO	NO
4	3					
5	4	YES	NO	NO	NO	NO
6	5	YES	YES	YES	NO	NO
7	6	NO		YES	NO	NO
8	7	NO	YES	YES	NO	YES
9	8	YES	YES	NO	NO	YES
10	9	YES	NO	NO		NO
11	10	NO	YES	NO	YES	YES
12	11	NO		YES	NO	YES
13	12	NO	YES	NO	YES	YES

تصویر E-3.15: بیچ میں سیل ڈالنے کے بعد ورک شیٹ

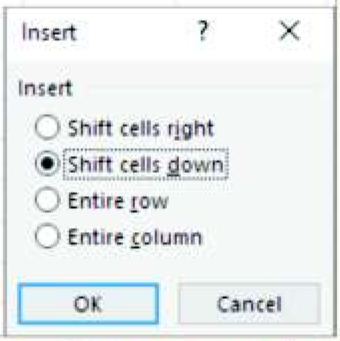

تصویر E-3.14: Insert کا ڈائیلاگ باکس

اس طرح بیچ میں سیل گھسانے سے ہوسکتا ہے کہ آپ کی ورک شیٹ کا ڈھانچہ بگڑ گیا ہو یا فارمولے غلط ہوگئے ہوں۔ ایسے میں آپ کوئک ایکسس ٹول بار میں 'Undo' بٹن کو کلک کرکے ورک شیٹ کو پہلے جیسی حالت میں لا سکتے ہیں۔

ورک شیٹ کا کوئی حصہ ہٹانا

(Deleting Parts of a Worksheet)

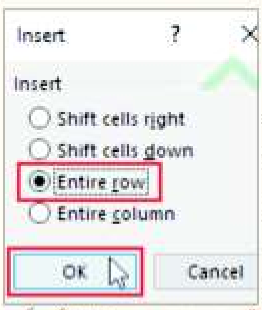

تصویر E-3.16: Delete کا ڈائیلاگ باکس

آپ اپنی ورک شیٹ کا کوئی بھی حصہ (قطار، کالم یا رینج) اس میں سے ہٹا سکتے ہیں۔ اس کے لیے Home ٹیب کے Cells حصہ میں دیے گئے Delete بٹن کا استعمال کیا جاتا ہے۔ آپ جس حصہ کو ہٹانا (یعنی نکال دینا) چاہتے ہیں، پہلے اسے اوپر بتائے جاچکے طریقے سے چن لیجیے اور Delete کے پل۔ڈاؤن مینو میں مناسب آپشن چنیے۔ اگر آپ نے پوری قطار یا پورے کالم ہٹائے ہیں، تو Delete Sheet Rows یا Delete Column Rows کے نتیجے کے طور پر نیچے کی قطاروں یا دائیں طرف سے کالموں کو بالترتیب اوپر کی جانب یا بائیں طرف سرکا دیا جائے گا۔ اگر آپ کوئی رینج یا اکیلا سیل ہٹانا چاہتے ہیں، تو Delete مینو میں ...Delete Cells ہدایت دیں۔ اس سے تصویر E-3.16 کی طرح Delete کا ڈائیلاگ باکس دے کر آپ سے پوچھا جائے گا کہ نیچے اور دائیں طرف کے بقیہ سیلوں کو آپ کس طرح سرکانا چاہتے ہیں، تاکہ خالی جگہ بھر جائے۔ ورک شیٹ کو آپ کی خواہش کے مطابق مرتب کردیا جائے گا۔

ورک شیٹ کا کوئی حصہ اس طرح ہٹانے پر آپ کے فارمولوں پر برا اثر پڑسکتا ہے۔ ایسا خاص طور سے تب ہوتا ہے، جب ہٹائے گئے سیلوں کا بچے ہوئے سیلوں میں کہیں حوالہ دیا گیا ہو۔ ہر حالت میں آپ کو اپنے فارمولوں کی جانچ کرلینی چاہیے اور نتیجہ سے مطمئن نہ ہونے پر 'Undo' ہدایت دینی چاہیے۔

ورک شیٹ کا کوئی حصہ صاف کرنا

(Clearing Parts of Worksheet)

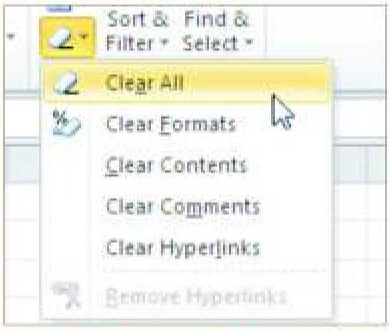

تصویر E-3.17: Clear Editing کا جھرنا مینو

ورک شیٹ کا کوئی حصہ صاف، یعنی خالی کرنے کے لیے اس حصہ کو چن کر کی- بورڈ پر Delete (Del) بٹن دبائیے۔ اس سے وہ حصہ خالی ہوجائے گا لیکن ان کا فارمیٹ ویسا ہی بنا رہے گا۔ اگر آپ فارمیٹ کو بھی صاف کرنا چاہتے ہیں، تو Home ٹیب کے Editing حصے میں Clear بٹن کے تیر کے نشان پر کلک کیجیے۔ اس سے وہاں تصویر E-3.17 کی طرح جھرنا مینو کھل جائے گا۔ اس جھرنا مینو میں 'Clear Formats' آپشن کو کلک کرنے سے چنے ہوئے سیلوں کا صرف فارمیٹ صاف کردیا جائے گا۔ اگر آپ اس میں 'Clear Contents' کو کلک کرتے ہیں، تو صرف مواد صاف کیا جائے گا لیکن اگر آپ اس میں 'Clear All' آپشن کو چنتے ہیں، تو مواد کے ساتھ ہی فارمیٹ بھی ہٹا دیا جائے گا۔

ورک شیٹ کا کوئی حصہ خالی کرنے سے دوسرے سیلوں پر کوئی سیدھا اثر نہیں پڑتا ہے لیکن اگر ان سیلوں کا حوالہ کہیں اور دیا گیا ہو، تو ان سیلوں کا مواد یا نتیجہ بدل سکتا ہے۔

خاص: کئی لوگ کسی سیل کو خالی کرنے کے لیے اس میں اسپیس بھر دیتے ہیں۔ سیل خالی نہیں مانے جاتے، خواہ ان میں کچھ نظر نہ آرہا ہو۔ ایسے سیل ورک شیٹ کو چھپواتے وقت آپ کے لیے پریشانی پیدا کرسکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کوئی سیل خالی ہے، لیکن اس میں بارڈر لائنوں وغیرہ کی پابندی ہے، تو بھی اسے خالی نہیں مانا جاتا۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی سیل یا رینج پوری طرح خالی ہوجائے، تو اس کو چن کر 'Editing' حصہ کے 'Clear' مینو میں 'Clear All' آپشن کو کلک کرنا چاہیے۔

مشق E-2 (Exercise E-2):

مشق E-1 میں آپ نے ایک مارک شیٹ تیار کی تھی، جس میں تصویر E-2.11 کے مطابق کئی فارمولے بھی بھرے گئے تھے۔ اس ورک شیٹ کو پھر سے کھولیے اور اس سیکشن میں بتائے گئے مختلف کاموں کی مشق کیجیے، ساتھ ہی یہ بھی دیکھتے رہیے کہ ہر ایک کام کا فارمولوں پر کیا اثر پڑتا ہے۔ فارمولے دیکھنے کے لیے کنٹرول کے ساتھ (ایپوسٹروف) دبائیے۔ پھر سے نتیجہ دیکھنے کے لیے ایک بار پھر 'Ctrl+' دبائیے۔ کسی تبدیلی کو ختم کرنے کے لیے 'Undo' ہدایت کا استعمال کرنا چاہیے۔

مشق کرنے کے بعد ورک شیٹ کو بغیر محفوظ (Save) کیے باہر نکل جائیے، تاکہ بنیادی ورک شیٹ متاثر نہ ہو۔ ■

بہ شکریہ: ریپیڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

قلم کاروں سے گزارش

ماہنامہ 'اردو دنیا' کے لیے موصول ہونے والے مضامین کی تعداد اتنی زیادہ ہوگئی ہے کہ ہر مضمون کی اشاعت نہ تو ممکن ہے اور نہ ہی ہر مضمون نگار سے رابطہ آسان ہے۔ اسی لیے دسمبر 2018 تک موصول ہونے والے مضامین کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا۔ اب مضامین کی اشاعت یا عدم اشاعت کی اطلاع مضمون موصول ہونے کے ایک ماہ کے اندر ہی دے دی جائے گی۔ اگر اطلاع نہ ملے تو آپ مندرجہ ذیل نمبر 011-49539009 پر اپنے مضمون کے بارے میں استفسار کر سکتے ہیں۔

ایک اور گذارش یہ ہے کہ میر، غالب، اقبال یا ان ادبا پر جن کے حوالے سے کافی کتابیں اور مقالے لکھے جاچکے ہیں، مضامین بھیجنے سے اولاً تو گریز کریں اور اگر ان شخصیات پر مضامین بھیجیں بھی تو مضمون میں نئے زاویے یا نئی جہت کی نشاندہی ضرور فرمائیں، اس کے بغیر اس نوع کے مضامین شائع نہیں کیے جائیں گے۔ اردو زبان کی زمینی صورت حال، تاریخ، آثار قدیمہ، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب و ثقافت، علاقائی ادبی صورتِ حال، ہندوستان کی علاقائی زبانوں کا ادب، عالمی ادبیات، تکنیکی اور سائنسی ترقیات اور گمنام، فراموش کردہ قلم کاروں، رسائل کے خصوصی شماروں اور نئے موضوعات کے حوالے سے لکھے گئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے۔

تبصرہ و تعارف

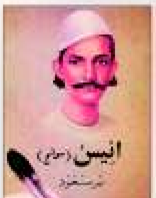

انیس (سوانح)

مصنف: نیر مسعود
صفحات: 472، قیمت: 220، طباعت ثانی: 2020
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: امتیاز احمد علیمی، S-2/5A تیسری منزل
فاطمہ اپارٹمنٹ، جوگابائی، جامعہ نگر، نئی دہلی

یہ کتاب انیس کی سوانح پر مبنی ہے جس میں انیس کی پیدائش سے قبل اور بعد کی آخری زندگی تک کے حالات و واقعات کا تفصیلی احاطہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب کو نیر مسعود نے بارہ ابواب میں تقسیم کرکے انیس کی شخصیت کے گونا گوں پہلوؤں کو پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ پہلا باب 'فیض آباد: خلیق' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں فیض آباد کی اجمالی تاریخ کے پس منظر میں میر خلیق کے خاندانی حسب و نسب کا مستند حوالوں کے ساتھ بہت باریک بینی سے جائزہ لیا گیا ہے۔

دوسرا باب 'انیس، فیض آباد' کے نام سے ہے۔ اس میں انیس کا پورا نام 'میر / سید ببر علی رضوی' بتایا گیا ہے اور تمام شواہد کی روشنی میں سال ولادت 1218 ہجری اور 1803 عیسوی بتایا گیا ہے۔ اسی طرح سید مہدی حسن احسن کے قول کے مطابق ''میر ببر علی... محلہ گلاب باڑی، شہر فیض آباد میں پیدا ہوئے'' اس کے علاوہ میر، سید، رضوی اور موسوی جو ناموں کے سابقے یا لاحقے ہیں جن سے خاندانوں کی شناخت ہوتی ہے ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی انیس کی والدہ 'بنگا بیگم' کے بارے میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس کے علاوہ انیس کے بچپن کے حالات و واقعات قلم بند کرتے ہوئے انیس کے اساتذہ میں مولوی میر نجف علی اور مولوی حیدر علی فیض آبادی کا بھی ذکر کیا گیا ہے ساتھ ہی ان کی علمی استعداد کے حوالے سے لکھا ہے کہ ''انیس عربی زبان، اس کے صرف و نحو اور معانی و بیان کے مسائل اور ان سے متعلق کتابوں کا بخوبی علم رکھتے تھے۔ ان کے یہاں عربی اقوال و امثال کے ترجمے، عربی شاعروں کے حوالے، آیات و احادیث، ان کے ترجمے یا ان کی طرف اشارے، تفسیر و حدیث کی کتابوں کے نام ان کے راویوں کے حوالے وغیرہ موجود ہیں۔' یہی نہیں بلکہ انیس کو فارسی زبان و ادب پر کامل عبور حاصل تھا جس کی مثال ان کے مرثیے ہیں جن میں فارسی شعرا کا انداز، فارسی ترکیبیں، فارسی کے اقوال و امثال، فارسی اشعار پر تضمین وغیرہ ان کے فارسی دانی کا بین ثبوت ہیں۔

نیر مسعود نے شاعری میں انیس کے جن اساتذہ کا ذکر کیا ہے ان میں خلیق، ضمیر اور ناسخ کا نام اہم ہے۔ حالانکہ شاگردان انیس نے اس بات سے انکار کیا ہے کہ ضمیر ان کے استاد تھے۔ انیس نے جب شاعری کی ابتدا کی تھی اس وقت 'حزیں' تخلص تھا لیکن جب ناسخ کی شاگردی میں آئے تو ان کے مشورے پر 'انیس' تخلص رکھا۔ مصنف نے انیس کی غزلیہ شاعری کے حوالے سے لکھا ہے کہ 'انیس کا دستیاب غزلیہ کلام اچھا نہیں ہے، اس دستیاب کلام میں ایک شعر بھی ایسا نہیں ہے جو انیس سے منسوب ہونے کے لائق ہو'۔ ان سب کے علاوہ اس باب میں انیس کی مرثیہ گوئی، مشق اور ریاض، مرثیہ خوانی کے تفصیلی ذکر کے ساتھ فیض آباد کی زندگی، شادی، اہلیہ فاطمہ بیگم اور اولاد کا بھرپور احاطہ کیا گیا ہے۔

کتاب کا تیسرا باب 'لکھنؤ' کے عنوان سے ہے۔ جس میں لکھنؤ میں انیس کی مرثیہ خوانی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی پہلی مجلس کا کلام اور تحسین گنج کی مجلس کا ذکر تفصیل سے کیا گیا ہے ساتھ ہی غازی الدین حیدر کے عہد کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے شیخ مداری اور عہد نصیرالدین حیدر کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب اور انیس کی ملاقات ہوئی یا نہیں اس پر سوالیہ نشان قائم کیا گیا ہے۔ انیس اور منتظم الدولہ حکم مہدی کا ذکر کرتے ہوئے شاہ نجف میں مرثیہ خوانی، پچیسویں رجب کی مجلس، میر سلامت علی انیس کے قدیم شاگرد، مونس کا نکاح، انیس اور ناسخ و آتش، انیس اور میر ضمیر سے ان کے مراسم، حسن بیان، طرز اظہار کو استدلالی انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اسی باب میں محمد علی شاہ کا عہد، ناسخ اور میر نجف علی کی وفات، حسین علی اثر کے یہاں خواندگی کو پیش کرتے ہوئے انیس کی لکھنؤ میں مستقل سکونت پذیری اور منتقلی کے اسباب، منتقلی کا سال اور لکھنؤ میں انیس نے جن جن محلوں میں سکونت اختیار کی ان میں شیدیوں کا احاطہ، سٹھتی، نخاس، منصور نگر، پنجابی ٹولا (بیگم گنج، راجا بازار) اور چوبداری محلہ (محلہ آئینہ سازاں، سبزی منڈی، چوک) کا ذکر مستند انداز میں کیا گیا ہے۔

چوتھا باب 'انیس باشندہ لکھنؤ' کے عنوان سے ہے۔ اس باب میں مصنف نے انیس کی مجموعی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہوئے انیس کے لباس پہننے کے طور طریقوں اور ان کی خوبیوں کو بیان کرتے ہوئے منبر پر انیس کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے مولوی ذکاء اللہ نے لکھا ہے کہ 'وہ شخص منبر پر پڑھ رہا تھا اور یہ معلوم ہوتا تھا کہ جادو کر رہا ہے' یہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت اور آواز کے ساتھ ان کے بولے ہوئے فقروں، ان کی صحبتوں، شعر و شاعری، ان کے پڑھے ہوئے اشعار اور ان اشعار سے اثر پذیری، شاعری پر تبصرے، حس

مزاح، ملاقات کے مقررہ اوقات اور دوست داری کا مستند حوالوں کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے۔اس کے علاوہ ان کی دیگر دلچسپیوں مثلاً ورزش، سپہ گری، پتنگ بازی، کبوتر، بلی، چھڑیوں کا شوق، موسیقی اور سوز خوانی، حقہ، گوشت اور غسل تفریحی کے ساتھ مذہبیات میں معرفت اور تصوف، سریت اور مخفی علوم اور فوق فطری روایتوں کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔

پانچواں باب 'انیس عہد امجد علی شاہ میں' ہے۔اس باب میں جن ضمنی عناوین کے ذیل میں انیس کی زندگی کے احوال وکوائف کا ذکر کیا گیا ہے ان میں ہمشیرہ کی شادی، تاراجی کربلائے معلی، بادشاہ محل عالم اور انیس، انیس کی مجلس میں نجات حسین کی شرکت، خلیق کا آخری زمانہ، وفات خلیق، مدفن، انیس خلیق کے بعد، انس سے رنجش، معرکۂ انیس و دبیر کا آغاز، ارسطو جاہ کی مجلس، علمائے لکھنؤ سے مراسم، مفتی میر عباس اور انیس، بیٹی کا عقد، صابر داماد انیس، آتش کی وفات وغیرہ بے حد اہم ہیں۔ چھٹا باب 'عہد واجد علی شاہ میں' ہے۔اس باب میں جن ذیلی عنوانات کے ذریعہ انیس کی روداد حیات کو پیش کیا گیا ہے ان میں شاہی خاندان کی منظوم تاریخ، انیس کا مشاہرہ، انیس اور نواب علی نقی خاں، انیس اور دیانت الدولہ، بحر اور انیس، ولادت رشید و مانوس، نخاس میں سکونت، مفتی صاحب سے رنجش، تجدید مراسم، سٹّی میں سکونت، شاہی مجلس: انیس و دبیر کی یکجا خواندگی، مقیم الدولہ کی معتوبی کی روایت، ضمیر کی مجلس سوم، انیس کی ایک مجلس کا مرقع خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اسی طرح ساتواں باب ''انتزاع سلطنتِ اودھ، آشوب (1857) کے عنوان سے ہے۔اس میں آشوب اور انیس، منصور نگر، انیس کی عمارتوں کا انہدام اور زمین کی ضبطی، سلیس فرزند انیس کا قید ہونا، بیٹی کی وفات، محمد حسین آزاد اور انیس کی ملاقات، انتزاع کے بعد انیس کے قدردان اور احباب وغیرہ کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے جس سے انیس کی زندگی ناگفتہ بہ حالات و واقعات کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔نوویں باب میں 'راجا بازار کی سکونت' دسویں باب میں 'انیس کی آخری قیام گاہ' گیارہویں باب میں 'زندگی کے آخری سال' اور بارہویں باب میں 'بیماریاں، مرضِ موت اور وفات کا تفصیلی ذکر کیا گیا ہے۔ مذکورہ تمام حالات و واقعات کو مدلل اور مستند انداز میں نیر مسعود نے اس کتاب میں پیش کر کے قارئین کے لیے آسانیاں فراہم کر دی ہیں۔ یہ کتاب ہر اعتبار سے استناد کا درجہ رکھتی ہے۔امید ہے علمی اور ادبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہوگی۔

قومی تہذیب کا مسئلہ

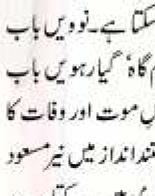

مرتب: سید عابد حسین

صفحات: 220، قیمت: 120 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

مبصر: مصطفیٰ علی

ریسرچ اسکالر، شعبہ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ یافتہ ڈاکٹر سید عابد حسین اردو کے ممتاز دانشور، معلم، فلسفی، انشا پرداز، مفکر اور صاحب طرز نثر نگار ہیں۔ چونکہ انھوں نے جرمنی سے فلسفہ میں ڈاکٹریٹ کیا ہے اس لیے فلسفہ ان کا خاص میدان ہے۔ ہندوستانی تہذیب میں خاص طور پر دلچسپی رکھتے ہیں۔ان کے نزدیک پورا برصغیر ہند مجموعی طور پر ایک تہذیبی وحدت ہے۔ انگریزی اور جرمنی زبان میں بھی انھیں مہارت حاصل ہے اس لیے انھوں نے ترجمے کا کام بھی بکثرت کیا ہے۔ان کی بے شمار تصانیف نے لوگوں سے داد و تحسین حاصل کی ہیں، جن میں پردۂ غفلت، اقبال کا تصور خودی، مسلمان اور عصری مسائل، ہندوستانی مسلمان آئینۂ ایام میں وغیرہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مصنف نے ابتدا سے اپنے زمانے تک ہندوستانی تہذیب کی نشوونما پر خامہ فرسائی کرتے ہوئے اس کی مرکزی اور بنیادی خصوصیات بتلائی ہیں تاکہ عوام میں ان کے تحفظ کا ادراک پیدا ہو۔جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ اس مسئلے پر جو آزاد ہند کے لیے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے معروضی علمی نقطۂ نظر سے بحث کی جائے۔ ہندوستانی قومیت اور قومی تہذیب کی تاریخی نشوونما اور موجودہ صورت حال کا جائزہ لیا جائے اور اس کے بقا و استحکام کی تدبیروں پر غور کیا جائے۔''

سید عابد حسین صاحب کا ماننا ہے کہ ہندوستان کو مختلف نسلوں اور مذہبوں کے ماننے والوں نے اپنے خون جگر سے سینچا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ملک مشترکہ تہذیب کا علمبردار ہے۔اس کی تہذیب کثرت میں وحدت کے ایک نازک توازن پر مبنی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں انھوں نے ہندوستان کی قومی وحدت کو مضبوط کرنے کے لیے کچھ تجویزیں بھی بجھائی ہیں جو ہمیں دعوتِ غور و فکر دیتی ہیں۔ مذہب کے سلسلے میں ان کا ماننا ہے کہ وحدت، مساوات، محبت، خدمت اور انصاف ہی جسدِ مذہب کی جان ہے۔ مذہبی منافرت کی سنگلاخ زمینوں میں بھی محبت کی سرسبز و شاداب فصل اگانے کا ہنر اس کتاب میں موجود ہے، اور یہ صرف جملے بازی کی بنیاد پر نہیں بلکہ دلائل و براہین کی ٹھوس بنیادوں پر ہے۔اس کا اندازہ آپ درج ذیل اقتباس سے لگایئے:

''مغل طرز تعمیر میں وہ نئی خصوصیات پیدا ہو گئیں جو نہ قدیم ہندوستانی طرز میں تھیں نہ ایرانی طرز میں۔ مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ شاہجہاں کے زمانے میں ایرانی اور ہندوستانی ذہن نے مل کر ملکی ماحول اور ملکی سامان کے مطابق عناصر میں ترمیم اور جدید عناصر کی تخلیق کر کے ایک نیا طرز تعمیر نکالا جس کے اجزائے ترکیبی وحدت کے سانچے میں اس طرح ڈھل گئے تھے کہ ان میں دیسی اور بدیسی کی تفریق کرنا اگر ناممکن نہیں تو بے معنی ضرور تھا۔ تاج محل کا طلسم، خواہ وہ شیراز کے ماہر تعمیر کی نگرانی میں تیار ہوا ہو، ہندوستانی بادشاہ کے ذہن کی پیداوار اور ہندوستانی محبت کی یادگار ہے، ہندوستان کے سنگ مرمر سے بنا ہے اور ہندوستان کی پاکیزہ، پر امن، پر درد روح کا مظہر ہے۔''

عابد حسین صاحب کی تمام باتوں کا مرکزی نقطۂ وحدت ہے۔ کثرت میں وحدت جو اس ملک کی عظیم صفت ہے اس کا شجرہ کیسے عالمانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

''ہندوستان کی کئی ہزار سال کی تہذیبی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اس میں گوناگوں کثرت کے اندر وحدت کا جو باریک رشتہ موجود ہے وہ ارباب قوت کے جبر و تشدد سے نہیں بلکہ عارفوں کے وجدان سے، فلسفیوں کی فکر سے، زاہدوں کی ریاضت سے اور فنکاروں کے تخیل سے پیدا ہوا ہے اور یہی وسیلے ہیں جن کے ذریعے سے اسے زیادہ وسیع، مضبوط اور پائدار بنایا جا سکتا ہے۔''

یہ کتاب آزادی سے قبل جب لکھی گئی تھی بہت ضخیم تھی، پھر قارئین کے مزاج کو دیکھتے ہوئے دوبارہ اسے مختصر کر کے شائع کیا گیا۔ مقدمے کے ساتھ اس میں کل گیارہ ابواب ہیں۔ اس کا پیش لفظ سابق صدر جمہوریۂ ہند ڈاکٹر ایس۔ رادھا کرشنن نے تحریر فرمایا ہے۔اس کتاب سمندر کے ہر ورق پر علم کے گوہر و جواہر بکھرے پڑے ہیں لہٰذا یہ کتاب تاریخ، تہذیب، جغرافیہ، سیاست اور ادب سے دلچسپی رکھنے والے ہر قاری کے لیے لائق مطالعہ ہے۔

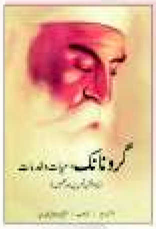

گرونانک: حیات و خدمات

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے
مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب، مفتی محمد مشتاق تجاروی
ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی
مبصر: نایاب حسن، 22/A5، سیما اپارٹمنٹ
بٹلہ ہاؤس، گلی نمبر 7، جامعہ نگر، نئی دہلی 25

گرونانک (1469-1539) ہندوستان کی ان گنی چنی شخصیات میں سے ایک ہیں جن پر اس ملک کی تہذیبی قدروں، سماجی و ثقافتی ہم آہنگی اور بین المذاہب تفاہم کی بنیاد ہے۔ ہندوستان اپنے جس قدیم معاشرتی اشتراک و جمہوری کلچر کا علمبردار رہا ہے اس کی جڑیں بابا گرونانک جیسی شخصیات سے ہی جڑی ہوئی ہیں۔ ہندوستان کے ایک مذہبی طبقے (سکھ) کے بانی گرونانک مجموعی طور پر تمام ہندوستانیوں کے لیے قابلِ احترام ہیں اور سب ان کی عزت کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیغامات میں تمام لوگوں کے تئیں خیرخواہی کا اظہار کیا ہے۔ گرونانک نے پہلے خود عرفانِ حق کے لیے روئے زمین کے مختلف ملکوں کے اسفار کیے اور اپنے دور کی مختلف شخصیات سے مل کر اور حیات و کائنات کے حقائق پر غور کر کے ایک نتیجے پر پہنچے اور پھر اصلاحِ قوم کا بیڑہ اٹھایا۔ بنیادی طور پر ان کا مقصد یہ تھا کہ انسان کو اس کے اصل خالق کی بارگاہ میں جھکایا جائے اور انسانیت کی خدمت میں لگایا جائے، اسی وجہ سے سکھ مذہب کی جو سب سے مقدس کتاب ہے گروگرنتھ صاحب اس میں سکھ گروؤں کے علاوہ دیگر مذاہب کی اہم شخصیات کے اقوال و فرمودات کو بھی جمع کیا گیا ہے، جن میں مشہور مسلم صوفی اور پنجابی زبان کے پہلے شاعر بابا فرید کا کلام بھی ہے۔ شری گروگرنتھ صاحب ایک کتاب ہی نہیں؛ بلکہ دنیا کے اہم ترین مبلغینِ مذاہب کی تعلیمات کا مجموعہ بھی ہے۔ اس طرح گروگرنتھ صاحب میں رنگارنگی، تنوع اور انیکتا میں ایکتا پائی جاتی ہے۔ گرونانک کی تعلیمات کا مرکز و محور وحدتِ خداوندی ہے، سو گروگرنتھ صاحب میں بھی ارتکاز اسی پیغامِ وحدت پر ہے جس کی طرف اقبال نے یوں اشارہ کیا تھا کہ

پھر اٹھی توحید کی آخر صدا پنجاب سے
ہند کو اک مردِ کامل نے جگایا خواب سے

گرونانک کی شخصیت کی اس ہمہ جہتی کی وجہ سے انھیں ہندوستان کے تمام مذاہب کے ماننے والوں میں تعظیم و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور ہر زبان میں ان پر لکھا بھی جاتا رہا ہے۔ اردو زبان میں بھی سکھ مذہب اور گرونانک جی کے حوالے سے بہت کچھ لکھا گیا ہے اور اردو کے کئی اہم شعرا نے ان کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے۔ اقبال کی نظم 'نانک' تو شہرتِ عام رکھتی ہے، ان کے علاوہ گوپی ناتھ امن لکھنوی، جوش ملسیانی، علامہ سیماب اکبرآبادی، تلوک چند محروم، عزیز وارثی، ساغر نظامی وغیرہ کی نظمیں بھی اس حوالے سے مشہور ہیں۔ اس سال ان کی پیدائش کو ساڑھے پانچ سو سال ہوگئے۔ اس کی مناسبت سے ہندوستان و پاکستان میں بڑے پیمانے پر انھیں خراجِ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ اسی حوالے سے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے اردو دنیا کو از سر نو گرونانک جی کی شخصیت اور ان کی خدمات و تعلیمات سے متعارف کروانے کے لیے 'گرونانک: حیات و خدمات' کے نام سے ایک جامع کتاب شائع کی ہے۔ اس کے مرتبین پروفیسر اختر الواسع، محمد حبیب اور مفتی محمد مشتاق تجاروی ہیں۔ اس میں دراصل گرونانک اور سکھ مذہب کے تعلق سے لکھی گئی اہم تحریروں کو جمع کیا گیا ہے، ساتھ ہی اس تعلق سے ماضی و حال میں لکھی گئی کتابوں کی نشان دہی بھی کی گئی ہے۔ کتاب کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں نثری تحریریں ہیں اور دوسرے میں منظوم کلام۔ پہلے حصے میں پروفیسر اختر الواسع (بابا گرونانک کا روحانی مشن)، مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی (بابا گرونانک دیو ایک نظر میں)، خواجہ حسن نظامی (بابا گرونانک دیو خواجہ حسن نظامی کی نظر میں)، پروفیسر محمد حبیب (سکھ مذہب کا اجمالی تعارف)، ڈاکٹر ایس ایس کشن پوری (گروگرنتھ صاحب: ایک تعارف)، جے ایس جوہر (گروگرنتھ صاحب کے مندرجات)، اقبال انصاری (جپ جی صاحب: ایک مقدس آہنگ)، ڈاکٹر رحمان اختر (اردو اور سکھ مذہب کا باہمی رشتہ)، ڈاکٹر ندیم احمد ندیم (اردو کے ابتدائی نقوش اور سری گروگرنتھ صاحب)، ڈاکٹر ناشر نقوی (کلامِ نانک کے منظوم اردو ترجمے)، ڈاکٹر سید حسن عباس (گرونانک صاحب کا فلسفۂ حیات)، حکیم محمد حسین خاں شفا (گرونانک اور ان کے مت کا تذکرہ فارسی زبان میں)، مفتی مشتاق تجاروی (گرونانک اردو میں: منتخب کتابیات) کے مضامین ہیں۔ مضامین کے انتخاب میں خاص قسم کی ترتیب کو ملحوظ رکھا گیا ہے؛ چنانچہ انھیں پڑھ کر گرونانک جی کی شخصیت اور زندگی کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی ہیں، سکھ مذہب کے آغاز اور پس منظر کا بھی علم ہوتا ہے، ساتھ ہی سکھ مذہب کی مقدس کتاب سے متعارف ہونے اور اس کے مشمولات کے بارے میں بھی جانکاری حاصل ہوتی ہے اور اخیر میں اردو زبان اور سکھ مذہب کے لٹریچر سے اس کے رشتوں سے بھی آشنائی ہوتی ہے۔ یہ مضامین زبان و بیان کی خوبیوں سے بھی آراستہ ہیں اور معلومات افزا بھی ہیں۔ حصہ نظم میں نظیر اکبرآبادی (گرونانک شاہ)، اقبال (نانک)، مہاراج بہادر برق دہلوی (تصویرِ نانک)، ساغر نظامی (پیغامِ نانک)، تلوک چند محروم (تصویرِ رحمت، جامِ نانک)، جوش ملسیانی (گرونانک اور شہنشاہ بابر)، کنور مہندر سنگھ بیدی (نانک)، عزیز وارثی (بابا گرونانک)، گوپی ناتھ امن لکھنوی (قابلِ احترام)، علامہ سیماب اکبرآبادی (عظمتِ گرونانک)، مہدی نظمی (گرونانک کی تعلیمات)، جگن ناتھ آزاد (نانک)، کالی داس گپتا رضا (گرونانک کے چرنوں میں) کی نظمیں شامل ہیں۔

اردو زبان میں گرونانک جی کی شخصیت و تعلیمات اور سکھ مذہب سے متعلق بنیادی معلومات کے حصول کے لیے یہ کتاب نہایت اہم ہے اور اس کا مطالعہ نہایت مفید ثابت ہوسکتا ہے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نے ادبیات، انسائیکلوپیڈیا لغات، تاریخ، تعلیم و تدریس، زبان و لسانیات، سائنس، تکنیک اور جغرافیہ، سیاست، صحافت، طب و معالجات، فلسفہ، فنون لطیفہ، قانون، کتب خانہ داری، معاشیات، تجارت، نفسیات، بچوں کا ادب اور دیگر موضوعات پر بڑی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ کونسل کی تمام مطبوعات درج ذیل پتہ پر حاصل کی جاسکتی ہیں:
شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی – 110066
NCPUL, West Block -8, Wing No. 7, R.K. Puram, New Delhi 110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159
E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

تحقیق و تنقید

شمس نامہ

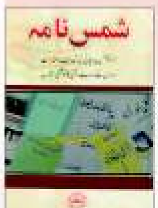

مرتب کا نام: پروفیسر سید حسن عباس
صفحات: 152، قیمت: 200 روپے، سنہ اشاعت: 2020
ناشر: مرکز تحقیقات اردو فارسی، گوپال پور، باقر گنج، سیوان (بہار)
مبصر: ڈاکٹر فرقان سنبھلی، ویمنس کالج
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ۔ 202002

گذشتہ تیس برسوں میں جن ادیبوں، محققین اور ناقدین نے اپنی انفرادی شناخت قائم کی ہے، ان میں ڈاکٹر شمس بدایونی کا نام انتہائی اہم تصور کیا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز شاعری سے کیا لیکن تحقیق اور تنقید ان کی پہلی پسند بن گئیں۔ تحقیق و تنقید کے میدان میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ ان کے پسندیدہ موضوعات میں بدایوں کا ادب، ضرب المثل اشعار، مکتوباتی ادب، نعت رسول، غالبیات، شبلیات، سرسیدیات شامل ہیں۔ موضوعاتی تنوع، نئے نئے موضوعات پر تحقیق کرنا اور موضوع کا حق ادا کر دینا ان کا وصف خاص ہے۔ تحقیق کے لیے وہ ان موضوعات کو ترجیح دیتے رہے ہیں جن میں علمی و فکری گوشے روشن کرنے کی گنجائش ہو۔ شمس بدایونی نے 1980 میں 'غالب بدایوں میں' لکھ کر اپنی محققانہ صلاحیتوں کا اظہار کیا تھا۔ یہ مضمون 'غالب اور بدایوں' کتاب کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔ 'تفہیم غالب کے مدارج' اور 'مزار غالب' کتابوں کو بھی ناقدین کی خاص توجہ حاصل ہوئی۔ یہی نہیں ان کی مختلف موضوعات پر متعدد تصانیف و تالیفات منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ ان میں شعری ضرب الامثال، اردو نعت کا شعری محاسبہ، حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں، شبلی اور آزاد، جہات سرسید، شبلی کی ادبی و فکری جہات، مکتوباتی ادب، نظامی بدایونی، اور نظامی پریس وغیرہ شامل ہیں۔ آج کل سنجیدہ تحقیق سے رغبت رکھنے والوں کا جیسا قحط دکھائی دے رہا ہے ایسے ماحول میں شمس بدایونی کی کاوشوں کی قدر کرنا حق دار کا حق ادا کرنے کے مترادف ہے۔ یہ اچھی بات ہے کہ شمس بدایونی کی تحریروں کے قدردان کم نہیں ہیں اور اس سے بھی بڑھ کر بات یہ کہ ان کے قدرداں نامور اور سرفہرست ادبا ہیں۔ پروفیسر حسن عباس ایسے ہی نامور ادبا، میں شامل ہیں۔

'شمس نامہ' میں پروفیسر سید حسن عباس نے شمس بدایونی کے مقالات، تصنیفات و تالیفات کا جامع تعارف پیش کیا ہے نیز بطور ناقد، محقق اور صحافی، ان کی خدمات کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔ پروفیسر حسن عباس ان تمام اصول و ضوابط سے پوری طرح واقف ہیں جو وضاحتی کتابیات اور اشاریہ کو مرتب کرنے میں اہم کردار نبھاتے ہیں۔ انھوں نے متعلقہ معلومات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ کوئی گوشہ کوئی پہلو تشنہ معلوم نہیں ہوتا۔ اسی لیے 'شمس نامہ' ڈاکٹر شمس بدایونی کی علمی اور تصنیفی قدر و منزلت کو متعین کرنے میں ایک مثالی ماخذ کے طور پر سامنے آیا ہے۔

'شمس نامہ' میں مرتب کے پیش نامہ اشاریہ شمس بدایونی کے علاوہ، ڈاکٹر معین الدین عقیل کی تحریر 'شمس نامہ ایک تعارف'، عتیق جیلانی سالک کا مضمون 'سہ ماہی روشن مرحوم' اور سید آفتاب علی کا مضمون 'اشاریہ سہ ماہی روشن بدایوں' بھی شامل ہیں۔ پروفیسر حسن عباس نے اپنے مرتبہ وضاحتی اشاریہ کو شمس بدایونی کے کام کی نوعیت کے اعتبار سے مختلف شقوں میں تقسیم کر کے موضوعاتی طور پر مرتب کیا ہے۔ اس اشاریہ کے ذریعہ ان کے جملہ کام کی نوعیت و کیفیت سامنے لائی گئی ہے۔ مرتب نے (1) تصنیفات، تالیفات اور مرتبات، (2) مقالات کتابوں میں (3) مقالات و مضامین رسائل میں (4) میزان 'تبصرے' کے عنوانات قائم کر کے ان کی 25 مطبوعات، 177 مقالات اور 128 تبصروں کا مفید و معیاری وضاحتی مطالعہ پیش کیا ہے۔

'شمس نامہ، ایک تاثر' میں ڈاکٹر معین الدین عقیل نے لکھا ہے کہ:

''شمس نامہ، شمس بدایونی کی خدمات ادب بشمل، شاعری، ادبی صحافت، تنقید اور تحقیق وغیرہ کا ایک جہان معنی لیے ہوئے ہے کہ جو تہہ در تہہ ایک دعوت مطالعہ دیتا اور پوری طرح اپنے عہد اور اس کے مزاج و احساس کی بھرپور ترجمانی اور نمائندگی بھی کرتا ہے۔'' (ص 9)

ڈاکٹر معین الدین عقیل کی اس رائے سے قارئین اتفاق و اختلاف کر سکتے ہیں۔ بطور قاری مجھے ان کی رائے سے اتفاق کرنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں ہوتی۔ دور حاضر میں اشاریہ سازی کی اہمیت و افادیت میں روز افزوں اضافہ ہو رہا ہے۔ اشاریہ سازی کا اہم مقصد اور فریضہ کسی مصنف و مرتب کی تمام تحریروں سے واقفیت کرانا ہوتا ہے۔ بہت سے ایسے باکمال ہوئے ہیں جن کی ابتدائی تحریروں سے واقفیت نہیں ہو پاتی ہے۔ اس کی ایک وجہ خود ان حضرات کا اپنی ابتدائی تحریروں کو کمتر مان کر خود ہی بھلا دینا ہے۔ باوجود اس کے جب ان تحریروں کو جمع کیا گیا تو ان کی کافی قدر کی گئی۔ اشاریہ کے ذریعہ ان تمام تحریروں کی نشاندہی ہو جانا اس کی ایک بڑی کامیابی ہے۔ شمس بدایونی کی ابتدائی تحریروں کے تعلق سے بھی یہ اصول ٹھیک معلوم ہوتا ہے۔

مرکز تحقیقات اردو فارسی کا قیام 1992 میں عمل میں آیا تھا۔ تب سے اب تک اس ادارہ نے کئی اہم کتابیں شائع کی ہیں۔ ان میں حکیم سید ظل الرحمٰن، نادم بلخی، مولوی مہیش پرشاد، پروفیسر حنیف نقوی اور پروفیسر امیر حسن عابدی وغیرہ شخصیات کے نام شامل ہیں جن پر خصوصی علمی کام ادارے کی جانب سے انجام دیے گئے ہیں۔ پروفیسر حسن عباس نے اپنی تازہ کتاب میں ڈاکٹر شمس بدایونی کو ان کی علمی بصیرت کے مدنظر منتخب کر کے قارئین کو یہ باور کرانے کی شعوری کوشش کی ہے کہ کوئی شخص تن تنہا اپنی تجارتی مصروفیات کے باوجود بھی علم و ادب کے میدان میں اتنی اہم خدمات انجام دے سکتا ہے۔ پروفیسر سید حسن عباس نے یوں تو شمس بدایونی کی خدمات کا مکمل احاطہ کرنے کی قابل ستائش کوشش کی ہے۔ باوجود اس کے چند کمیوں کا احساس ہوتا ہے جن کی طرف توجہ مبذول کرا دینا مناسب معلوم ہوتا ہے۔ ص 79-78 پر شبلی اور مولانا آزاد کے تعلق سے جن تین مقالوں کا تذکرہ کیا گیا ہے ان میں کتاب ''شبلی اور آزاد (مراسم و تعلق کا اولین دور) ناشر اپلائڈ بکس، دہلی'' کا حوالہ درج ہونے سے رہ گیا ہے۔ رسائل کے حوالے کے ساتھ کتاب کا حوالہ بھی دیا جاتا تو بہتر تھا۔ شمس بدایونی نے شاعری میں بھی خوب طبع آزمائی کی ہے اور مختلف رسائل میں ان کی شعری تخلیقات شائع بھی ہوتی رہی ہیں لیکن ان کی شعری تخلیقات کا اشاریہ شامل کتاب نہیں ہو سکا ہے۔ اسی طرح ان کی کتاب 'مکتوباتی ادب' کلاسک آرٹ پرنٹرس، دہلی سے شائع ہوئی ہے۔ اس کا تذکرہ شمس نامہ کے ص 24 پر موجود ہے۔ اس میں 'ایک قاری کے خطوط' کے عنوان سے مصنف کے وہ 35 خطوط شامل ہیں جو مختلف رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ اگر ان کا اشاریہ بھی شامل کتاب ہو جاتا تو یہ مکتوب نگاری کے ضمن میں اہم کام ہو سکتا تھا۔ علاوہ ازیں شمس بدایونی کے دوسرے مصنفین کی کتابوں پر تحریر کردہ دیباچوں اور مقدموں کے اشاریہ کی کمی کا بھی شدت سے احساس ہوتا ہے۔ افادی پہلوؤں کے مدنظر آئندہ ایڈیشن میں ان کمیوں کی تلافی کی جا سکتی ہے۔ شمس بدایونی کا ادبی سفر ابھی جاری ہے اس لیے اس اشاریہ کو آخری یا مکمل نہیں کہا جا سکتا لیکن اس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بہت سے افادی

پہلوؤں اور پروفیسر حسن عباس کی بہترین کوششوں کے سبب کتاب مستقبل میں اسکالروں کے لیے اہم ماخذ کے طور پر اہمیت کی حامل تصور کی جائے گی۔

ادارہ تحقیقات اردو فارسی، گوپال پور کے ذریعہ حنیف نقوی کی ابتدائی تحریریں مرتبہ شمس بدایونی کی اشاعت اور اب 'شمس نامہ' کی اشاعت سے ادارہ کے وقار میں یقیناً اضافہ ہوا ہے۔ علمی، ادبی، تحقیقی ذوق رکھنے والے قارئین کے لیے پروفیسر سید حسن عباس کی مرتب کردہ کتاب 'شمس نامہ' ایک نادر و نایاب تحفہ ہے۔ قوی امید ہے کتاب کی علمی و ادبی حلقوں میں پذیرائی کی جائے گی۔

اورنگ آباد کے اہم طبّی نباتات

مصنف: ڈاکٹر رفیع الدین ناصر

صفحات: 352، قیمت: 205، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: رومان پبلی کیشن ہاؤس، ولرس کالونی، اورنگ آباد

مبصر: محمد عرفان خان سوداگر

لیکچرار سر سید کالج، روشن گیٹ اورنگ آباد 431001 (مہاراشٹر)

'اورنگ آباد کے اہم طبّی نباتات' استاد محترم ڈاکٹر رفیع الدین ناصر (قومی اعزاز یافتہ معلم) کی سائنس کے موضوع پر تحریر کردہ 35 ویں کتاب ہے، موصوف لگ بھگ 30 سالوں سے درس و تدریس کے پیشہ سے وابستہ ہیں، فی الوقت مولانا آزاد کالج اورنگ آباد مہاراشٹر کے شعبۂ نباتات میں اسسٹنٹ پروفیسر اور ریسرچ گائیڈ ہیں۔

سائنس میں مختلف موضوعات پر بے شمار کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں لیکن مصنف کی یہ کتاب شوق بینی کتب اور ذوق مطالعہ رکھنے والوں کے لیے ایک عظیم تحفہ ہے۔ 'اورنگ آباد کے اہم طبّی نباتات' ایک اہم کتاب ہے، جس کو منظر عام پر لانے کے لیے مصنف نے بڑی عرق ریزی سے کام لیا ہے، اس کتاب کو انھوں نے نہ صرف سائنس، یونانی و طبّی میدان سے وابستہ افراد کے لیے کارآمد بنایا بلکہ ایک عام قاری کو بھی اس کتاب سے فائدہ ہو اس کا خاص خیال رکھا ہے۔ اس کتاب میں شامل مواد کے حصول کے لیے مصنف نے شہر اورنگ آباد اور اس کے اطراف و اکناف، گاؤں گاؤں، قریہ قریہ جا کر ماہرین سے مل کر نہ صرف معلومات کو یکجا کیا بلکہ ان تمام نباتات کو جمع کیا، ان پر تحقیق کی اور مطمئن ہونے پر انھیں کتاب میں شامل کیا۔

مصنف نے اس کتاب کے ذریعہ علاقۂ اورنگ آباد میں پائے جانے والے نادر و نایاب نباتات سے نہ صرف روشناس کرایا بلکہ ان کے استعمال اور افادیت کے ساتھ ساتھ ان نباتات کے انگریزی نام اور ملک کی دیگر زبانوں میں انھیں کس نام سے جانا جاتا ہے، ان کی دستیابی کہاں کہاں ہے، ان نباتات کی ہیئت اور ہر پودے کی دلکش رنگین تصاویر اور ان کے طبّی استعمال پر فرداً فرداً مختصر مگر جامع روشنی ڈالی ہے، حیرت ہوتی ہے کہ ایسے بے شمار نباتات ہمارے اطراف میں پائے جاتے ہیں جنھیں ہم بے کار سمجھتے ہیں۔ کتاب کی فہرست پر نظر ڈالنے سے قرآن کی آیت یاد آئی "رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا" (پروردگار تو نے اس کائنات میں کوئی شے بے کار پیدا نہیں کی۔) مثال کے طور پر کتاب میں شامل نباتات جیسے بے شرم، بکان، ببول، پان، ریٹھا، مونگی وغیرہ جن کو ہر خاص و عام جانتا ہے مگر ان نباتات کی طبّی افادیت سے ناواقف ہے، یہ معلومات قاری کو کتاب پڑھنے پر آمادہ کرتی ہیں، مصنف نے کئی برسوں کی محنت شاقہ کے بعد اس کتاب میں اورنگ آباد و اطراف میں پائے جانے والے تقریباً 234 نباتات کی مکمل معلومات مع رنگین تصاویر فراہم کی ہے، موصوف کی یہ کاوش لائق صد مبارک باد ہے۔

یہ کتاب ایک طرف سائنس سے دلچسپی و ذوق مطالعہ رکھنے والے افراد، طبّی و یونانی تعلیمی اداروں کی نصابی ضرورتوں کو بھی پورا کرتی ہے، تو دوسری طرف شعبۂ نباتات کے طالب علموں، محققین طلبا کے لیے کسی بیش بہا تحفے سے کم نہیں ہے، یقیناً یہ کتاب تاریخی شہر اورنگ آباد کے علمی سرمایے میں ایک کارآمد اضافہ ہے، کتاب کی علمی و تحقیقی و طبّی میدان میں افادیت پر روشنی ڈالتے ہوئے ملک کے مشہور سائنسداں ڈاکٹر محمد اقتدار حسین فاروقی (سابق ڈپٹی ڈائریکٹر اینڈ انچارج پلانٹ کیمسٹری ڈویژن، نیشنل بوٹنیکل ریسرچ انسٹی ٹیوٹ لکھنؤ) رقمطراز ہیں "یہ کتاب ڈاکٹر رفیع الدین ناصر کے قلم سے نکلی ہوئی ایک بہترین کاوش ہے، جس میں انھوں نے انسانی صحت کو بہترین رکھنے کے لیے علاقے کے مختلف پودوں کے استعمال بیان کیے ہیں" نیز انھوں نے اس کتاب کی پذیرائی کی اور اردو قارئین سے اس کتاب سے استفادہ کی خواہش ظاہر کی ہے۔"

توقع ہی نہیں بلکہ یقین کامل ہے کہ یہ کتاب نہ صرف شہر اورنگ آباد بلکہ ریاستی، ملکی اور بین الاقوامی سطح پر اپنی شناخت قائم کرے گی۔

ترقی پسند ادبی صحافت

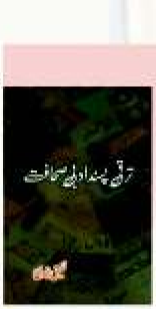

مصنف: لئیق رضوی

ضخامت: 276، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قلمکار، اراولی پارٹمنٹ، نوئیڈہ، یوپی

مبصر: سید عینین علی حق، B-91، سیکنڈ فلور، حیات انکلیو

کھجوری پشتہ روڈ، غازی آباد۔ 201102 (یوپی)

زیر مطالعہ کتاب "ترقی پسند ادبی صحافت" اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے منفرد ہے۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعہ ادب کی مختلف اصناف سخن پر خوب طبع آزمائی کی گئی اور ان پر تحقیقی و تنقیدی کام بھی کیے گئے، لیکن ادبی صحافت پر مستحکم کام انجام نہیں دیا گیا۔ مذکورہ کتاب ترقی پسند ادبی صحافت کے مصنف لئیق رضوی ہیں۔ لئیق رضوی کا اسلوب نہایت شستہ اور سہل ہے۔ وہ عبارت کو مبہم نہیں بناتے بلکہ چھوٹے چھوٹے جملے ان کی تحریر کی خوبصورتی کا حصہ ہیں۔ صحافت کے ناگفتہ بہ حالات کے اس دور میں لئیق رضوی جیسے صحافی صحافت اور ادبی صحافت کے باغیچے کی مسلسل آبیاری کر رہے ہیں۔

ترقی پسند تحریک ادبی صحافت کا درخشاں عہد رہا ہے، جس نے ادب کے ساتھ ساتھ ترقی پسند تحریک کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا، جسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ کوئی بھی ادبی تحریک ہو یا رجحانات ادبی صحافت کے بغیر مکمل نہیں ہوتے۔ تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو بلا مبالغہ ترقی پسند تحریک اور اردو ادب کے فروغ میں صحافت سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ خواہ وہ اخبارات ہوں یا رسائل و جرائد۔ کلیم، ہندوستان، ساقی، شعاع اردو، نیا ادب اور افکار وغیرہ وہ رسالے ہیں، جنھوں نے ادبی صحافت کی سمت و رفتار طے کی۔

لئیق رضوی نے اپنی مختصری کتاب میں ترقی پسند تحریک اور ادبی صحافت کو بہت ہی حسن و خوبی کے ساتھ متعارف کرایا ہے۔ اس کتاب کی خاص بات یہ ہے کہ ہر دور کے اہم رسائل و جرائد پر مختصر مگر پر مغز گفتگو کی گئی ہے۔ کتاب کا آغاز پیش لفظ سے ہوتا ہے، جس میں مصنف نے ترقی پسند تحریک سے وابستگی اور لکھنے پڑھنے کے دور کا آغاز کس طرح ہوا، اس کا احوال بیان کیا ہے۔ انھوں نے کتاب کے حوالے سے ایک اہم دعویٰ بھی کیا ہے کہ یہ کتاب محض کھتونی نہیں بلکہ ترقی پسند ادبی صحافت کے 80 برسوں پر محیط کاموں پر سنجیدگی سے بات کی گئی ہے۔ واقعی کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے ان باتوں کا احساس بھی ہوتا ہے کہ مصنف نے رسائل و جرائد کو بغور پڑھا ہے، اس کے بعد اپنی رائے پیش کی ہے۔

پہلے باب میں ترقی پسند ادبی صحافت کی تعریف کی گئی ہے۔ اس باب کے تحت مصنف نے ثابت کیا ہے کہ بڑی تعداد میں ادبی ذخائر رسائل و جرائد میں محفوظ ہیں۔ جن کے بغیر ادب کی بازیابی ممکن نہیں۔ مصنف نے صحافت کی مختصراً تعریف پیش کرتے ہوئے ماہنامہ خیر خواہ ہند 1847 سے لیکر ترقی پسند تحریک کی نیو کی اینٹ رکھے جانے کا ذکر بہت ہی بہترین انداز میں کیا ہے۔ دوسرے باب سے پانچویں باب تک ابتدا سے لے کر سن 2000 تک کے اہم رسائل و جرائد پر بات کی گئی ہے۔ آزادی سے قبل غیر منقسم ہندوستان سے لیکر اکیسویں صدی کے بھی اہم رسائل پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ چھٹے باب میں 21 ویں صدی کی ادبی صحافت پر گفتگو کی گئی ہے۔ جس میں نیا سفر، نیا ورق، مژگاں، اقدار، آب وگل وغیرہ شامل ہیں۔ جب کہ ساتواں باب کمیونسٹ اخبار و جرائد کے لیے مختص کیا گیا ہے۔ آٹھویں باب کے ذریعہ سرحد کے پار ہورہی ادبی صحافت کی منظر کشی کی گئی ہے۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ریسرچ اسکالر پاکستانی فن پاروں پر کام کرنے سے گریز کرتے ہیں، کیوں کہ پاکستان سے شائع شدہ کتابیں اور رسائل و جرائد تک رسائی جوئے شیر لانے کے مترادف ہوتی ہے۔ ایسی صورت حال میں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے کس طریقے سے رسائل یکجا کیے اور یہ کتاب پایۂ تکمیل کو پہنچ سکی۔ لئیق رضوی نے پاکستان کے نمائندہ رسائل و جرائد پر بات کی ہے۔ ساقی، افکار، ادب لطیف، سویرا، نقوش، سنگ میل، ماہنامہ جاوید، نئی قدریں اور ماہنامہ سحر وغیرہ کی ابتدائی صورت حال سے باخبر کیا ہے۔ نواں باب زبان و ادب کی خدمات کے عنوان سے قائم کیا گیا ہے۔ آخری باب میں ادبی صحافت پر مجموعی گفتگو کی گئی ہے اور صحافت کے موجودہ منظر نامے پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

البتہ کتاب کے عنوان سے محسوس ہوتا ہے کہ ترقی پسند ادبی صحافت کو ہی متعارف کرایا گیا ہے، مگر ایسا قطعی نہیں ہے، بلکہ بلا تفریق دیگر تحریک اور رجحانات کے بینر تلے منظر عام پر آئے رسائل و جرائد پر بھی بات کی گئی ہے۔ لئیق رضوی کی کتاب 'ترقی پسند ادبی صحافت' دانشوروں کے لیے ایک بیش بہا نذرانہ ہے تو وہیں ادب کے طالب علموں کے لیے ایک نعمت۔ جس کے مطالعے سے انھیں اپنے تحقیقی کاموں میں مدد ملے گی۔ یہ کتاب ادبی صحافت پر ایک نادر و نایاب سرمایہ ہے۔

تنویر اختر رومانی: شخص اور افسانہ نگار

مرتب: ڈاکٹر اختر آزاد

ضخامت: 172، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

مبصر: سمیہ محمدی

ریسرچ اسکالر، شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

ادبی دنیا میں تنویر اختر رومانی کی ایک الگ شناخت ہے۔ انھوں نے کہانیاں، ڈرامے، انشائیے، نظمیں، غزلیں اور تراجم کے علاوہ تبصرے بھی لکھے ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ 1975 میں ندامت کے آنسو کے عنوان سے رسالہ بتول، رام پور میں شائع ہوا تھا اور اب تک ان کے کئی درجن افسانے اور افسانچے شائع ہو کر قارئین و ناقدین کی داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

زیر نظر کتاب میں مختلف ناقدین کے مضامین شامل ہیں۔ ان مضامین کے مطالعے سے ہم تنویر اختر رومانی کی افسانہ نگاری اور ان کے فن کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ اختر آزاد نے لکھا ہے کہ تنویر اختر رومانی کے نام میں رومانی کا ٹائٹل دراصل اختر رومانی کی مناسبت سے لگا ہے، جو مشہور فلمی مکالمہ نگار تھے۔ اختر آزاد نے یہ بھی لکھا ہے کہ تنویر اختر رومانی 1975 سے 1990 تک مسلسل افسانہ لکھتے رہے مگر پھر اچانک یہ سلسلہ منقطع سا ہو گیا اور 1990 سے 2014 تک ان کے صرف دو تین ہی افسانے شائع ہوئے۔ اب یہ سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا ہے اور ان کے افسانے اردو کے اہم رسائل و جرائد میں شائع ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر اختر آزاد نے کتاب کے دیباچے میں تنویر اختر رومانی کی شخصیت اور ان کے افسانوں کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ انھوں نے اپنے دیباچے میں لکھا ہے کہ تنویر اختر رومانی کی اساس اصلاحی نقطۂ نظر سے ضرور ہے مگر انھوں نے فن سے سمجھوتا نہیں کیا۔ ہاں کہیں کہیں خطیبانہ رنگ اور وضاحتی انداز نے افسانے کی کڑی کو کمزور ضرور کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے میں تنویر اختر رومانی کے افسانوں اور ان کی شخصیت کے ساتھ ان کے فن پر گفتگو کی گئی ہے جب کہ دوسرے حصے میں ان کے افسانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔

کتاب میں شامل پہلا مضمون ڈاکٹر کرشن بھاوک کا 'رومانی کے افسانوی فن کی بے نظیر تنویر' ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے تنویر اختر رومانی کے افسانوں کا مختصر جائزہ لیا ہے۔ یہ جائزے بے حد مختصر تو ہیں مگر مضمون نگار نے کم اور مختصر جملوں میں افسانے کے موضوع اور فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔

کتاب میں شامل دوسرا مضمون 'تنویر اختر رومانی کا ببول' ہے، جسے سید احمد شمیم نے تحریر کیا ہے۔ 'ببول' تنویر اختر رومانی کے نمائندہ افسانوں میں شمار ہوتا ہے۔ 'ببول' ان کے افسانوں کا پہلا مجموعہ ہے جس میں چھوٹے بڑے بیس افسانے شامل ہیں۔ سید احمد شمیم نے لکھا ہے کہ جن کہانیوں میں افسانہ نگار نے اختصار سے کام لیا ہے اس کو پڑھتے ہوئے تنویر اختر رومانی کی بالغ نظری اور کہانی کے فن پر ان کی گرفت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنویر اختر رومانی کی کہانیوں میں زبان کی درستگی، الفاظ کا برمحل استعمال اور کفایت لفظی کا بھرپور اور خوبصورت استعمال ہوا ہے۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کا مضمون 'تنویر اختر رومانی کے افسانوں میں امکانات' بھی کتاب میں شامل ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ تنویر اختر رومانی نے انسانی فکر و عمل کے ساتھ اس کے مضحکہ خیز پہلوؤں کو بھی اپنے افسانوں میں برتا ہے، وہ ماحول کے جبر کے خلاف احتجاج کرنا جانتے ہیں۔ عشرت ظہیر نے 'سنہری قدروں کا امین افسانہ نگار: تنویر اختر رومانی' کے عنوان سے تنویر اختر رومانی کے افسانوی سفر اور فن کا جائزہ پیش کیا ہے۔ عشرت ظہیر کا خیال ہے کہ تنویر اختر رومانی کے افسانے دراصل سماج میں پھیلی خود غرضی، ہوس پرستی، سفاکی، بدنیتی اور عدم تحفظ کے احساس کی نمائندگی کرتے ہیں۔ عشرت ظہیر نے بھی تنویر اختر رومانی کے افسانوں کا جائزہ اختصار سے لیتے ہوئے ان کے یہاں موجود انسان کی ذہنی و روحانی تفکر، درد و الم اور اس کی پیچیدگیوں کی جانب اشارے کیے ہیں۔

ڈاکٹر اسلم جمشید پوری کا مضمون 'زندگی کی سچائیوں کو افسانہ کرنے والا فن کار' بھی کتاب میں شامل ہے۔ اسلم جمشید پوری نے تنویر اختر رومانی کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے لکھا ہے کہ پریم چند، انتظار حسین، منٹو، بیدی وغیرہ نے افسانوی دنیا میں جو نقش چھوڑے تھے تنویر اختر رومانی اسی نقش کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں۔ احمد رشید کا مضمون 'تنویر اختر رومانی کا افسانوی مزاج' بھی شامل کتاب ہے۔ ان کا خیال ہے کہ تنویر اختر رومانی کے افسانوں کی خوبی یہ ہے کہ افسانوں کی قرأت کی راہ پر قاری غیر محسوس طریقے سے چلتا ہے اور اختتام پر چونک کر اپنی معاشرتی زندگی کو ٹٹولنے لگتا ہے۔

کتاب کے دوسرے حصے میں تنویر اختر رومانی کے تین منتخب افسانے 'ببول'،

'بھروسہ' اور 'دنگل' پر دو دو تجزیے شامل کیے گئے ہیں۔ یہ تجزیے احمد بدر، اسلم جمشید پوری، نیاز اختر اور علیم اسماعیل کے ہیں۔

ان مضامین کے علاوہ دوسرے مضامین بھی قابل مطالعہ ہیں۔ ان کو پڑھتے ہوئے نہ صرف ہم تنویر اختر رومانی کی افسانہ نگاری کے متعلق نئی نئی باتیں دریافت کرتے ہیں بلکہ اس میں موجود سماجی مسائل اور انسانی زندگی کے مصائب والم کو بھی بہتر طور پر سمجھ پاتے ہیں۔

ڈاکٹر اختر آزاد نے تنویر اختر رومانی کی افسانہ نگاری کو ادبی دنیا سے متعارف کرانے کا کام کیا ہے۔ کیونکہ انھوں نے خود بھی یہ لکھا ہے کہ تقریباً 25 برسوں تک تنویر اختر رومانی نے گنتی کے افسانے لکھے۔ ظاہر ہے نئی نسل ان کے نام اور ان کے کام سے اس طرح متعارف نہ ہو سکی جیسا کہ ہونا چاہیے۔ اب جب کہ تنویر اختر رومانی خود ادبی دنیا میں سرگرم ہو گئے ہیں، یہ امید کی جاسکتی ہے کہ ہماری نسل کے لوگ بھی ان کے افسانوں کا نہ صرف مطالعہ کریں گے بلکہ ان کے فن پر گفتگو کرتے ہوئے ان افسانے میں موجود واقعات پر بھی گفتگو کریں گے۔ ڈاکٹر اختر آزاد کی یہ کتاب یقیناً تنویر اختر رومانی کے فن کو سمجھنے میں ہماری رہنمائی کرتی ہے اور آنے والی نسل بھی اس کتاب سے استفادہ کرے گی۔

دھوپ کی بالکونی سی

مرتب: علامہ عبدالمنان

ضخامت: 327، قیمت: 350 روپے، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: مکتبہ جامعہ، دہلی، علی گڑھ، ممبئی

مبصر: سائرہ عظیم، B-322، گلی 5، منڈاولی فاضل پور، دہلی 92

عمران عظیم ایک اچھے شاعر اور معروف ناقد کے طور پر جانے پہچانے جاتے ہیں۔ شاعری ان کا پہلا عشق ہے۔ ان کی شاعری انڈو پاک کے مختلف رسائل و جرائد میں برابر شائع ہوتی رہی ہے۔ وہ دہلی ہائی کورٹ کے مشہور ایڈوکیٹ ہیں۔ دن بھر عدالتی مصروفیات میں رہ کر خالی اوقات میں شعر و ادب کی خدمت میں مصروف رہتے ہیں۔ کم و بیش 17 کتابیں ان کی منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی شاعری اور تنقیدی صلاحیتیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا ادبی ذوق کس قدر بالیدہ ہے۔

مرتب علامہ عبدالمنان نے ابتدا میں 'عرض مرتب' کے نام سے ایک تحریر اپنے قارئین کے سپرد کی ہے جس میں شاعر موصوف کا تعارف بھی ہے اور مرتب کا اظہاریہ بھی۔ ان کا اظہاریہ کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ مذکورہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔ باب اوّل میں باب 'تفہیم و تعبیر' ہے جس میں اسد رضا، خورشید اکرم اور انا دہلوی کی مفصل تحریریں ہیں جو پر مغز اور معلوماتی ہیں۔ باب دوئم میں 'باب سخن' دو حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلا حصہ (الف) 'لوح عقیدت' ہے جس میں ڈاکٹر شباب للت، نیر قریشی گنگوہی، نظام ہاتف، پروفیسر محمد نعمان خاں، عبدالواجد الندوی اور محمد ساجد کھجناوری کی حمد و نعت کے حوالے سے عمدہ و پختہ تحریریں ہیں جو لائق مطالعہ بھی ہیں۔ باب سخن میں (ب) صرف 'حکایت' کے عنوان سے ہے۔ اس میں ان کی شاعری پر مضمون پاکستان کے مشہور شاعر جمیل منظر کا ہے۔ ان کے بعد پروفیسر عنوان چشتی، عرش صہبائی، ڈاکٹر شریف احمد قریشی، ڈاکٹر اسلم حنیف، قمر سنبھلی، احسن امام احسن، عبدالحی، پیام انصاری، ڈاکٹر فرقان سردھنوی، انور بارہ بنکوی، سراج گلاوٹھی، ڈاکٹر انور مینائی، شمس رمزی، ڈاکٹر فریاد آذر، ابوصارم صارم، انصاری صبیحہ اطہر، عارف رضا اور جگنو چندر دیپوی کے بھاری بھرکم مضامین ہیں۔ یہ بھی حضرات اردو ادب کی معروف شخصیات ہیں۔ باب سوئم کا عنوان باب انتقاد ہے۔ اس باب کے تحت عمران عظیم کے تنقیدی کارناموں کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان پر تفصیلی مضامین لکھنے والوں میں کامل آفریدی، ڈاکٹر شباب للت، ڈاکٹر عباس نقوی، پروفیسر عتیق اللہ، انور ایوبی گنگوہی، پروفیسر ابن کنول، پروفیسر شہپر رسول، حقانی القاسمی، اقبال انصاری، ڈاکٹر معصوم شرقی، راشد جمال فاروقی، ڈاکٹر یونس غازی، سہیل انجم، حبیب سیفی اور طاہر الحسن کے نام شامل ہیں۔ عمران عظیم پر مضامین لکھنے والوں کے نام اردو ادب کے مشہور معروف نام ہیں۔ انھیں اردو ادب میں کون نہیں جانتا۔ یہ عمران عظیم کے لیے بھی فخریہ بات ہے کہ ان پر بھی ممتاز قلمکاروں نے اپنا قلم اٹھا کر اپنی تفصیلی رائے کا اظہار کیا ہے۔ باب چہارم، باب کتب کے عنوان سے اس کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ جن کتابوں پر ادیبوں کے تبصرے ہیں ان کے نام ہیں: حرف زار، آئینہ قریش، آئینہ خوش رنگ (عمران عظیم بہ حیثیت شاعر)، دہلیز، چہار طرف، عکس وحدت و رسالت، منظر منظر خواب، تابش، بہت کچھ، حرف ترسیل، معروضات اور مطالعہ و تفہیم۔ اس سے پیشتر زالی دنیا پبلی کیشنز کے مالک تنویر احمد نے عمران عظیم کی شخصیت پر آئینہ خوش رنگ (عمران عظیم بحیثیت شاعر) ایک خوبصورت کتاب ترتیب دی تھی جسے اردو دنیا نے خوب سراہا تھا۔ باب پنجم کا عنوان 'باب خیال' ہے۔ باب خیال کے تحت عمران عظیم سے ممتاز عالم کی گفتگو، عمران عظیم سے ساحر داؤد نگری کی گفتگو، سفر ہو تو ممبئی کا، عمران عظیم ادب اور معاشرہ اور عمران عظیم کے بارے میں ادبی گفتگو اور دیگر نگارشات ہیں۔ ان کی یہ کتاب تنقیدی نوعیت کی کتابوں میں ایک قابل قدر اضافہ ہے۔ اس کتاب کے تمام مضامین تازہ اور دل کش ہیں۔ ایسا کہیں بھی نہیں لگتا کہ کوئی مضمون زبردستی لکھایا گیا بلکہ تمام موضوعات عمدہ ہیں۔ باب پنجم کے مطالعہ سے عمران عظیم کی مختلف عادات واطوار اور خوش گوار مزاج کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔

انٹرویو

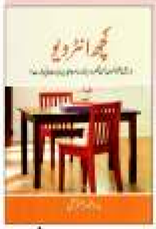

کچھ انٹرویو

مصنف/ ناشر: پروفیسر مظفر حنفی

صفحات: 232، قیمت: 146 روپے، سنہ اشاعت: 2019

مبصر: سید تنویر حسن نقوی

محلہ کشتیان، امروہہ

'کچھ انٹرویو' (باتیں فکر تونسوی، حسن نعیم، وزیر آغا، ساحر ہوشیار پوری، جیلانی بانو سے) پروفیسر مظفر حنفی صاحب کے ذریعہ لیے گئے کچھ انٹرویو پر مشتمل ہے جس میں محترم پروفیسر مظفر حنفی صاحب نے اردو زبان و ادب کے بعض استادان فن کے انٹرویو لیے ہیں۔

'کچھ انٹرویو' میں اپنے اپنے میدانوں کی منفرد مقام و مرتبہ والی شخصیات کے انٹرویو ایک ایسی شخصیت نے لیے ہیں جو خود بھی اردو زبان و ادب کے ایک بہترین نباض اور رمز آشنا ہیں۔

حنفی صاحب کی نظر ان شخصیات کی ادبی و علمی خدمات پر بہت ہی گہری اور مضبوط ہے یعنی جن شخصیات کے انٹرویو لیے گئے ہیں وہ آسمان علم و ادب کے روشن ستارے ہیں۔ حنفی صاحب نے ان حضرات سے وہ وہ باتیں معلوم کی ہیں جو ہما شما کے بس کی بات نہ تھی اور جواب دینے والے فکر تونسوی، حسن نعیم، وزیر آغا، ساحر ہوشیار پوری اور جیلانی بانو نے بھی بہت ہی سوچ سمجھ کر پورے احتیاط سے مکمل ایمانداری کے ساتھ جوابات دیے ہیں۔ خاص طور پر جیلانی بانو کا انٹرویو اردو ادب کا عمدہ و مثالی انٹرویو ہے جس میں کھل کر اردو افسانہ اور اس کے عروج و ارتقا، زوال اور اردو ادب میں نئی نئی

تحریکوں کے ذریعہ جو تجربات کیے گئے ہیں اس کے فوائد و نقصانات پر دل چسپ بحثیں موجود ہیں۔ جیلانی بانو نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ ''میں سمجھتی ہوں کہ ادھر دو تین برسوں میں ہمارے یہاں ایک تبدیلی آئی ہے جسے آپ ابہام کہہ رہے ہیں۔ تجریدیت یا مشکل پسندی وہ ہمارے افسانوں میں کم ہوگئی ہے اور پاکستان میں بھی کم ہوگئی ہے۔ اس کا اعتراف خود لکھنے والوں نے کیا ہے کہ وہ اپنے قاری سے بہت دور چلے گئے تھے اور کہانی پن ان کے افسانوں میں کھوگیا۔ انھوں نے خود اس چیز کو کم کردیا۔ جب بھی کوئی تجربہ عدم میں ہوتا ہے تو بہت خراب چیزیں عدم میں آتی ہیں اور اس میں بہت کم اچھی چیزیں ہوتی ہیں۔ ہمارے یہاں افسانے کی ایک نئی روایت جس کو آپ تجریدی افسانہ کہتے ہیں اس میں تجربہ ہوا۔ واقعی اس میں اچھے افسانے نہیں لکھے گئے اور قاری کی توجہ افسانے سے ہٹ گئی۔''

حسن نعیم اور وزیر آغا کے بھی انٹرویو کچھ اسی طرح کے ہیں اور نہایت کامیاب انٹرویو ہیں۔

وزیر آغا نے اپنے انٹرویو میں تنقید کے تعلق سے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ''تنقید اب بہت وسیع ہوگئی ہے اور فلسفہ بھی، طبعیات بھی اور انتھروپولوجی بھی۔ یہ تمام چیزیں مُنتج ہو رہی ہیں۔ میں تو تنقید میں کسی تخصیص کا قائل نہیں رہا۔ کہ یہ نفسیاتی تنقید ہے یہ مارکسی تنقید ہے۔''

تنقید کے تعلق سے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے حسن نعیم نے بڑی عمدہ کہی ہے کہ ''تنقید کا مسئلہ یہ ہے کہ ہندوستان میں بھی اور پاکستان میں بھی ناقدین کے اول تو بڑے بڑے اور سنہری نظریات ہیں، لیکن تان یہیں آکر ٹوٹتی ہے کہ ناقدین اس میں فٹ کرنا چاہتے ہیں اپنے گروہ یا اپنے حلقے کے کسی شاعر کو، چنانچہ ایسی تنقید وکالت بن کر رہ جاتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ دونوں ملکوں میں نظم و غزل کی تنقید گروہی مفادات سے اوپر نہیں اٹھی ہے۔''

میرے مطالعہ کے مطابق یہ 'کچھ انٹرویو' اردو کی جدید ادبی تاریخ ہے جس میں نیا افسانہ، جدید شاعری، اردو میں مختلف اوقات میں پیدا ہوئی ادبی تحریکوں اور بعض بڑے بڑے ادبی اسکالرس کی آپسی رنجشیں جنھوں نے اردو ادب کو نقصان بھی پہنچایا وغیرہ وغیرہ ڈھیر ساری باتوں کو بڑی ایمانداری اور غیر جانب داری کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اردو ادب سے دل چسپی رکھنے والے ہر قاری اور اردو ادب کے ہر طالب علم کو ضرور پڑھنی چاہیے تاکہ اس کو یہ معلوم ہوسکے کہ کن لوگوں نے اردو ادب کو کیا کچھ دیا ہے اور اردو ادب کی کن شخصیات نے اپنی انا کی خاطر اردو ادب اور اس کی ترقی میں کیا کیا رکاوٹیں پیدا کی ہیں۔

آخر میں ڈاکٹر اسداللہ کی ایک گفتگو مظفر حنفی سے بھی شامل ہے جس میں مظفر حنفی نے بڑی اچھی بات کہی ہے کہ ''میں نہیں سمجھتا کہ موجودہ ہندوستان کا بچہ جو پچھلی صدی کے بچوں سے کہیں زیادہ ذہین اور باشعور ہے محض کوہ قاف اور طلسماتی کہانیوں سے ہی دلچسپی رکھتا ہے۔ پچھلے دنوں راکیش شرما کی خلائی مہم میں بچوں نے جس گہری دلچسپی کا مظاہرہ کیا وہی میرے خیال کا منہ بولتا جواب ہے کہ آج بچے مصنوعی سیارے، روبوٹس، کمپیوٹر اور ٹین ڈبیوں کو وہی درجہ دیتے ہیں جو کل ماضی میں پریوں کو حاصل تھا آج کے بچے کا کوہ قاف خلا ہے اور پرستان انٹارکٹا ہے۔ اس کے علاوہ 'شیشہ ساعت میں سر دھنتی ہے ریت' کے عنوان سے ایک ایسی تحریر ہے جس سے مظفر حنفی کے سوانحی کوائف اور جدوجہد کے بارے میں بہت سی معلومات ملتی ہیں۔

شاعری

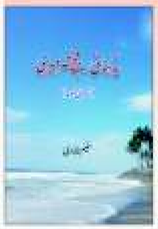

یہ کہانی ہے مختصر میری

نام مصنف (شاعر): سلیم ٹانڈوی

صفحات: 304، قیمت: 250 روپے، سنہ اشاعت: 2019

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، جامعہ نگر، اوکھلا، نئی دہلی

مبصر: ڈاکٹر مجیب اختر، اسسٹنٹ پروفیسر شعبۂ عربی، دہلی یونیورسٹی، دہلی

زیر تبصرہ کتاب 'یہ کہانی ہے مختصر میری' سلیم ٹانڈوی کا مجموعۂ کلام ہے، جس میں حمد، نعتیں، غزلیں، نظمیں، مرثیے، سہرے اور قطعات شامل ہیں۔ سلیم ٹانڈوی عصر حاضر کے معتبر شعرا میں شمار کیے جاتے ہیں، ان کی شاعری کا مرکز و محور جذبات کی تسکین اور دل کی ترجمانی ہے۔ سلیم ٹانڈوی کے شعری ذوق کو نکھارنے میں مکتب کی کرامت سے کہیں زیادہ فیضان نظر کو دخل ہے۔ بچپن اخذ، شباب اکتساب اور کہولت اظہار کا دور ہوتا ہے، سلیم ٹانڈوی نے بچپن میں جو اخذ کیا اور عہد شباب میں جو اکتساب کیا اب کہولت کے دور میں بھرپور اظہار کر رہے ہیں، ہر وہ شاعری زندہ رہنے والی ہے جس میں صداقت کی کرن، سوچ کی پاکیزگی اور احساس کی تپش ہو، کیونکہ یہ وہ جذبے ہیں جنھیں خزاں کی ویرانیاں بھی افسردہ نہیں کرسکتیں۔ سلیم ٹانڈوی کی شاعری میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں، جن سے شاعری حکمت کی منزلیں طے کرلیتی ہے۔ ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

میں وہ فنکار ہوں، افکار کو جدت کی بودے کر
فسردہ، ناروا، الفاظ کے گوہر بناتا ہوں

خدا جانے مری تقدیر میں لکھا ہوا کیا ہے
وہیں بجلی چمکتی ہے، جہاں میں گھر بناتا ہوں

سلیم اس دور میں کس کو کہوں میں ہمدم و رہبر
وہی گمراہ کرتا ہے، جسے رہبر بناتا ہوں

حمد باری تعالیٰ کے بعد حب رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے سرشار ہوکر سلیم ٹانڈوی نے نعتیں بھی کہی ہیں، ہر چند کہ ان کا نعتیہ سرمایہ کم ہے، لیکن جو بھی ہے وہ ان کے دل کی دھڑکنوں اور حسن تخیل کا ترجمان ہے اور ان کے لیے بہترین توشۂ آخرت ہے۔ مگر ان کے شعری ادب میں ایسے اشعار بکثرت پائے جاتے ہیں جنھیں رسول اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے حضور میں واردات قلب کا بے ساختہ نذرانہ اور اشکوں کا والہانہ خراج کہہ سکتے ہیں۔ سلیم ٹانڈوی کی نعتوں میں ایک سرفروشانہ ولولہ ہے جو عقیدت کے گرد گھومتا اور محبت کے آویزے تیار کرتا ہے۔ چند اشعار دیکھیے۔

خدا کے واسطے اتنا پیام کہہ دینا
تڑپ رہا ہے دل تشنہ کام، کہہ دینا

حضور قلب سے چوم کر روضہ کی جالی
مرے حضورؐ سے، میرا سلام کہہ دینا

حج کی توفیق میسر تجھے اللہ کرے
یہ بھی تو مانگ دعاؤں میں خدا سے پہلے

استطاعت تجھے اللہ نے بخشی ہے اگر
دیکھ لے روضۂ سرکار، قضا سے پہلے

انسان اپنے ماحول کی پیداوار ہوتا ہے، زندگی اور زمانہ نام ہے تغیرات و حوادث کا، انسان زمانے کا مرکب نہیں راکب ہے، وہ اپنی صلاحیتوں سے وقت کا رخ بدلتا ہے، حادثات سے ٹکراتا، تاریخ کو ترتیب دیتا اور خود زمانے سے سمجھوتہ نہیں کرتا، بلکہ زمانے کو اپنے مطابق ڈھالتا ہے، اگر شاعر اپنے دور کی تحریکوں، تقاضوں اور ضرورتوں کے ساتھ نہیں چلتا تو اس کی آواز میں نہ واقعیت آتی ہے اور نہ تاثیر۔ سلیم ٹانڈوی کی شاعری مقاصد کے اردگرد گھومتی ہے، وہ تفنن طبع کے عادی نہیں ہیں، بلکہ مقصدیت ان کا مطمح نظر ہے۔ قسام ازل نے سلیم ٹانڈوی کو زرخیز ذہن، موزوں طبیعت اور پرشکوہ

الفاظ کا وافر ذخیرہ عطا کیا ہے، خود ان کی زبان میں: ''بچپن کے گلیاروں سے گزر کر نوجوانی کی عمر میں قدم رکھا تو اردو شاعری اور ادب کی کتابوں سے رابطہ ہوا، ساتھ ہی مشاعروں میں بھی شرکت کرنی شروع کردی، اسی اثنا میں پتہ چلا کہ میں بھی شعر کہنے لگا ہوں، غالباً شاعری میرے خون اور فطرت میں شامل تھی، اس کے لیے اکتساب کی چنداں ضرورت محسوس نہ ہوئی، موزونیِ طبع کے سبب خیالات شعری اوزان کے سانچوں میں ڈھلتے چلے گئے''۔ (یہ کہانی ہے مختصر میری، ص 7)

انھوں نے جو غزلیں اور نظمیں کہی ہیں وہ ان کا ادبی مقام متعین کرنے کے لیے کافی ہیں، ان کے اشعار میں تخیل کی رفعت ادا کی طرفگی سے ہم آہنگ ہے۔ سلیم ٹانڈوی کی شاعری میں خیالات کا ایک تموج ہے کہ پھوٹتا، ابھرتا، پھلتا اور پھیلتا ہی چلا جاتا ہے، جگہ جگہ تغزل نغمگی سے ہم آغوش دکھائی دیتا ہے۔

شاعر اور ادیب کا وظیفہ ہی انسانی معاشرے کے گرد و پیش کی منظر کشی ہے، سماج میں جو بھی حالات وحوادث پیش آتے ہیں، سب سے پہلے ادبا وشعرا کی حساس طبیعت الفاظ وادا کے سہارے تسکین قلب کا سامان مہیا کرتی ہے، سلیم ٹانڈوی ہر چند کہ شہری زندگی کی چمک دمک سے دور رہے ہیں، لیکن ان کی شاعری میں ایسا آفاقی پیغام ہے جو دیہات، قصبہ اور شہر کی حد بندیوں سے ماورا ہے، ان کی شاعری میں انسانی معاشرے کے لیے بلیغ پیغام ہے۔

سلیم ٹانڈوی کی شاعری میں آج کے سلگتے ہوئے سیاسی وسماجی مسائل سمیت زندگی اور روز وشب کے متعدد موضوعات موجود ہیں، ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ان کی شاعری کلاسیکی شعری روایات اور عصری حسیات کا خوبصورت سنگم ہے، جس میں ہر ذوق وذہن کے لیے متاعِ قلب ونظر ہے۔ مجھے امید ہے کہ اہل علم ودانش اس شعری مجموعہ کو ہاتھوں ہاتھ لے کر سیرابی حاصل کریں گے۔

رسائل و جرائد

عالمی میراث

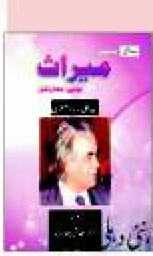

مدیر: ڈاکٹر سبھاش چندرا یہ (پریمی رومانی)

جلد: 1، شمارہ: 3

صفحات: 104، قیمت: 100 روپے، جون–اگست 2020

ناشر: D-1806، اساوری، ناندیڑ سٹی، پونے (مہاراشٹر)

مبصر: حقانی القاسمی، B-145/8، فورتھ فلور، ٹھوکر نمبر 8، شاہین باغ، نئی دہلی

اردو میں خادم اور خویدم کی تعداد بہت ہے مگر اس زبان پر اپنی جان نثار کرنے والے بہت کم ہیں۔ اردو سے سچی محبت کرنے والے انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں اور اس میں ان لوگوں کو ترجیحی طور پر شامل کیا جاسکتا ہے جن کا اردو سے روزگاری رشتہ نہیں ہے یا جو خسارے کی پرواہ کیے بغیر زبان وادب کی خدمت کے لیے خود کو وقف کیے ہوئے ہیں۔ اس ذیل میں ان رسائل کا بھی بطور خاص ذکر کیا جاسکتا ہے جنھیں نہ کہیں سے مالی معاونت ملتی ہے اور نہ ہی دیگر مالی وسائل اور ذرائع ان کے پاس ہیں۔ پھر بھی تواتر اور تسلسل کے ساتھ رسائل کی اشاعت میں لگے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر سبھاش چندرا یہ (پریمی رومانی) کے رسالے سہ ماہی 'عالمی میراث' پونے کو بھی اسی نظریے سے دیکھا جانا چاہیے۔ یہ رسالہ اردو ادب کی نہ صرف خدمت کر رہا ہے بلکہ نئے نئے موضوعات کی جستجو کرکے قارئین کے ذہن وفکر کی آبیاری بھی کر رہا ہے۔ اس رسالے کا امتیاز یہ ہے کہ اس نے مختصر مدت میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، برج پریمی، ندا فاضلی، گلشن کھنہ، پنڈت برج نرائن چکبست، حامدی کاشمیری، دیپک بدکی، قمر جلال آبادی، پریم وار برٹنی اور مظہر امام پر گوشے شائع کیے ہیں۔

یہ شمارہ بھی علی سردار جعفری جیسی عظیم ترین شخصیت کے حوالے سے ہے جن کی ادبی خدمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ خاص طور پر ترقی پسند ادب کے حوالے سے علی سردار جعفری کو کبھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ وہ ان شاعروں اور ادیبوں میں سے ہیں جنھوں نے ادبی دنیا کو بہت کچھ عطا کیا ہے۔ ان سے نظریاتی اختلافات ہوسکتے ہیں مگر ان کے ادبی قد وقامت پر کوئی سوال نہیں اٹھایا جاسکتا۔ انھیں پدم شری کے علاوہ ادب کا سب سے بڑا ایوارڈ گیان پیٹھ بھی ملا۔ علی سردار جعفری پر کئی کتابیں شائع ہوچکی ہیں اور رسائل کے گوشے بھی۔ عالمی میراث کا یہ گوشہ بھی اسی کا ایک تسلسل ہے۔ اس میں کئی اہم مضامین شامل ہیں جو علی سردار جعفری کی ادبی شخصیت کی کئی جہتوں پر محیط ہیں۔ ڈاکٹر برج پریمی (علی سردار جعفری اور قومی رواداری) پروفیسر محمد اسد اللہ وانی (علی سردار جعفری امن کا پیامبر)، ڈاکٹر الطاف انجم (مارکسیت نو مارکسیت اور سردار جعفری) احمد سہیل (علی سردار جعفری ایک ہمہ جہت شخصیت) پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (علی سردار جعفری یادوں کے نقوش)، دیپک کنول (علی سردار جعفری اور فلمی شاعری)، محمد الیاس (علی سردار جعفری کی سیاسی شاعری)، مشتاق فاروق (علی سردار جعفری معاصرین کی نظر میں)، سجاد احمد صوفی (علی سردار جعفری کا آہنگ) کی بیش قیمت تحریریں ہیں۔ ان تمام مضامین سے علی سردار جعفری کی تخلیقی شخصیت کے کئی اہم پہلو سامنے آتے ہیں خاص طور پر علی سردار جعفری نے رواداری اور امن کا جو پیغام دیا ہے وہ آج کے دور میں بہت اہم ہے۔ پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے ان کے رسالہ 'گفتگو' میں شامل ایک پیش لفظ کا حوالہ دیا ہے۔ آج کے تناظر میں اس کو پڑھا جائے تو اس کی معنویت اور روشن ہوجائے گی۔ جعفری صاحب نے لکھا تھا کہ ''ادبی رسائل اور تہذیبی ادارے عام طور پر خود کفیل نہیں ہوتے۔ آج کے حالات میں اردو کے کسی رسالے کا مالی اعتبار سے صحت مند ہونا ایک معجزہ ہوگا۔ اردو رسائل ایک پسماندہ ملک کی ایک مظلوم زبان کے چھوٹے چھوٹے رسالے ہیں۔ تعلیمی بساط کے سکڑ جانے کی وجہ سے اردو پڑھنے والوں کی تعداد روز بہ روز کم ہوتی جارہی ہے اور اردو رسائل کی مشکلات بڑھتی جارہی ہیں۔ اس میں کام کرنے والے ادب اور زبان کی خدمت کو ایک مشن بنا کر کام کر رہے ہیں۔ ان میں ترقی پسند، غیر ترقی پسند، پرانے اور نئے ہر طرح کے ادیب شامل ہیں۔'' اس اقتباس کی روشنی میں آج کے اردو رسائل کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں احساس ہوتا ہے کہ واقعی ادبی رسائل کے ساتھ کتنی دقتیں ہیں۔ اس کی اشاعت میں کتنی دشواریاں پیش آتی ہیں پھر بھی خوشی کی بات یہ ہے کہ ملک کے طول وعرض سے ادبی رسائل شائع ہو رہے ہیں۔ ان ادبی رسائل کے اشاعتی تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے محبانِ اردو کو بھی آگے بڑھنا چاہیے۔ سہ ماہی 'عالمی میراث' جیسے اور بھی بہت سارے رسالے نکلتے ہیں۔ ان سب کی بقا کی فکر ہمیں کرنی چاہیے کیونکہ یہی رسائل ہیں جو صرف قاری نہیں بلکہ قلم کار بھی پیدا کر رہے ہیں۔

سہ ماہی 'عالمی میراث' میں افسانے بھی ہیں اور کتابوں پر تبصرے بھی، اس کے علاوہ توصیف احمد ڈار کا ایک مضمون 'اردو میں ناول نگاری کی موجودہ صورت حال' کے عنوان سے ہے جس میں انھوں نے عبد الصمد، غضنفر، مشرف عالم ذوقی، شمس الرحمٰن فاروقی، پیغام آفاقی، شموئل احمد، حسین الحق، نور الحسنین، رحمٰن عباس، ترنم ریاض، صادقہ نواب سحر وغیرہ کے ناولوں پر عمدہ گفتگو کی ہے۔ ڈاکٹر پریمی رومانی اردو کے قلمکاروں اور قارئین کو زبان وادب سے جوڑنے کی جو کوشش کر رہے ہیں وہ قابل قدر ہے۔ امید ہے کہ یہ رسالہ اسی طرح شائع ہوتا رہے گا اور اپنے مشمولات اور مندرجات کی بنیاد پر الگ پہچان بنانے میں بھی کامیاب ہوگا! ■

خبر نامہ

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

وزیراعظم نریندر مودی نے اپنے بے مثال طرزِ حکومت سے ہندوستان کی تصویر بدل دی

اردو زبان سے وزیراعظم کو غیر معمولی محبت، گزشتہ چھ سال کے دوران قومی اردو کونسل کے بجٹ میں کئی گنا اضافہ ہوا: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

نئی دهلی: وزیراعظم نریندر مودی کے 70ویں یوم پیدائش کے موقعے پر قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے صدر دفتر میں ایک تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں خطاب کرتے ہوئے کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ میں اپنی اور کونسل کی جانب سے اور تمام ہندوستانیوں کی جانب سے ملک کے صاحب بصیرت اور ویژنری وزیراعظم شری نریندر مودی کو دل کی گہرائیوں سے مبارکباد پیش کرتا ہوں اور صحت و عافیت کے ساتھ ان کی درازیِ عمر کے لیے دعاگو ہوں۔ انھوں نے کہا کہ نریندر مودی نے ملک کی تعمیر و ترقی کے تئیں اپنے گہرے وِژن کو بروئے کار لاتے ہوئے گزشتہ چھ سال کے عرصے میں ہندوستان کی تصویر بدل دی ہے اور ملک کو ترقی و خوشحالی کی نئی اونچائیوں تک پہنچایا ہے، یہی وجہ ہے کہ آج پوری دنیا ہندوستان کو پرامید نگاہوں سے دیکھ رہی ہے اور عالمی سطح پر مودی جی کو مقبولیت حاصل ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ مودی جی نے 2014 میں حکومت میں آتے ہی 'سوچھتا ابھیان' شروع کیا تاکہ ملک کے عوام صفائی پر خاص توجہ دیں اور صحت مند رہیں، کیوں کہ ملک کی تعمیر و ترقی میں صحت مند افراد ہی کماحقہ حصہ لے سکتے ہیں۔ انھوں نے یوگا کو عالمی سطح پر متعارف کرایا اور دنیا بھر کو اس کے نفسیاتی و جسمانی فوائد سے روشناس کرایا جس کے نتیجے میں اقوام متحدہ کے ذریعے عالمی یومِ یوگا کا اعلان کیا گیا، جسے عالمی سطح پر ہر سال منایا جاتا ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ مودی جی نے اپنی حکومت کا بنیادی نصب العین 'سب کا ساتھ، سب کا وکاس' بنایا اور اس کو مدنظر رکھتے ہوئے بلا کسی تفریق کے ملک کے تمام طبقات کی ترقی، خوشحالی اور فلاح و بہبود کے لیے کام کیا ہے اور کر رہے ہیں۔ حکومت کی جتنی ترقیاتی اسکیمیں ہیں ان میں کسی قسم کا بھید بھاؤ نہیں کیا جاتا، ان سے ملک کا ہر طبقہ مستفید ہو رہا ہے جس میں مسلمان بھی شامل ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کے درمیان بھی مودی جی کو خاصی مقبولیت حاصل ہے بلکہ مسلم ملکوں میں بھی انھیں عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اور کئی عرب ملکوں نے انھیں اپنے یہاں کا اعلیٰ شہری ایوارڈ بھی پیش کیا ہے۔ مودی جی نے مسلم خواتین کو غیر اسلامی طریقے سے دی جانے والی تین طلاق کی مصیبت سے نجات دلائی، اس کے علاوہ دیگر کئی اہم اور پیچیدہ معاملات کو بحسن و خوبی سلجھا کر ملک میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی کو مضبوطی بخشی ہے۔

ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ اردو زبان سے بھی مودی جی کو محبت ہے اور وہ اس زبان کے رسم الخط اور صوتیات سے خاص طور پر متاثر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دورِ حکومت میں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی کارکردگی میں غیر معمولی تیزی، استحکام اور بہتری آئی ہے۔ 2008 سے 2014 کے دوران کونسل کو 193 کروڑ روپے کا بجٹ ملا تھا جبکہ 2015 سے 2020 کے دوران کونسل کے لیے 402.56 کروڑ روپے کا بجٹ مختص کیا گیا، جس کی وجہ سے کونسل نے نہ صرف پہلے سے جاری اپنی اسکیموں کو کامیابی کے ساتھ چلایا بلکہ متعدد نئی اسکیموں کی شروعات بھی کی اور اردو کے فروغ کے لیے کئی نئے پروجیکٹس پر کام ہوا ہے۔ انھوں نے کہا کہ وزیراعظم نے اردو کونسل اور اردو زبان کے فروغ میں غیر معمولی دلچسپی کا مظاہرہ کیا اور ہم نے جب بھی کونسل کے پروگراموں میں انھیں مدعو کیا تو انھوں نے خصوصی توجہ فرمائی اور اپنی غیر معمولی مصروفیات کی بنا پر پروگرام میں شرکت نہ کرسکنے کی وجہ سے اپنا پیغام ضرور بھجوایا۔ شیخ عقیل نے نئی تعلیمی پالیسی میں اردو زبان کے فروغ کے امکانات پر گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ اس پالیسی میں شروع سے پانچویں کلاس تک لازماً اور آٹھویں کلاس تک اختیاری طور پر مادری زبان میں تعلیم دینے کی بات کی گئی ہے، اس سے جہاں ملک کی دیگر علاقائی و مادری زبانوں کے فروغ کی راہیں ہموار ہوں گی وہیں اردو زبان کے فروغ کی بھی نئی راہ کھلے گی اور جن شہریوں کی مادری زبان اردو ہے، وہ اپنے بچوں کو ابتدائی تعلیم اردو زبان میں دلوا سکیں گے جس کا انتظام باضابطہ حکومت کی جانب سے کیا جائے گا۔ اسی طرح اس پالیسی میں خصوصیت کے ساتھ ان زبانوں کے فروغ کے لیے مرکزی حکومت کی سرپرستی میں اداروں کے قیام کی بات کی گئی ہے، جو کسی ریاست کی پہلی زبان کے طور پر مستعمل نہیں ہیں۔ اس سے بھی یقیناً کئی زبانوں کو فائدہ ہوگا جن میں اردو زبان بھی شامل ہے۔ نئی تعلیمی پالیسی کے نفاذ کے بعد طلبا کو اعلیٰ تعلیمی نظام میں مضامین کے انتخاب کی بھی آزادی ہوگی، چنانچہ اردو والے اپنی دلچسپی کے کسی بھی سبجیکٹ کو پڑھ سکتے ہیں، جبکہ دوسرے مضمون والے طلبا اگر اردو پڑھنا چاہیں تو ان کے لیے اس کی بھرپور گنجائش ہوگی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 17 ستمبر 2020

'عصرِ حاضر میں گاندھی کی معنویت' کے موضوع پر آن لائن لیکچر

نئی دهلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیراہتمام مہاتما گاندھی کے یوم پیدائش کی مناسبت سے 'عصرِ حاضر میں گاندھی کی معنویت' کے موضوع پر جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر بسوجیت داس کے آن لائن خصوصی لیکچر کا انعقاد کیا گیا۔ جس کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے کی۔ انھوں نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ گاندھی ازم سمپل لیونگ اور گریٹ تھنکنگ کا نام ہے۔ اس صدی میں جبکہ اخلاق و

سماجی سطح پر بے شمار خرابیاں پیدا ہوگئی ہیں ایسے میں گاندھی جی کے نظریات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ غربت کے خاتمے، مذہبی انتہاپسندی، اخلاقی بحران اور صارفیت کے عام مزاج سے نمٹنے کے لیے بھی گاندھی جی کے فکر وفلسفہ پر عمل کرنا ضروری ہے۔ انھوں نے کہا کہ خدمتِ خلق اور سماجی کاموں کو انجام دینے کے لیے بھی ہمیں گاندھی جی کے پیغامات وتعلیمات سے رہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی کے افکار کو پوری دنیا میں پہنچانے کی ضرورت ہے۔

اس سے قبل تعارفی خطاب کرتے ہوئے کونسل کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام مہمانوں کا استقبال کیا اور موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ مہاتما گاندھی کے نظریات میں سب سے زیادہ اہمیت اہنسا یعنی عدم تشدد کے نظریے کو حاصل ہے، جسے انھوں نے باضابطہ ایک طرز حیات قرار دیا اور پوری زندگی اس پر مضبوطی سے عمل پیرا رہے۔ انھوں نے کہا کہ موجودہ دور میں ہم ایسی سچویشن میں پہنچ چکے ہیں کہ ہر کسی کو دوسرے سے خطرہ ہے اور ایسا لگتا ہے کہ یہ دنیا صرف طاقتوروں کے رہنے کی جگہ ہے۔ اس ماحول میں گاندھی جی کے افکار وفلسفے کی معنویت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ سیاسی وسماجی افراتفری اور عالمی بحران کے اس دور میں ہمیں نہ صرف گاندھیائی فکر وفلسفہ کو سمجھنے بلکہ اسے برتنے اور عملی زندگی میں شامل کرنے کی بھی ضرورت ہے۔

انھوں نے کہا کہ گاندھی جی نے عملی زندگی میں صفائی پر بھی خاص زور دیا اور تاحیات اس کی تبلیغ کرتے رہے۔ مودی حکومت نے ملک کی تعمیر وترقی کے تعلق سے جہاں دیگر اہم اقدامات کیے ہیں وہیں 'سوچھتا ابھیان' کی شروعات کی، جس کے تحت ملک بھر کے شہریوں کو صفائی کے سلسلے میں بیدار کیا گیا اور گاندھی جی کے پیغام پر عمل کرنے کی تلقین کی گئی۔ وزیراعظم نے خود اس مہم کی شروعات کی اور پورے ملک میں اس تحریک کو پھیلایا گیا جس کے خاطر خواہ نتائج سامنے آئے ہیں۔ اس کے علاوہ مودی حکومت نے اپنے دیگر کئی اہم منصوبوں کی شروعات گاندھی جی کے نظریے اور فلسفے سے متاثر ہوکر کی ہے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ زبان کے تعلق سے بھی گاندھی جی کا ایک واضح نظریہ تھا اور انھوں نے مادری زبان کے تحفظ وفروغ پر خاص توجہ دی۔ مادری زبان کے تعلق سے گاندھی جی بہت حساس تھے اور کسی بھی حال میں نہ تو وہ اپنی مادری زبان سے دست بردار ہونا چاہتے تھے اور نہ ہی دوسروں کو اس حق سے محروم کیے جانے کے قائل تھے۔ مودی حکومت نے مادری زبان کے تعلق سے گاندھی جی کے نظریے کو خاص اہمیت دیتے ہوئے نئی تعلیمی پالیسی مرتب کی ہے۔ اس کے نافذ ہونے کے بعد بچوں کو پانچویں کلاس تک لازمی اور آٹھویں کلاس تک اختیاری طور پر مادری زبان میں تعلیم دینی ہوگی۔

پروفیسر بسوجیت نے اپنے لیکچر میں گاندھی جی کی زندگی اور فلسفہ کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور آج کے عہد میں گاندھی کے افکار کی معنویت پر بصیرت افروز گفتگو کی۔ انھوں نے کہا کہ گاندھی جی مذہب کو ایک درخت مانتے تھے اور ان کا کہنا تھا کہ دنیا کے تمام مذاہب اسی درخت کی شاخیں ہیں، لہٰذا مذہب انسان کا انفرادی معاملہ ہے اسے سیاسی اور قومی معاملات میں خلط ملط نہیں کرنا چاہیے۔ اسی وجہ سے گاندھی جی کا نظریہ تھا کہ جدید ہندوستان کی بنیاد کسی مذہب پر نہیں ہونی چاہیے بلکہ عوامی فلاح وبہبود پر ہونی چاہیے۔ پروفیسر بسوجیت نے کہا کہ گاندھی جی کے افکار میں مرحلہ وار ترقی ہوئی ہے اور انھیں اسی اعتبار سے دیکھنا اور پڑھنا چاہیے۔ انھوں نے کہا کہ زبان کے معاملے میں بھی ان کا نظریہ واضح تھا اور وہ زبان کو تہذیب وثقافت اور خیالات وافکار کے اظہار کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ وہ جدید تقاضوں اور ضروریات سے آگاہ تھے اور اسی کے مطابق لکھتے اور بولتے تھے۔ گاندھی جی نے سودیشی کو فروغ دینے اور قومی معیشت کی ترقی کے لیے بھی عملی اقدامات کیے جن میں کھادی موومنٹ کو غیر معمولی اہمیت حاصل تھی۔ پروفیسر موصوف نے کہا کہ گاندھی جی کا تصور قومیت فرد کی بیرونی آزادی سے زیادہ داخلی آزادی پر زور دیتا ہے، ان کی زندگی اور افکار ونظریات کو آج کے پس منظر میں سمجھنے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 30 ستمبر 2020

جدید ہندوستان کی تعمیر وتشکیل میں لال بہادر شاستری کا اہم کردار

نئی دهلی: لال بہادر شاستری اُن عظیم ہندوستانیوں میں سے ایک تھے جنھوں نے ہماری سماجی زندگی پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ ہماری عوامی زندگی میں شری لال بہادر شاستری کی شراکت انفرادیت کی حامل تھی کہ وہ عام ہندوستانیوں کی زندگی کے قریب تر تھے۔ ان کی بے مثال سادگی وانکساری کی وجہ سے ہندوستانی عوام انھیں اپنے ہی جیسا سمجھتے تھے۔ یہ باتیں قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد نے سابق وزیراعظم لال بہادر شاستری کو ان کے یوم پیدائش پر خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہیں۔ انھوں نے کہا کہ لال بہادر شاستری کا یہ ماننا تھا کہ ایک مضبوط اور طاقتور قوم کی تشکیل کے لیے خود کفیل ہونا لازمی ہے اور اسی وجہ سے انھوں نے جدید ہندوستانی معیشت کے استحکام پر خاص توجہ دی۔ شاستری جی نے اہم اقتصادی پالیسیاں تیار کیں جن سے ہندوستان کے معاشی حالات کو بہتر بنانے میں خاصی مدد ملی۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ لال بہادر شاستری کا نعرہ "جے جوان، جے کسان" آج بھی ملک کے طول وعرض میں مقبول ہے، جس کی بنیادی روح اپنے وطن اور قوم کی تعمیر وترقی کے جذبے سے عبارت ہے۔ انھوں نے ایک طرف جہاں ہندوستانی فوج کی حوصلہ افزائی کی اور اس کے نتیجے میں 1965 کی جنگ میں ہندوستان نے کامیابی حاصل کی، وہیں ملک کو غذائی اجناس فراہم کرنے والے کسانوں کو بھی خراج تحسین پیش کیا اور ان کی ہمت بڑھائی، چنانچہ دیش بھر میں سبز انقلاب برپا ہوگیا اور غذائی اجناس کی پیداوار میں غیر معمولی

اضافہ ہوا۔ شیخ عقیل نے کہا کہ مودی جی کی حکومت بھی انہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے دونوں محاذوں پر قابلِ قدر کام کر رہی ہے اور جہاں اِس حکومت میں ہندوستانی فوج کے وقار میں اضافہ ہوا ہے، وہیں کسانوں کی ترقی وخوشحالی کے لیے بھی اس حکومت نے اہم اقدامات کیے ہیں۔ حال ہی میں حکومت نے زرعی اصلاحات سے متعلق جو بل منظور کیے ہیں ان سے کسانوں کو غیر معمولی فائدہ ہوگا اور نہ صرف زرعی شعبے میں ایک انقلاب آئے گا، بلکہ اس سے کروڑوں کسانوں کو بااختیار بھی بنایا جاسکے گا۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 1 اکتوبر 2020

اردو ادب کی علاقائی تاریخ کی ترتیب کے سلسلے میں آن لائن میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام اردو ادب کی علاقائی تاریخ کی ترتیب سے متعلق پروجیکٹ کی آن لائن میٹنگ منعقد ہوئی، جس کی صدارت پروفیسر عتیق اللہ نے کی۔ میٹنگ میں افتتاحی خطاب کرتے ہوئے کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہماری خواہش ہے کہ اردو کے دامن کو وسیع سے وسیع تر کیا جائے۔ اسی مقصد سے ہم نے یہ طے کیا ہے کہ اردو ادب کی علاقائی تاریخ مرتب کی جائے جس میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں فروغ پانے والے اردو ادب کا جائزہ لینے کے ساتھ علاقائی زبانوں کے اردو تراجم کا بھی مبسوط ومفصل تجزیہ کیا جائے۔ انھوں نے کہا کہ مجھے خوشی ہے کہ اردو کے کئی ایسے دانشور، محقق اور پروفیسر حضرات اس میٹنگ میں موجود ہیں جو اردو کے علاوہ دیگر زبانوں سے بھی اچھی طرح واقف ہیں اور وہ ان زبانوں کے معیاری ادب کو اردو میں منتقل کرنے کی عمدہ صلاحیت بھی رکھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ ان حضرات کے ذریعے اردو ادب کی ایک نہایت جامع اور مستند علاقائی تاریخ مرتب ہوکر سامنے آئے گی جس سے اردو دنیا خاطر خواہ فائدہ اٹھا سکے گی۔ پروفیسر عتیق اللہ نے اس پروجیکٹ سے متعلق معلومات فراہم کرتے ہوئے اس تعلق سے موصول ہونے والے مسودوں کا جائزہ پیش کیا اور کہا کہ ہمیں ایک رہنما خاکہ بنانا چاہیے اور اس کے مطابق کام کا تعین کرنا چاہیے، تاکہ ایک معیاری تحقیقی کام کیا جاسکے۔ انھوں نے کہا کہ ہمیں جغرافیائی وزمانی حدود بھی طے کرنی ہوں گی کیونکہ ملک کی ریاستوں کے خط وخال بدلتے رہتے ہیں۔ اسی طرح بعض علاقوں میں ایک ہی زبان استعمال نہیں ہوتی، ایک سے زیادہ زبانیں رائج ہوتی ہیں۔ ان زبانوں اور بولیوں سے واقفیت بھی ضروری ہے۔ اسی طرح اردو زبان سے ان زبانوں کے تراجم یا ان زبانوں سے اردو تراجم کو بھی پیش نظر رکھنا بھی ضروری ہوگا۔ اس موقعے پر مدھیہ پردیش، بہار، جھارکھنڈ، کرناٹک، آندھرا پردیش، تلنگانہ، پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش، جموں وکشمیر، یوپی، مہاراشٹر اور راجستھان وغیرہ میں اردو ادب کی تاریخ سے متعلق پروجیکٹس زیر بحث آئے اور شرکا نے متعلقہ موضوعات سے متعلق اہم امور پر تبادلۂ خیال کرتے ہوئے اس کی تکمیل کے سلسلے میں ضروری سوالات کیے جن کے جوابات کمیٹی کے چیئرمین پروفیسر عتیق اللہ اور کونسل کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی نے دیے۔ میٹنگ کے آخر میں ڈاکٹر عقیل احمد نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔

اس میٹنگ میں پروفیسر خالد محمود، پروفیسر ناشر نقوی، ڈاکٹر مسیح الزماں انصاری، ابوذر ہاشمی، پروفیسر فیروز احمد، ڈاکٹر نسیم الدین فریس، پروفیسر منظر حسین، ڈاکٹر شرف النہار، ڈاکٹر الطاف انجم اور کونسل سے ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محمد شہاب الدین اور محمد افضل خان شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 16 ستمبر 2020

قومی اردو کونسل کے لا پینل کی آن لائن میٹنگ

نئی دھلی: (پریس ریلیز) قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے لا پینل کی آن لائن میٹنگ کا انعقاد عمل میں آیا جس کی صدارت پینل کی چیئر پرسن پروفیسر نزہت پروین خان نے کی۔ اس موقعے پر شرکا کا استقبال کرتے ہوئے کونسل کے ڈائریکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے کہا کہ ہندوستان کے قانونی نظام میں اردو زبان کو مرکزیت حاصل رہی ہے اور اس میں سیکڑوں اردو الفاظ واصطلاحات استعمال کی جاتی ہیں۔ اسی وجہ سے قومی اردو کونسل نے یہ طے کیا ہے کہ عدالتی وقانونی شعبے سے وابستہ افراد اور طلبہ کو اس حد تک اردو سکھانے کا اہتمام کیا جائے کہ وہ ان الفاظ کے معنی بخوبی سمجھ سکیں جو عدالتی کارروائیوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ اردو والوں کے لیے بھی ملکی دستور کے نکات اور عدالتی نظام میں مستعمل اصطلاحات کی جانکاری ضروری ہے اور اسی ضرورت کی تکمیل کے لیے کونسل کے لا پینل کے ذریعے مسلسل غور وخوض کے بعد قانون سے متعلق مختلف پہلوؤں پر کتابیں شائع کی جاتی ہیں۔ ہمارا عزم ہے کہ اردو والوں کو ہندوستانی قانون میں ہونے والی تمام تر ترمیمات اور نئے بننے والے قوانین سے باخبر رکھیں تاکہ وہ اپنے حقوق وفرائض کی کامل آگاہی کے ساتھ اپنی شہری ذمے داریاں ادا کرسکیں۔

اس میٹنگ کے دوران پچھلی میٹنگ کی تجاویز کی منظوری کے ساتھ مختلف امور پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔ عدالتی و پولیس سسٹم میں استعمال ہونے والے اردو الفاظ کے معانی کی تفہیم کے لیے لاء کالجز اور عدلیہ سے وابستہ افراد اور طلبہ کے لیے ریفریشر کورس کے منصوبے کو جلد از جلد عملی جامہ پہنانے پر زور دیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اس سلسلے میں تمام لاء کالجز کے ساتھ چیف جسٹس آف انڈیا اور تمام ریاستوں کے ہائی کورٹس کے چیف جسٹس اور ڈائریکٹر نیشنل جیوڈیشل اکیڈمی کو بھی خط بھیجا جائے اور ان کے جواب کے مطابق اگلا قدم اٹھایا جائے۔ اس موقعے پر خواجہ عبدالمنتقم نے مدارس اور اسکول کے طلبہ کو بنیادی قانونی اصطلاحات سے آگاہ کرنے، نیز ہندوستان میں صارفیت کے قانون اور موجودہ حکومت کے ذریعے صارفین کے لیے بنائے گئے قانون کی تشریح وتوضیح پر مشتمل کتابوں کی ترتیب کا خاکہ پیش کیا، اس کے علاوہ دیگر متعدد پروجیکٹس بھی زیرِ بحث آئے اور یہ طے کیا گیا کہ ان کی اہمیت وافادیت کے مطابق کونسل کی جانب سے ان کی اشاعت کا اہتمام کیا جائے گا۔ ساتھ ہی قانون سے متعلق پہلے سے زیر ترتیب مسودوں کی جلد از جلد تکمیل پر بھی زور دیا گیا۔

میٹنگ میں جن حضرات نے شرکت کی ان میں ڈاکٹر شکیل معین، ڈاکٹر ظفر محفوظ نعمانی، جناب مصطفےٰ خان ایڈووکیٹ، جناب ایس اقبال احمد، جناب محمد شہنشاہ خان، محترمہ ڈاکٹر شمع کوثر یزدانی (اسسٹنٹ ڈائریکٹر اکیڈمک)، ڈاکٹر فیروز عالم (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر) اور محترمہ ذیشان فاطمہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 29 ستمبر 2020

اردو کتابوں کی ترویج واشاعت کے امکانات وچیلنجز پر آن لائن میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے زیر اہتمام کورونا کے دور میں اردو کتابوں کی اشاعت کے موضوع پر آن لائن میٹنگ کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کونسل کے ڈائریکٹر شیخ عقیل احمد نے کی۔ ڈاکٹر عقیل نے اپنے خطاب میں تمام شرکائے میٹنگ کا استقبال کرتے ہوئے وبائی دور میں اردو کتابوں کی اشاعت اور ان کی خرید وفروخت

کے نئے طریقوں کو اختیار کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ کورونا اور لاک ڈاؤن کی وجہ سے بہت سی صنعتیں متاثر ہوئی ہیں، جن میں کتابوں کی صنعت بھی شامل ہے، مگر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اگر ایک راستہ بند ہوتا ہے تو دوسرے کئی کھل جاتے ہیں، چنانچہ اگر کورونا کی وجہ سے انسانوں کی باہمی ملاقات اور سمینار و میٹنگ وغیرہ کا انعقاد ممکن نہیں رہا، تو اس کے متبادل کے طور پر ہمارے سامنے آن لائن ویبینار اور میٹنگ کی صورتیں آگئیں، خود کونسل کی جانب سے اب تک بہت ساری آن لائن میٹنگیں، عالمی ویبینار اور مذاکرے کیے جا چکے ہیں، اسی طرح اگر کورونا کی وجہ سے روایتی انداز میں کتابوں کی فروخت اور ترسیل میں دشواریوں کا سامنا ہے تو ہم اس کے لیے جدید ٹکنالوجی کا سہارا لیتے ہوئے آن لائن پلیٹ فارمز، سوشل میڈیا اور ای کامرس کمپنیوں جیسے امیزون، فلپ کارٹ وغیرہ کے ذریعے اپنی کتابوں کی تشہیر اور فروخت کر سکتے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اردو والوں کو کسی بھی حال میں ہار نہیں ماننا چاہیے، ہمیں بحران کو موقعے میں بدلنا چاہیے اور اردو کتابوں کی نشر و اشاعت و فروخت کے لیے نئے پلیٹ فارم سے جڑنا چاہیے۔ اگر آج کے دور میں اردو زبان کو فروغ دینا ہے اور اردو کتابیں عوام تک پہنچانی ہیں تو ہمیں ٹکنالوجی فرینڈلی بننا ہوگا اور سائنس و ٹکنالوجی کے ذریعے دستیاب جدید ذرائع کا استعمال کرنا ہوگا۔ انھوں نے کہا کہ لاک ڈاؤن کے دنوں میں گرچہ اسکول، کالجز اور تعلیمی ادارے بند رہے مگر اس دوران بھی لوگوں نے بہت مطالعہ کیا ہے اور کتابوں کے بہت سے ایسے ناشرین ہیں جنھوں نے بڑی مقدار میں آن لائن یا ای بکس کی شکل میں کتابیں فروخت کی ہیں، ہمیں اس میڈیم کو سنجیدگی سے لینا چاہیے اور اسے استعمال کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر عقیل نے اردو ناشرین سے یہ بھی کہا کہ اردو کونسل اس مہم میں آپ کے ساتھ ہے۔ اردو کتابوں کی تشہیر و اشاعت اور قارئین تک پہنچانے کے لیے آپ کا ہر ممکن تعاون کیا جائے گا، آپ اپنی کتابوں کے ساتھ کونسل کی کتابوں کی بھی تشہیر کیجیے۔ انھوں نے بچوں کے ادب اور بچوں کے لیے زیادہ سے زیادہ کتابوں کی اشاعت پر زور دیتے ہوئے کہا کہ بچوں کے اندر اردو زبان سے دلچسپی پیدا کرنا ضروری ہے اس لیے کہ اگر ہم نے آج ایسا نہیں کیا تو مستقبل میں اردو ادب کی اہم اور کلاسیکل کتابیں پڑھنے والا کوئی نہیں ملے گا اور اس طرح ہماری زبان غیر معمولی خسارے سے دوچار ہو جائے گی۔ آپ اس سلسلے میں خود بھی کوشش کیجیے، کونسل کو بھی اپنے مشورے اور تجاویز دیجیے، کونسل کی جانب سے بچوں کے لیے ہر ماہ شائع ہونے والے رسالے 'بچوں کی دنیا' کے علاوہ بچوں کے ادب پر بہت سی کتابیں شائع کی گئی ہیں، ہم آپ کے مشوروں اور تجاویز پر عمل کرتے ہوئے اس سلسلے کو مزید بہتر بنانے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ حالات بہتر ہونے کے بعد ہم جلد ہی اردو ناشرین کے مشورے سے قومی کتاب میلے کا انعقاد کریں گے۔ اس موقعے پر دہلی، ممبئی، مالیگاؤں، حیدرآباد، کشمیر، علی گڑھ، اعظم گڑھ اور دیگر مقامات کے دو درجن سے زائد اردو پبلشرز شریک رہے۔ انھوں نے کئی اہم تجاویز بھی پیش کیں، جن کا خیر مقدم کیا گیا اور ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ انھیں عملی جامہ پہنانے کی کوشش کی جائے گی۔ انھوں نے ناشرین سے اپنی تجاویز تحریری شکل میں ارسال کرنے کی بھی اپیل کی تاکہ ان پر اچھی طرح غور کرکے عملدرآمد کیا جا سکے۔ اخیر میں کونسل کی اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی نے تمام شرکا کا شکریہ ادا کیا۔ اس میٹنگ میں کونسل کی جانب سے جناب شاہنواز محمد خرم (ریسرچ آفیسر) جناب اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، ذاکر نقوی، بجے سنگھ، گلشن آنند اور محمد افضل خان شریک رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 14 ستمبر 2020

کیلی گرافی و گرافک ڈیزائننگ سینٹرز کے انچارج اور اساتذہ کی آن لائن میٹنگ

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی جانب سے چلنے والے کیلی گرافی و گرافک ڈیزائننگ سینٹرز کے انچارج و اساتذہ کی آن لائن میٹنگ منعقد ہوئی، جس کی صدارت کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر شاہد اختر نے کی۔ انھوں نے اس موقعے پر اپنے خطاب میں فن خطاطی کی اہمیت بیان کرتے ہوئے کہا کہ یہ نہایت خوب صورت فن ہے اور آج کے دور میں بھی اس فن کے ماہرین کے لیے ترقی کے بے شمار امکانات ہیں۔ اس فن میں مہارت حاصل کرنے کے بعد اچھی سے اچھی ملازمت مل سکتی ہے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرکے انسان شہرت و مقبولیت کی بلندیوں تک پہنچ سکتا ہے۔ انھوں نے سینٹر انچارج و اساتذہ سے اپیل کی کہ آپ اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرتے ہوئے طلبہ کو اس فن میں تربیت دیں اور کورس مکمل ہونے کے بعد ملازمت کی فراہمی میں بھی ان کا تعاون کریں۔ انھوں نے کہا کہ گرافک ڈیزائننگ کی بھی آج کل بہت زیادہ مانگ ہے اور مختلف کمپنیوں میں اس شعبے کے ماہرین کی سخت ضرورت ہے۔ انھوں نے سینٹر انچارجز سے کہا کہ آپ اپنے طلبا و طالبات کی خطاطی و ڈیزائننگ کے نمونے کونسل کو بھیجیں جنھیں کونسل کی آفیشیل ویب سائٹ پر اپلوڈ کیا جائے گا اور اس طرح ان کی صلاحیتوں کا دور تک اعتراف کیا جائے گا، انھوں نے آیندہ سال سے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے والے سینٹرز کو کونسل کی جانب سے انعام سے نوازنے کا بھی اعلان کیا۔ ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے تمام سینٹر انچارج اور اساتذہ کا میٹنگ میں استقبال کرتے ہوئے کہا کہ خطاطی ایک خوبصورت کلاسیکی فن ہے جس کے اندر مخصوص قسم کی تخلیقیت اور کشش پائی جاتی ہے۔ ہمارے ملک کو دیگر مختلف علوم و فنون کے ساتھ اس فن میں بھی خاص شناخت حاصل رہی ہے اور اسی وجہ سے ہمارے ملک میں اس کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ قومی اردو کونسل اس خوب صورت ثقافتی ورثے کے تحفظ اور فروغ کے لیے پورے ملک میں کیلی گرافی اور گرافک ڈیزائننگ کے سینٹرز چلا رہی ہے، جہاں اس فن میں دوسالہ ڈپلوما کا کورس کروایا جاتا ہے اور اب تک ان سینٹرز سے سیکڑوں ایسے ہونہار طلبا و طالبات نکلے ہیں، جو کیلی گرافی و گرافک ڈیزائننگ میں مہارت کے حامل ہیں اور اس وقت ملک و بیرون ملک میں اپنے فن کا لوہا منوا رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ کونسل کا اصل مقصد اردو زبان کا فروغ ہے اس لیے آپ حضرات سے گذارش ہے کہ اپنے طلباء کو خطاطی و گرافک ڈیزائننگ سکھانے کے ساتھ انھیں اردو زبان کی بھی تعلیم دیں، ساتھ ہی اپنے آس پاس بھی اردو زبان کو فروغ دینے کے لیے سرگرم کردار ادا کریں۔ ساتھ ہی انھوں نے معاشرے میں تعلیم و تربیت کا عام ماحول بنانے پر بھی زور دیا، انھوں نے کہا کہ ہمیں نئی نسل کو اس طرح تربیت دینی ہوگی کہ وہ مستقبل میں نہ صرف ذمے دار اور محب وطن شہری بنیں بلکہ وہ ملک کی تعمیر و ترقی میں بھی ضروری کردار ادا کریں۔ اس موقعے پر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے ملک کی مختلف ریاستوں کے سینٹر انچارج اور اساتذہ سے تبادلۂ خیال بھی کیا، ان کی کارکردگی کا جائزہ لے کر انھیں درپیش مشکلات کو دور کرنے کی یقین دہانی کروائی، ساتھ ہی تمام ذمے داروں سے اپیل کی کہ طلبا سے مسلسل مربوط رہ کر ان کی رہنمائی کریں۔ اس کے لیے جدید ٹکنالوجی، انٹرنیٹ اور سوشل میڈیا سے بخوبی مدد لے سکتے ہیں۔ میٹنگ کے آخر میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر (اکیڈمک) محترمہ شمع کوثر یزدانی نے شکریے کی رسم ادا کی۔ اس موقعے پر کونسل کی جانب سے جناب انتخاب احمد (ریسرچ آفیسر)، جناب اجمل سعید (اسسٹنٹ ایجوکیشن آفیسر)، محمد قاسم اور محمد افضل خان موجود رہے۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 15 ستمبر 2020

قومی اردو کونسل کے مالی تعاون سے

آغا حشر کاشمیری کی ادبی خدمات

مراد آباد: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان حکومت ہند اور انجم ویلفیئر سوسائٹی مرادآباد کے اشتراک سے ایک روزہ سمینار بعنوان آغا حشر کاشمیری کی ادبی خدمات

منعقد کیا گیا۔ پرائمری اسکول پنڈت نگلہ میں منعقد سمینار کی صدارت اترپردیش اردو اکادمی کے سابق رکن و سینئر صحافی سید محمد ہاشم نے کی جبکہ مہمان خصوصی کے طور پر ممتاز شاعر ظہیر احمد راہی اور مہمان ذی وقار کی حیثیت سے ایڈووکیٹ اسلم حسین، علاقائی کارپوریٹر تبسم شاکر اور سماجی خدمت گار الماس انجم نے شرکت کی۔ سمینار میں مقالہ پیش کرتے ہوئے ڈاکٹر شاکر حسین ایچ او ڈی ایم ایم ڈگری کالج نے آغا حشر کاشمیری کی ڈراما نگاری کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ انھیں ڈراما نگاری سے ذہنی لگاؤ اور ذاتی دلچسپی تھی۔ ان کا پہلا ڈراما آفتاب محبت کے نام سے منظر عام پر آیا جس کی ادبی حلقوں میں پذیرائی کی گئی۔ ترنم پروین نے کہا کہ موصوف کو مشرقی تہذیب سے بے پناہ محبت اور مغربی تہذیب سے سخت نفرت تھی۔ ملک سے محبت اور آزادی کا جذبہ ان میں کوٹ کوٹ کر بھرا تھا۔ مفتی باقر علی، مولانا محمد ہارون، ڈاکٹر علی جان نے مشترکہ طور پر کہا کہ آغا حشر کاشمیری کی ادبی خدمات کو ہرگز فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ سمینار کے آخر میں صدر سمینار سید محمد ہاشم نے پروگرام کو کامیابی سے ہمکنار کرنے والوں کو اپنی جانب سے مبارکباد پیش کرتے ہوئے امید ظاہر کی کہ اس طرح کے معیاری اور ادبی پروگرام آئندہ بھی اسی انداز میں منعقد کیے جاتے رہیں گے۔ سمینار میں اسلم حسین ایڈووکیٹ، شاکر علی، محمد ناظم، محمد اسلام، اروند کمار، سبھاش چند، محمد اکرم، محمد شمیر، شیبا پروین، شبنم بیگم، راحت پروین اور عظمیٰ خاں وغیرہ ذی علم اور ادب نواز شخصیات نے حصہ لیا۔ اس موقعے پر تنظیم کی جانب سے تمام مہمانان کو یادگاری مجلّہ پیش کرتے ہوئے اعزاز بھی بخشا گیا۔ پروگرام کے کنوینر کی جانب سے شکریہ کے کلمات ادا کیے گئے۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 15 اکتوبر 2020

بیسویں صدی میں ہندوستان کی اردو شاعرات

وس نگر: پٹیل امتھی با موہن لال چیریٹیبل ٹرسٹ وس نگر گجرات اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان (NCPUL) کے اشتراک سے 'بیسویں صدی میں ہندوستان کی اردو شاعرات' کے موضوع پر یک روزہ قومی سمینار منعقد ہوا۔

سمینار کے افتتاحی اجلاس میں سمینار کنوینر لکشمی پٹیل نے تمام مہمانان، مندوبین اور شرکا خواتین و حضرات کا استقبال کیا۔ سمینار میں دہلی، ممبئی، راجستھان، مدھیہ پردیش، گجرات کے مندوبین نے حصہ لیا۔ پرکاش بھائی پٹیل نے کہا کہ فخر کی بات ہے کہ ہمارے یہاں یہ سمینار منعقد ہورہا ہے۔ وس نگر میں NCPUL کی مدد سے اردو کلاسیں بھی چلائی جارہی ہیں جن میں اردو سیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ شانتی لال پٹیل اور شبیر ہاشمی نے سمینار کے انعقاد کو مستحسن قدم بتایا۔ اس موقع پر پروفیسر عزیزاللہ شیرانی کی دو کتابوں

'ابعاد بصیرت' اور 'نگارخانۂ راجستھان' کا اجرا بھی عمل میں آیا۔ افتتاحی تقریب کے بعد سمینار شروع ہوا۔ جس کی صدارت پروفیسر عزیزاللہ شیرانی نے کی اور قادر بھائی منصوری نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ سمینار میں مندوبین نے مندرجہ ذیل مقالات پیش کیے۔

ڈاکٹر محمد مستمر (ہریانہ) بیسویں صدی کی فراموش کردہ شاعرہ عزیزہ بانو داراب وفا اقبال بھائی پٹنی (احمد آباد) ادا جعفری شخصیت اور فن، ڈاکٹر ناظمہ انصاری گجرات کالج احمد آباد 'علامتوں اور لفظوں کی مصورہ پروین' سراج احمد سراج (اجین)، کامل فن شاعرہ پروین شیر، ڈاکٹر ظہیر انصاری (ممبئی)، رفیعہ شبنم کی شاعری، ڈاکٹر سریتا جین (دہلی)، بیسویں صدی کی چند اردو شاعرات، حکیم مزمل حسین / محمد سعید انصاری (احمد آباد)، گجرات کی جانی پہچانی شاعرہ لکشمی پٹیل شبنم، افشاں قادری، زاہدہ زیدی کی شاعری میں عورت کا مقام، فہمیدہ صبا (احمد آباد) گجرات کی چند شاعرات، پروفیسر ڈاکٹر عزیزاللہ شیرانی، جودھپور (راجستھان)، بیسویں صدی میں ہندوستان کی اردو شاعرات۔

آخر میں سمینار کی کنوینر محترمہ لکشمی پٹیل نے سمینار میں شرکت کرنے والے مندوبین کا تہہ دل سے شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: استوتی اگروال، سرونج، 13 اکتوبر

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبان علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبان ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہو پاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

زبان کا تنوع ہمارا ثقافتی ورثہ: نائیڈو

نئی دھلی: نائب صدر جمہوریہ ایم وینکیا نائیڈو نے ملک میں زبان کے تنوع پر فخر کرنے کی اپیل کرتے ہوئے

کہا کہ زبانیں ہمارا تہذیبی ورثہ ہیں اور ان کی مستحکم ادبی تاریخ رہی ہے۔ مسٹر نائیڈو نے پیر کے روز اپنی رہائش گاہ سے مدھوبن ایجوکیشنل بکس کی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ آج ہی کے دن 1949 میں ہماری دستور ساز اسمبلی نے ہندی کو سرکاری زبان کے طور پر قائم کیا تھا۔ اس تناظر میں نائب صدر نے 1946 میں ہریجن میں گاندھی جی کی تحریر کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ علاقائی زبانوں کی بنیاد پر ہی قومی زبان کی شاندار عمارت کھڑی ہوگی۔ قومی زبان اور علاقائی زبانیں ایک دوسرے کو مکمل بناتی ہیں۔ یہ باہم متضاد نہیں ہیں۔ مسٹر نائیڈو نے کہا کہ گاندھی جی اور ڈاکٹر راجیندر پرساد کا راستہ ہماری زبانوں کے اتحاد کو مستحکم کر سکتا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ہماری ہر زبان قابل تعریف ہے۔ کوئی بھی زبان ہماری روایتوں کی طرح پاکیزہ اور ہمارے عقائد کی طرح پاک ہوتی ہے۔ نائب صدر جمہوریہ نے کہا کہ نہ کوئی زبان تھوپی جانی چاہیے نہ کسی زبان کی مخالفت ہونی چاہیے۔ انھوں نے زور دیا کہ ہمہ جہت اور مستقل ترقی کے لیے ذریعۂ تعلیم مادری زبان ہونا ہی چاہیے اس سے بچوں کو اظہار خیال میں اور عنوان کو سمجھنے میں آسانی ہونے کے علاوہ پڑھنے میں دلچسپی پیدا ہوتی ہے۔ اس تناظر میں انھوں نے خوشی ظاہر کی کہ نئی تعلیمی پالیسی 2020 میں ہندوستانی زبانوں اور ثقافتی اہمیت کو قبول کیا گیا ہے۔ مسٹر نائیڈو نے کہا کہ اس کے لیے ہندی اور دیگر ہندوستانی زبانوں میں اچھی نصابی کتابیں مہیا کروانی ہوں گی اور اس میں شائع کنندگان کا اہم کردار ہوگا۔ نائب صدر نے کہا کہ ہم کووڈ 19 وبا کے سبب لاک ڈاؤن کے دوران عوام سے زیادہ سے زیادہ ہندوستانی زبانوں کو سیکھنے کی گذارش کرتے رہے ہیں۔ انھوں نے کہا کہ اس طرح تمام ہندوستانی زبانوں کی ترقی ہو سکتی ہے۔ ہم دیگر ہندوستانی زبانوں کے کچھ نہ کچھ محاورے، لفظ یا گنتی ضرور سیکھیں۔ ساتھ ہی انھوں نے صلاح دی کہ ہندی میں بھی طلبہ کو دیگر ہندوستانی زبانوں کے ادب اور معروف ادبا سے متعارف کروایا جائے اور ہندی کے ادبا، ان کے کام سے دیگر زبانی خطوں کو متعارف کروایا جائے۔ اس موقعے پر نائب صدر جمہوریہ نے طلبہ سے کہا کہ وہ اپنی مادری زبان کا احترام کریں۔ روزمرہ کے کاموں میں اس کا استعمال کریں۔ ہندی اور ملک کی دیگر زبانوں کا ادب پڑھیں، ان میں لکھیں، تبھی ہماری زبانوں کی ترقی ہوگی، وہ مستحکم ہوں گی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس'، دہلی، 15 ستمبر 2020

اردو افسانوی ادب

نئی دھلی: ناہید انٹرنیشنل اردو ورلڈ موریشس کی جانب سے یک روزہ آن لائن عالمی اردو کانفرنس کا انعقاد کیا گیا جس کا عنوان 'اردو افسانوی ادب' تھا۔ سب سے پہلے ناہید انٹرنیشنل کی ڈائرکٹر ڈاکٹر نازیہ بیگم جافو خان نے مندوبین کا گرم جوشی سے استقبال کیا۔ دہلی اردو اکادمی کے سابق وائس چیئرمین اور جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے سابق صدر شعبۂ اردو پروفیسر خالد محمود نے کانفرنس کا افتتاح کیا اور افتتاحی تقریب کی صدارت بھی کی۔ اس موقعے پر جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی کے سابق ڈین فیکلٹی آف ہیومنیٹیز اینڈ لینگویجز پروفیسر وہاج الدین علوی بطور مہمان خصوصی، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ موریشس کے ہیڈ آف اسکول آف انڈین اسٹڈیز ڈاکٹر احمد اعجاز الدین رحمت علی بطور مہمان اعزازی اور الازہر یونیورسٹی قاہرہ، مصر کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر احمد محمد احمد القاضی بطور مہمان ذی وقار نے افسانوی ادب پر پر مغز گفتگو کی۔ مشہور و معروف فکشن نگار پروفیسر غضنفر علی نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ مقالہ خوانی کے تین اجلاس تھے جن میں کل 33 مقالہ نگاروں نے بہت ہی دلکش انداز میں اپنے مقالات پڑھے۔ پروفیسر، ایسوسی ایٹ پروفیسر، اسسٹنٹ پروفیسر، لکچرر، ریسرچ اسکالرس یہاں تک کہ بعض محبان اردو جن کا تعلق درس و تدریس سے نہیں ہے بلکہ اردو کے فروغ کے لیے کوشاں ہیں۔ سب کو اس بین الاقوامی پلیٹ فارم پر موقع دیا گیا۔ ڈاکٹر داؤد محسن، ڈاکٹر واحد نظیر، ڈاکٹر تبسم نقی، ڈاکٹر محمد فرقان، ڈاکٹر شمشاد علی، ڈاکٹر شاہدہ فاطمہ، ڈاکٹر عتیق احمد، ڈاکٹر زرنگار یاسمین، ڈاکٹر حنا آفرین، ڈاکٹر شاہینہ پروین، ڈاکٹر حبیب النسا، ڈاکٹر انوار الحق، غوثیہ سلطانہ (امریکہ)، فریدہ انصاری (قطر)، زینب جومن (موریشس) اور دیگر معزز اسکالرز نے ناول، افسانہ وغیرہ پر مقالے پیش کیے۔ جے این یو کے شعبہ اردو سے منسلک پروفیسر انور پاشا نے پہلی نشست کی صدارت کی اور پریم چند کی افسانہ نگاری کو واضح کیا، جی سی ویمین یونیورسٹی سیالکوٹ پاکستان کے صدر شعبۂ اردو ڈاکٹر محمد افضال بٹ نے دوسرے سیشن میں صدر کے فرائض انجام دیے اور جے این یو نئی دہلی کے شعبہ فارسی سے تعلق رکھنے والے پروفیسر اخلاق آہن نے تیسرے اجلاس میں اپنا صدارتی خطبہ پیش کیا اور اردو اور فارسی افسانوی ادب کے تعلقات اور تفرقات پر گفتگو کی۔ ڈاکٹر ساجد ذکی فہمی، ڈاکٹر ثاقب عمران اور ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے نظامت کے فرائض انجام دیے۔ اختتامی تقریب میں ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے چیئرمین اور جے این یو نئی دہلی کے اردو پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین نے بڑے عالمانہ انداز سے کانفرنس کا خلاصہ پیش کیا اور سبھی مقالہ نگاروں کو مبارکباد پیش کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 ستمبر 2020

انجمن اساتذہ جامعات ہند کا برقی مذاکرہ

نئی دھلی: شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی کے زیر اہتمام انجمن اساتذہ جامعات ہند نے ایک برقی مذاکرے کا انعقاد کیا، جس میں ملک بھر کے اردو اساتذہ نے شرکت کی۔ اس

مذاکرے میں برسوں سے سوئی پڑی تنظیم 'انجمن اساتذہ اردو جامعات ہند' کو ازسر نو بحال وفعال کرنے نیز اس کی حکمت عملی اور لائحہ عمل پر غور وخوض کیا گیا۔ پروفیسر ارتضی کریم نے اپنے تعارفی کلمات میں اس انجمن کے احیا کو وقت کی اشد ضرورت بتاتے ہوئے چند تجاویز پیش کیں جن میں اساتذہ جامعات ہند کی ڈائرکٹری اور ان کی مطبوعات کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ارکان انجمن کو غیر سودی قرض کی فراہمی بھی شامل تھی اور ریسرچ اسکالرز کو وظیفہ دینے پر بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے امیر خسرو کے یوم ولادت کو یوم اردو کے طور پر منانے کا بھی ارادہ ظاہر کیا۔ پروفیسر ارتضی کریم نے کہا کہ جامعات میں شعبہ اردو کا تحفظ اور نئے شعبے کا قیام، اساتذۂ جامعات کے مفادات کی حفاظت انجمن کا کام ہوگا۔ انھوں نے مزید کہا کہ اردو کی زبوں حالی سے آج ہر شخص واقف ہے اور اس کے لیے ذمہ دار ہم اردو کے ہی لوگ ہیں۔ کارگزار صدر پروفیسر سجاد حسین نے اپنی تقریر میں اس تنظیم کو استحکام فراہم کرنے پر زور دیا۔ انھوں نے کہا کہ اگر اسے ملک گیر سطح پر فعال کرنا ہے تو ہمیں بہت محنت کرنی ہوگی۔ نیز جامعات میں اردو کی خالی پڑی آسامیوں کو پُر کرانے کا ارادہ بھی ظاہر کیا۔ پروفیسر قدوس جاوید نے کہا کہ اردو زبان کی بقا کے لیے تمام اردو والوں کو بلا تفریق ایک ساتھ آنا ہوگا۔ اس کے علاوہ پروفیسر عبیدالرحمٰن ہاشمی نے اپنے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ہم انجمن کے ذریعہ اردو کی ترویج واشاعت کی شاندار تاریخ رقم کریں گے۔ پروفیسر شبنم حمید کے ساتھ دوسرے شرکا نے بھی انجمن کے مستقبل کے تئیں اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ تمام شرکا نے عہد کیا کہ ہم سب اس انجمن کے مقاصد کے علم کو آگے لے کر چلیں گے۔ اس بزم میں ملک بھر سے کثیر تعداد میں اردو اساتذہ نے شرکت کی جن میں پروفیسر مظہر مہدی، پروفیسر اسلم جمشید پوری، ڈاکٹر محمد کاظم، ڈاکٹر مشتاق عالم قادری، ڈاکٹر امان اللہ، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ڈاکٹر ساجد حسین، ڈاکٹر متھن کمار، ڈاکٹر ہردیے بھانو پرتاب، ڈاکٹر علی احمد ادریسی، ڈاکٹر ارشاد سیانوی وغیرہ تھے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 22 ستمبر 2020

تحقیق، جدت اور معلومات: لائبریریوں کا بدلتا منظر نامہ

نئی دھلی: ڈاکٹر ذاکر حسین لائبریری (مرکزی لائبریری) جامعہ ملیہ اسلامیہ نے 'تحقیق، جدت اور معلومات: لائبریریوں کا بدلتا منظر نامہ' کے عنوان نے 15 اور 16 ستمبر 2020 کو ایک بین الاقوامی لائبریری کانفرنس کا اہتمام کیا۔ یہ کانفرنس جامعہ ملیہ اسلامیہ کے صد سالہ پروگرام کی مناسبت سے منعقد کیا گیا تھا۔ ہندوستان، امریکہ اور دیگر ممالک کے نامور مقررین اور ماہرین کی ایک کہکشاں نے لائبریریوں کے ابھرتے ہوئے مسائل پر تبادلہ خیال کیا۔ اس کانفرنس کا مقصد اس میدان سے وابستہ افراد کی تفہیم کو مزید بڑھانا اور ان کے لیے آسانیاں فراہم کرنا تھا۔ کانفرنس کی صدارت جامعہ ملیہ اسلامیہ کی وائس چانسلر پروفیسر نجمہ اختر نے کی اور محترمہ کرسٹین میکنزی، صدر، آئی ایف ایل اے نے کلیدی خطبہ پیش کیا۔ پروفیسر اختر نے شرکا کا خیر مقدم کیا اور کہا کہ جامعہ ملیہ اسلامیہ نے نہ صرف اپنی فاؤنڈیشن کے 100 سال پورے کیے بلکہ وزارت تعلیم کی این آئی آر ایف ریکنگ کے ذریعے ملک کی سب سے بہترین دس یونیورسٹیوں میں سے ایک ہونے کا علمی اعزاز بھی حاصل کیا ہے۔ وزارت تعلیم کے ذریعے ملک کی تمام مرکزی یونیورسٹیوں کی کارکردگی کے جائزہ میں جامعہ ملیہ اسلامیہ نے اول پوزیشن حاصل کی۔ انھوں نے مزید کہا کہ تحقیق اور ایجاد و اختراعات علم پر مبنی معیشت اور معاشرے کا لازمی جزو ہیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 18 ستمبر 2020

عربی افسانہ نگاری سے میری دلچسپی

نئی دھلی: ریسرچ اسکالرس فورم شعبۂ عربی جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی کے زیر اہتمام 'عربی افسانہ نگاری سے میری دلچسپی' کے موضوع پر پروفیسر عبدالماجد قاضی صدر شعبۂ عربی کی صدارت میں آج پہلے ان لائن لیکچر کا اہتمام کیا گیا، جس میں مقرر کی حیثیت سے آن لائن عربی میگزین 'اقلام الہند' کے چیف ایڈیٹر اور عربی زبان کے افسانہ نگار ڈاکٹر محسن عتیق خان ندوی نے شرکت کی۔ فورم کے سکریٹری آفاق قریشی نے ریسرچ اسکالرس فورم کی غرض وغایت اور اس کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر محسن عتیق نے اپنے خطاب میں اپنے تجربات کی روشنی میں بتایا کہ عربی میں افسانہ کیسے لکھا جاتا ہے اور ایک ادیب اور رائٹر اپنے اردگرد اردو دنیا کے مسائل کو جب سنتا اور دیکھتا ہے تو اپنے حساب سے کیسے انھیں کہانی کا موضوع بناتا ہے اور اسے قصہ کی شکل میں لوگوں کے سامنے پیش کرتا ہے تاکہ لوگ اس سے عبرت حاصل کریں۔ اس موقعے پر پروفیسر حبیب اللہ خان نے ڈاکٹر محسن عتیق کو مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ اس طرح کے لیکچر سے کافی استفادہ کا موقع ملتا ہے جس میں کوئی رائٹر یا ادیب اپنے تجربات کو بیان کرتا ہے۔ فورم کے مشیر ڈاکٹر نسیم اختر نے کہا کہ خوشی کا موقع ہے کہ ہمارے شعبے کے پروردہ ڈاکٹر محسن عتیق کئی سالوں سے عربی زبان میں افسانے لکھ رہے ہیں اور ان کے کئی افسانے عرب دنیا کے مسابقوں میں انعامات بھی حاصل کر چکے ہیں۔ پروگرام کے آخر میں عبدالماجد قاضی نے ڈاکٹر محسن مبارک باد پیش کی۔ اس پروگرام میں خاص طور سے پروفیسر محمد ایوب ندوی ڈائرکٹر انڈیا کلچرل سینٹر، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ڈاکٹر فوزان احمد اور ڈاکٹر محفوظ الرحمٰن نے شرکت کی۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 14 اکتوبر 2020

اتر پردیش

عالمی عربی کیلی گرافی نمائش 2020

لکھنؤ: عالمی عربی کیلی گرافی نمائش 2020 کا انعقاد ورچوئل طریقے سے کیا گیا۔ اس نمائش کا انعقاد عراق و ہندوستان کی جانب سے مشترکہ طور پر کیا گیا۔ اس میں پوری دنیا سے سیکڑوں کی تعداد میں ماہر خطاط شامل ہوئے۔ ہندوستان کی جانب سے گوری یوسف حسین اور عراق کی جانب سے علی لازم سلمان نے میزبانی کی۔ ماہر خطاط ہاشم اختر نقوی نے بتایا کہ عربی کیلی گرافی نمائش 2020 میں عربی کے نایاب و نادر خطوط کا مظاہرہ کیا گیا۔ پوری نمائش میں قرآن کی آیات خصوصاً 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کو مختلف خطوط میں پیش کیا گیا۔ انھوں نے بتایا کہ اس نمائش کو کورونا کی وجہ سے ورچوئل طریقہ سے منعقد کیا گیا۔ اس میں علی لازم سلمان بغداد سے، محمد عبدالحلیم، احمد ممدوح احمد علی، محمد ابراہیم غنیم، بالہ محمد حمدہ، ماہ اسماعیل مصر سے، برزان حاجی اسماعیل کردستان سے، سعد عبدالحی الشمر، بن جواد قذاق، حسان علی الموسوی، زینب صادق جسیم عراق سے، احمد رفاعی حسن مصر کے علاوہ سیکڑوں کی تعداد میں ماہر خطاط نے شرکت کی اور قرآنی آیات کی نادر و نایاب خطوط میں کچھ لکھ کر نمائش کی۔ نمائش میں لکھنؤ سے نمائندگی کرنے والے ہاشم اختر نقوی نے بتایا کہ میں نے کیلی گرافی میں بہت کام کیا ہے۔ 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' کو 6 ہزار سے زائد خطوط میں لکھا ہے جس کا مظاہرہ لکھنؤ، دہلی، ممبئی، الہ آباد، گڑگاؤں، جے پور سمیت بیرون ملک میں بھی کیا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ جے پور میں گزشتہ برس ہوئی کیلی گرافی نمائش میں پوری دنیا سے لوگ شامل ہوئے، جس میں لکھنؤ کی نمائندگی میں نے کی تھی۔ انھوں نے بتایا کہ انھوں نے متعدد خطوط خود ایجاد کیے ہیں جن میں کنسٹریکٹو

آرٹ آف کیلی گرافی بھی ہے، جس کو خط تعمیری نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ کئی دیگر خطوط ایجاد کیے۔ جیسے انھوں نے 'بسم اللہ' کو مقامی و بیرون ملک کے خط کے طرز پر لکھا ہے جس میں ہندی، بنگالی، فرنچ، انگلش کے علاوہ دیگر زبانیں شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 12 ستمبر 2020

زبان کی ٹکنالوجی اور اس کا دائرہ کار

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ لسانیات کے زیر اہتمام اے ایم یو صد سالہ تقریبات کے موقعے سے ویب لیکچر سیریز کی تیسری کڑی بعنوان 'زبان کی ٹکنالوجی اور اس کا دائرہ کار' کے طور پر ایک ویب ٹاک کا انعقاد عمل میں آیا۔ پروفیسر محمد جہانگیر وارثی، صدر شعبۂ لسانیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے مقرر پروفیسر نیلاندری سیکھر داش کا تعارف کرایا، جو کولکاتہ کے ہندوستانی شماریاتی ادارہ کی لسانی ریسرچ یونٹ کے صدر ہیں۔ فاضل مقرر نے کہا کہ اکیسویں صدی سائنس اور ٹکنالوجی کی صدی ہے اور اس کا کینوس دن بہ دن پھیلتا چلا جارہا ہے۔ انھوں نے کہا کہ پچھلے کئی سالوں سے زبان کی ٹکنالوجی نے نہ صرف لسانیات، انفارمیشن ٹیکنالوجی میں اپنے قدم جمائے ہیں بلکہ علوم کے دوسرے میدان مثلاً سائنس، سماجی و انسانی علوم کی شکل میں اس کا دائرہ کار بڑھا ہے۔ دوران گفتگو انھوں نے لسانیات اور کمپیوٹر سائنس کو درپیش چیلنجز پر روشنی ڈالی اور بتایا کہ کیسے باہمی اشتراک و تعاون سے ان مسائل کو بحسن وخوبی حل کیا جاسکتا ہے۔ انھوں نے ٹکنالوجی کے ان پہلوؤں پر بھی کافی تفصیل سے روشنی ڈالی جن کی مدد سے زبان کو وقت کے دھارے سے جوڑا جاسکتا ہے۔ پروفیسر نیلادری سیکھر داش کی سیر حاصل گفتگو کے بعد شعبۂ لسانیات کے صدر پروفیسر ایم جے وارثی نے سامعین کے پیش کردہ سوالات موصوف تک پہنچائے جن کا انھوں نے تشفی بخش جواب دیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 ستمبر 2020

بہار

دبستان عظیم آباد کی خدمات

دربھنگہ: دبستان عظیم آباد کی تاریخ قابل ذکر ہے اور یہاں کے شاعروں، ادیبوں کی اتنی زیادہ خدمات ہیں کہ ان کے ذکر کے بغیر اردو زبان و ادب کی کوئی بھی تاریخ مکمل نہیں ہوسکتی۔ یہاں کے شاعروں، ادیبوں و ناقدین کو اولیت حاصل رہی ہے۔ یہ باتیں شعبہ اردو سی ایم کالج دربھنگہ کے زیر اہتمام منعقدہ یک روزہ قومی وہینار میں بطور مہمان خصوصی شرکت کرتے ہوئے دہلی یونیوسٹی کے ڈین فیکلٹی آف آرٹس اور صدر شعبۂ اردو پروفیسر ارتضیٰ کریم نے کہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ ہمیں علاقائی ادب کی تاریخ مرتب کرنے پر بھی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے دبستان عظیم آباد کی اہمیت تسلیم کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ شاید بہار میں ہی سب سے پہلے اردو اکادمی کا قیام ہوا تھا۔ وہینار کے افتتاحی اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے معروف ادیب و شاعر و محقق مسٹر فاروق ارگلی نے کہا کہ دبستان عظیم آباد کو بھی دبستانوں میں سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ عظیم آباد کی ادبی خدمات قابل فخر ہیں۔ اس وہینار سے دبستان عظیم آباد کی خدمات پر ایک تفصیلی گفتگو کا آغاز ہوگا۔ وہینار میں کلیدی خطبہ پیش کرتے ہوئے معروف ادیب و ناقد پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے کہا کہ دبستان عظیم آباد میں معیار کی بلندی کا خیال ہمیشہ سے رکھا گیا ہے اور دبستان عظیم آباد اسی لیے دیگر دبستانوں میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ پروفیسر آفاقی نے دبستان عظیم آباد کی خدمات پر تفصیلی گفتگو کی اور بتایا کہ شاد عظیم آبادی، قاضی عبدالودود اور کلیم الدین احمد کی تثلیث اردو تنقید میں ٹرینڈ سیٹر کی حیثیت رکھتی ہے۔ قاضی عبدالودود، امداد امام اثر، سہیل عظیم آبادی اور دبستان عظیم آباد سے تعلق رکھنے والے دیگر شاعروں و ادیبوں کی خدمات کا بھی انھوں نے احاطہ کیا۔ اس سے قبل سی ایم کالج کے پرنسپل اور معروف شاعر و ادیب ڈاکٹر مشتاق احمد نے بھی مہمانان کا استقبال کرتے ہوئے کہا کہ دبستان عظیم آباد کی خدمات پر آج اس وہینار کا انعقاد کیا گیا تاکہ ہم یہاں کے ادیبوں، شاعروں کی خدمات پر تفصیلی گفتگو کریں اور عظیم آباد کی ادبی خدمات پر پھر سے ایک گفتگو کا آغاز ہو۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ نئی نسل کے اردو اسکالر اور نئے قاری جب ادب کا مطالعہ کریں تو دبستان عظیم آباد کی بھی ادبی خدمات سے انھیں واقفیت ہو اور وہ اس دبستان کی اہمیت کو بھی تسلیم کریں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 7 ستمبر 2020

مہاراشٹر

چلڈرنس اردو میگزین ایسوی ایشن کی آن لائن میٹنگ

مالیگاؤں: بچوں کے رسائل کی تنظیم چلڈرنس اردو میگزین ایسوی ایشن (CUMA) کی میٹنگ سے 23 ستمبر 2020 کو زوم پر خطاب کرتے ہوئے مولانا آزاد نیشنل اردو یونیورسٹی حیدر آباد کے چانسلر محترم فیروز بخت احمد نے کہا کہ بچوں کے رسائل کو جاری رکھنا آسمان سے تارے توڑ کر لانے والی بات ہے۔ آپ نے کہا کہ بچوں کے ادب پر مسلسل کام کرنا، ادب اطفال کے عالمی سیمینار کا انعقاد کرنا یہ صرف فاروق سید (گل بوٹے) جیسے جنونی کا ہی کام ہوسکتا ہے، آپ نے اس بات کا وعدہ کیا کہ ملک بھر کے بچوں کے رسائل کو جو مالی بحران سے دوچار ہیں، انھیں ہر ممکن مالی اعانت کی کوشش کی جائے گی۔ اس میٹنگ کا آغاز عبداللہ ندوی غازی صاحب کی تلاوت سے ہوا۔ ابتدائی گفتگو فاروق سید صاحب نے کی اور مہمان مکرم کا تعارف پیش کیا۔

ماہنامہ پھول (بھٹکل) کے مدیر عبداللہ غازی ندوی نے بچوں کے ادب سے فیروز بخت کی دلچسپی اور وارفتگی کے بارے میں بتا کر یہ امید ظاہر کی کہ فیروز بخت کی شخصیت بچوں کے رسائل کے لیے امید افزا ثابت ہوگی۔ ماہنامہ الفاظ ہند (کامٹی) کے مدیر ریحان کوثر نے اپنے رسالہ کا تعارف کراتے ہوئے اس بات کی نشان دہی کی کہ الفاظ ہند پورے ودربھ سے شائع ہونے والا واحد رسالہ ہے۔ ماہنامہ گلشن اطفال (مالیگاؤں) کے مدیر رحمانی سلیم احمد نے بچوں کے ادب سے اپنے لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس سلسلے میں 1995 سے سرگرم عمل ہیں۔ تنظیم کے صدر سراج الدین ندوی صاحب (مدیر اچھا ساتھی، بجنور) نے مہمان مکرم کی توجہ اس طرف دلائی کہ اگر ملک بھر کے بچوں کے رسائل کی طرف توجہ نہ دی گئی تو کئی رسائل بند ہوسکتے ہیں۔ جناب عنایت اللہ فلاحی (مدیر جنت کا پھول) اور ماہنامہ پیام تعلیم کے پرنٹر

جناب عرشی صاحب نے بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا۔

تنظیم کے جنرل سکریٹری فاروق سید نے اس موقعے پر بہت سی تجاویز پیش کیں۔ خیال انصاری (مدیر خیر اندیش، مالیگاؤں) نے اپنے اخبار کا تعارف پیش کرتے ہوئے مہمان محترم سے گذارش کی کہ وہ بچوں کے اخبار ورسائل کی سرپرستی فرمائیں۔ اختتامی کلمات سراج الدین ندوی نے ادا کرتے ہوئے فرمایا کہ ادب اطفال کا فروغ ہمارا مقصد ہے۔ مہمان مکرم جناب فیروز بخت احمد نے اپنی گفتگو میں بہت سی قیمتی باتیں کہیں۔ آج کے مسائل سے نپٹنے سے متعلق کئی مفید مشورے دیئے اور اپنی طرف سے ہرممکن تعاون کا یقین دلایا۔ آپ نے ماہنامہ کھلونا (نئی دہلی)، ماہنامہ ٹافی (لکھنؤ) اور جنت کا پھول (رام پور) کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ ان رسالوں کو پڑھ کر ہم بڑے ہوئے ہیں۔ آج بھی ان رسائل کی یادیں ہمارے دل ودماغ میں تازہ ہیں۔

رپورٹ: رحمانی سلیم احمد، میڈیا انچارج، 25 ستمبر 2020

راجستھان

عہد حاضر میں مصنفین کی ذمے داریاں

اودے پور: پینڈمک دور میں اہل علم و دانش وقلم خود کو کیسے فعال، متحرک اور تازہ دم رکھ سکتے ہیں۔ اپنے افکار و خیالات سے سماج، عوام، نئی نسل اور ملک کو کیسے مایوسیوں کی تاریکی سے نکال کر باہر لا سکتے ہیں۔ کیسے حوصلے، عزم کے تازہ لہو سے زندگی کے چمن کو سدابہار بنا سکتے ہیں۔ یہ پیغام شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی نے 'عہد حاضر میں مصنفین کی ذمہ داریاں' کے موضوع پر منعقدہ یک روزہ قومی ویبینار میں دیا۔ ویبینار کا آغاز یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امریکا سنگھ کے دستِ مبارک سے ہوا۔ افتتاح سے قبل صدر شعبۂ اردو پروفیسر حدیث انصاری نے وائس چانسلر اور تمام شرکا کا خیرمقدم کیا۔ پروفیسر انصاری نے بتایا کہ یونیورسٹی کا شعبۂ اردو یونیورسٹی کے قیام 1962 کے ساتھ سے ہی درس وتدریس اور تحقیق کے عمل میں مصروف ہے۔ درس وتدریس کے علاوہ طلبہ و طالبات کی تربیت کے لیے شعبۂ اردو سمینار اور ورک شاپ کا انعقاد بھی کرتا رہتا ہے۔ یہ ویبینار بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ویبینار کے افتتاحی اجلاس میں یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب پروفیسر امریکا سنگھ نے اپنی جامع تقریر میں کہا کہ ہر دور میں ادیبوں اور قلم کاروں نے اپنی ذمے داریوں کو بخوبی نبھایا ہے۔ انھوں نے مزید کہا، زبانیں اس روئے زمین پر ابن آدم کی امتیازی پہچان ہیں، ہر زبان میں تمام طرح کے علوم فنون کا وافر سرمایہ موجود ہے۔ زمانے کی ضرورتوں کو دھیان میں رکھ کر مصنفین نے تخلیقی اور اختراعی کام کیا ہے۔ آج بھی اس کی ضرورت ہے تبھی ہمارا ملک اور یہاں کے شہری دنیا کی زود رفتاری میں شامل ہوسکتے ہیں۔

صوبائی حکومت راجستھان ہائر ایجوکیشن کونسل کے وائس چیئرمین پروفیسر دریاؤ سنگھ چنڈاوت نے اپنے پرمغز بیان میں کہا کہ کسی بھی سماج وسیاست اور ملک میں ایک مصنف ہی ایسا فرد ہوتا ہے جس کی فکر اور قلم، سماج و سیاست کی نبض کا تجزیاتی مطالعہ اور مشاہدہ کرتا رہتا ہے۔ مصنف ہی سماج و سیاست کی خامیوں اور کوتاہیوں کو زمانے کے سامنے پیش کرنے کی جرأت رکھتا ہے۔

ویبینار کے خصوصی مہمان پروفیسر خالد محمود سابق صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی اور قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، حکومت ہند کے سابق ڈائرکٹر خواجہ محمد اکرام الدین تھے۔ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے پروفیسر خالد محمود نے کہا کہ مصنف کی اہمیت ہر دور میں رہی ہے۔ ایک عام آدمی کے مقابلے میں مصنف کی ذمے داریاں اور فرائض زیادہ ہوتے ہیں۔ وہ سماج کا سب سے زیادہ حساس فرد ہوتا ہے۔ سماج وسیاست کا رمز شناس اور نباض ہوتا ہے۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ویبینار سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ایک اچھا مصنف ایک اچھا استاد بھی ہوتا ہے۔ اس سبب سے اس کے اوپر دوہری ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ چنانچہ اسے بدلتے ہوئے وقت کا مکمل علم ہونا چاہیے۔

ویبینار کے پہلے اجلاس میں پروفیسر محمد علی جوہر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ، پروفیسر احمد محفوظ جامعہ ملیہ اسلامیہ یونیورسٹی نئی دہلی، پروفیسر آفتاب احمد آفاقی بنارس ہندو یونیورسٹی، ڈاکٹر ابوبکر عباد دہلی یونیورسٹی دہلی، ڈاکٹر حسین رضا خان راجستھان یونیورسٹی جے پور کل پانچ مقالہ نگاروں نے اپنے پرمغز معلوماتی مقالے اور خیالات پیش کیے۔ اس اجلاس کی صدارت کی ذمے داری پروفیسر محمد علی جوہر نے نبھائی۔ ویبینار کے دوسرے اجلاس میں پروفیسر شہزاد انجم صدر شعبۂ اردو جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی، پروفیسر شہاب الدین ثاقب، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ڈاکٹر اظہر حیات ناگپور، ڈاکٹر یوگیندر ناتھ شکلا اندور، ڈاکٹر اسما مسعود بیکانیر نے تحقیق پر مبنی تجزیاتی، معلوماتی مقالے پیش کیے۔ پروفیسر شہزاد انجم نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ ہر عہد انتشار اور امن کے درمیان سے گزرتا ہے اور اس کی تاریخ ترتیب پاتی ہے۔ لوگ انتشار کو بھول جاتے ہیں اور امن کو قائم رکھتے ہیں اور اسے یاد بھی کرتے ہیں۔ یہ سب مصنفین کی صالح اور تعمیری تحریروں کے ذریعے ہی ممکن ہوتا ہے۔ آج کا عہد بھی کچھ اسی قسم کی رفتار سے گزر رہا ہے۔ ویبینار کے اختتام پر تمام شرکا نے موضوع کی اہمیت اور اس کے مقاصد کو اپنے تاثرات میں بیان کیا اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ نظامت کے فرائض محترمہ مبینہ بی نے انجام دیے اور اظہار تشکر کیا۔

پریس ریلیز: حدیث انصاری، صدر شعبۂ اردو/کنوینر ویبینار، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، اودے پور، راجستھان، 24 ستمبر 2020

اعزاز واکرام

مغربی بنگال اردو اکادمی کا پہلا غالب ایوارڈ

کولکتہ: مغربی بنگال اردو اکادمی نے طویل انتظار کے بعد 11 ستمبر کو 2017 اور 2018 کے لیے اپنے سالانہ

ایوارڈز کا اعلان کیا۔ اکادمی کی سکریٹری نزہت زینب کے دستخط سے جاری کردہ اعلانیہ کے مطابق اکادمی کا پہلا غالب ایوارڈ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے پروفیسر ایمریٹس، اردو کے معتبر ناقد ومحقق، ادیب وشاعر اور غالب اکادمی دہلی کے صدر پروفیسر شمیم حنفی کو دیا جائے گا۔ اس ایوارڈ کے قیام کا اعلان اسی سال فروری میں اکادمی کی تقریبات 'بیادِ غالب' کے موقعے پر کیا گیا تھا۔ اکادمی نے 7 دیگر زمروں میں دو سال کے ایوارڈز کے لیے جن 14 افراد کو منتخب کیا ہے، ان میں بالترتیب اقبال سمان کے لیے پروفیسر قدوس جاوید اور پروفیسر ابوالکلام قاسمی، مغربی بنگال اردو اکادمی ایوارڈ کے لیے انیس رفیع اور پروفیسر صغیر افراہیم، مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی ایوارڈ کے لیے احمد جاوید اور م افضل، پرویز شاہدی ایوارڈ کے لیے فیروز عابد اور عرفان بنارسی، شانتی رنجن بھٹا چاریہ ایوارڈ کے لیے ڈاکٹر امین عامر اور ڈاکٹر حسین احمد زاہدی، رابعہ سلطانہ ایوارڈ

کے لیے ڈاکٹر یاسمین اختر اور ڈاکٹر دیبا ہاشمی، شاکر کلکتوی ایوارڈ کے لیے سفیر الدین کمال اور انجم عظیم آبادی کے نام شامل ہیں۔ ان میں 6 کا تعلق ملک کے مختلف حصوں اور 8 کا شہر نشاط کولکاتہ سے ہے۔ تحریک آزادی میں مولانا آزاد کے دست راست رہے مشہور مجاہد آزادی، سوانح نگار و انشاپرداز اور روزنامہ 'آزاد ہند' کے بانی مدیر مولانا عبدالرزاق ملیح آبادی سے منسوب قومی سطح کا ایوارڈ اردو صحافت میں نمایاں خدمات کے لیے ہر سال کسی ایک صحافی کو دیا جاتا ہے۔ 2017 کے لیے 'انقلاب' کے ریزیڈنٹ ایڈیٹر احمد جاوید جبکہ 2018 کے لیے اخبار نو، دہلی کے بانی ایڈیٹر، سابق رکن پارلیمنٹ اور سابق سفیر م افضل کو منتخب کیا گیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 13 ستمبر 2020

کمل دیوبندی

دیوبند: دیوبند کی سماجی تنظیم ہیومنٹی فاؤنڈیشن کی جانب سے ایک ادبی پروگرام منعقد کیا گیا۔ پروگرام کے دوران اردو اور ہندی زبان کے سینئر قلم کار کمل دیوبندی کو ان کے ادبی سفر کے 44 سال پورے ہونے پر اعزاز سے نوازا گیا۔ تفصیلات کے مطابق محلہ شاہ رمزالدین میں ڈاکٹر صادق دیوبندی کی رہائش گاہ پر ایک ادبی پروگرام کا انعقاد کیا گیا۔ اس پروگرام کے دوران سید وجاہت شاہ عرف کمل دیوبندی کو ان کی 40 سال سے زائد ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔ اس موقعے پر طنز و مزاح کے معروف شاعر ڈاکٹر شمیم دیوبندی نے وجاہت شاہ کو اعزاز دیے جانے پر اپنی خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کمل دیوبندی اس اعزاز کے اصل حقدار ہیں اور ان کو یہ اعزاز بہت پہلے مل جانا چاہیے تھا۔ انھوں نے کہا کہ کمل دیوبندی نے اپنے قلم کو کسی خاص موضوع یا طبقہ تک محدود نہیں رکھا، بلکہ انھوں نے ادب، شخصیات، کھیل، فلمیں، تعلیم، مذہب اور عام سماجی موضوعات پر بھرپور انداز میں لکھا۔ ڈاکٹر صادق دیوبندی نے کمل دیوبندی کو مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ انھوں نے دیوبند گورو، آئینہ، شاہ پریوار، ویکتی جو شیش ہے، اوراق ادب اور کمل سامانیہ گیان وغیرہ جیسی کتابوں کی تصنیف بھی کی۔ انھوں نے کہا کہ اخبارات اور رسائل میں کمل دیوبندی کے اب تک تقریباً 11 سو مضامین، خطوط وغیرہ شائع ہو چکے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 22 ستمبر 2020

مہتاب آزاد

دیوبند: دیوبند کے نوجوان کوی و قلمکار ڈاکٹر مہتاب آزاد کو اتر پردیش کے سیتاپور کی ادبی تنظیم 'کاویہ نکھار ساہتیہ منچ' کی جانب سے یوم ہندی کے موقعے پر گنیش شنکر ودیارتھی ایوارڈ سے نوازا گیا۔ مہتاب آزاد کی ادبی خدمات و ادب کے تئیں ان کی دلچسپی کے مدنظر انھیں یہ اعزاز دیا گیا۔ مہتاب آزاد کو مذکورہ اعزاز ملنے پر سینئر صحافی اندرپال سنگھ سیٹھی، اشرف عثمانی، اشوک گپتا اور منوج سنگھل نے انھیں مبارکباد دیتے ہوئے کہا کہ نوجوان ادبی میدان میں دیوبند کا نام روشن کر رہے ہیں۔ ودیارتھی اعزاز ملنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے نامور کالم نگار کمل دیوبندی، شاعر دلشاد خوشتر نے انھیں مبارکباد پیش کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر مہتاب آزاد کو مذکورہ اعزاز ملنا دیوبند کے نوجوانوں کے لیے خوشی کا باعث ہے، جس سے نوجوانوں کے اندر ادب کی خدمت کے تئیں مزید دلچسپی پیدا ہوگی، انھوں نے کہا کہ یہ نوجوان اپنی زبان و قلم سے دیوبند کا نام روشن کر رہے ہیں۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 16 ستمبر 2020

سلیم الرحمٰن

دیوبند: جان لیوا وبائی مرض کے دوران اپنے پیشہ میں خدمت انسانی اور ایثار کی مثال پیش کرنے والے شہر کے معروف معالج ڈاکٹر سلیم الرحمٰن (ایم ڈی) کے جذبۂ خیر کے اعتراف میں انھیں موہن انصار لائبریری کی جانب سے ایوارڈ دیا گیا۔ یہ ایوارڈ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن، ڈاکٹر محمد جاوید اور ڈاکٹر تسلیم سمیت دیگر عملہ کو ان کی حوصلہ افزائی کے طور پر دیا گیا۔ اس موقعے پر مدرا اکادمی کے صدر ارشد علی خاں ایڈوکیٹ نے کہا کہ پوری انسانیت اس وقت کووڈ 19 کی وجہ سے سخت آزمائش میں مبتلا ہے۔ اس وبائی مرض کا خطرہ اس قدر بڑھا ہوا ہے کہ شہر میں دوسرے موذی اور مہلک امراض کے علاج کے لیے بھی معالج میسر نہیں ہیں، ایسی تکلیف دہ صورت حال میں جب کہ اکثر معالجین گوشہ نشیں ہو گئے تھے تو ڈاکٹر سلیم الرحمٰن خطروں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے دن رات مریضوں کی خدمت میں لگے رہے۔ اس لیے ان کی حوصلہ افزائی اور ستائش اہل شہر پر فرض ہے۔ مومن ڈرامہ کلب کے صدر اور سماجی خدمت گار سلیم اختر نے کہا کہ ڈاکٹر سلیم الرحمٰن اور ان کی ٹیم موجودہ انسانی خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اتر پردیش پریس ایسوسی ایشن کے صدر صحافی اشرف عثمانی نے ایوارڈ پیش کرتے ہوئے کہا کہ کمرشیلائزڈ ہوتے شعبہ صحت میں اگر کسی معالج کے اندر اپنے مریض کے تئیں خلوص اور جذبہ انسانی پایا جاتا ہے تو اس کی قدر کی جانی چاہیے۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 22 ستمبر 2020

پروفیسر محمد شہریار

نئی دهلی: ہندوستان کی وزارت تعلیم کے زیرانتظام، آل انڈیا کونسل برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن ہر سال 15 ستمبر کو یوم ویسویوریا کے موقعے پر ہندوستان بھر کی یونیورسٹیوں سے منتخب کرکے بیسٹ ٹیچر کے اعزاز سے نوازتا ہے۔ اس سال جامعہ ہمدرد کے اسکول آف فارمیسی ایجوکیشنل اینڈ ریسرچ سے تعلق رکھنے والے پروفیسر محمد شہریار کو بیسٹ ٹیچر ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔ ملک بھر میں پہلے مقام پر فائز بہترین فارمیسی انسٹی ٹیوٹ جامعہ ہمدرد کے استاد ڈاکٹر شہریار فارماسیوٹیکل کیمسٹری کے بہترین اساتذہ میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ملک کے بیسٹ ٹیچر کی فہرست میں شامل ڈاکٹر محمد شہریار کو آج ایک ورچوئل تقریب میں وزیر تعلیم، محترم رمیش پوکھریال جی نے مبارکباد دی۔ واضح رہے کہ ہندوستان کی وزارت تعلیم کے زیرانتظام آل انڈیا کونسل برائے ٹیکنیکل ایجوکیشن کے اس اعلان سے جامعہ ہمدرد کے تمام اساتذہ اور طلبہ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ یہ اطلاع دیتے ہوئے کلچرل کو آرڈینیٹر واسسٹنٹ ڈی ایس ڈبلیو ڈاکٹر خورشید احمد انصاری نے بھی ڈاکٹر محمد شہریار کو دلی مبارکباد پیش کی۔ فارمیسی کے شعبہ میں ڈاکٹر محمد شہریار کافی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں اور متعدد ریسرچ پیپر آپ کے علم کے گواہ ہیں۔ جامعہ ہمدرد کے تمام اساتذہ طلبہ و طالبات نے بھی ڈاکٹر محمد شہریار کو مبارکباد پیش کی اور نیک خواہشات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 17 ستمبر 2020

اساتذہ اعزازی تقریب

علی گڑھ: 5 ستمبر یوم اساتذہ کے موقعے پر اتر پردیش اردو ٹیچرس ایسوسی ایشن علی گڑھ کے زیراہتمام 'اساتذہ اعزازی تقریب' کا انعقاد کنو نسیم شاہد کی رہائش گاہ، ہمدرد نگر، جمالپور علی گڑھ میں کیا گیا جس کی صدارت ماسٹر عبدالقدیر نے کی، جب کہ کنوینر نسیم شاہد تھے اور نظامت ڈاکٹر مجیب شہزر نے کی۔ اس موقعے پر ایسوسی ایشن کی جانب سے نجے کمار (پرنسپل پرائمری اسکول بھیج پورہ، علی گڑھ)، تنویر احمد (پرائمری اسکول استرا پور، کنکیری)، محترمہ غزالہ خان

(ہیڈ ٹیچر پرائمری اسکول، بلاک لودھا) اور لکشمی کماری کو اپنے اسکولوں میں اردو کی بہترین تعلیم اور طلبہ و طالبات کی عمدہ تربیت کرنے پر خصوصی ایوارڈ اور شال اوڑھا کر اور دیگر موجود اساتذہ کا پھول مالا پہنا کر استقبال کیا گیا۔ ماسٹر عبدالقدیر نے اپنے صدارتی خطاب میں کہا کہ آج کا دن اساتذہ کے دن کے طور پر منایا جاتا ہے۔ ایک اچھا استاد معاشرے کا خالق ہوتا ہے۔ وہ طلبہ کو خون پسینے سے سیراب کر کے ملک کی تعمیر میں اپنا گراں قدر رول ادا کرتا ہے، لہٰذا ہم سب اساتذہ کو چاہیے کہ درس و تدریس کا کام تندہی سے کریں اور اپنا فرض ادا کریں۔ کنوینر کنور نسیم شاہد نے کہا کہ اساتذہ کا احترام کیا جانا چاہیے، اگر اساتذہ کا احترام کیا گیا تو ملک کا وقار اور بڑھ جائے گا۔ ایک استاد معاشرے کا تخلیق کار ہوتا ہے اور ملک کے روشن مستقبل کے لیے کام کرتا ہے۔ اس موقعے پر مشہور شاعر اور اردو ٹیچر ڈاکٹر مجیب شہزر نے خوبصورت انداز میں نظامت کی اور استاد کی اہمیت پر ایک نظم پیش کی جس پر سبھی موجود اساتذہ نے انھیں خوب داد و تحسین سے نوازا ہے۔ اے پی ایس اسکول کی ٹیچر محترمہ اسما مرتضٰی نے بھی اساتذہ پر ایک بہترین نظم پیش کی۔ روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 7 ستمبر 2020

رسم اجرا

مہانا یک مودی

نئی دھلی: 17 ستمبر کو وزیر اعظم نریندر مودی کی سالگرہ کے موقعے پر ملک بھر میں بہت سارے پروگراموں کا انعقاد کیا گیا۔ اسی سلسلے میں نئی دہلی میں، مرکزی

وزیر مملکت برائے اسٹیل اور بی جے پی کے سینئر لیڈر، فلگن سنگھ کلستے نے عام قارئین کے لیے 'مہانا یک نریندر مودی' کے عنوان سے شائع کردہ ایک کتاب کا اجرا کیا۔ بازار میں آنے سے پہلے ہی یہ کتاب سرخیوں میں ہے۔ اس کتاب کے مصنف مشہور سیاسی تجزیہ کار اور نامور صحافت کی کرشنا موہن جھا ہیں۔ سینئر مرکزی وزیر نریندر سنگھ تومر نے اس کتاب کا مقدمہ تحریر کیا ہے جو وزیر اعظم مودی کی متاثر کن شخصیت کا جائزہ پیش کرتا ہے۔ اس موقعے پر اپنے خطاب میں، مرکزی وزیر کلستے نے وزیر اعظم مودی کے ساتھ اپنے تعلقات کا ذکر کرتے ہوئے، ان کی غیر معمولی قائدانہ صلاحیت اور تنظیمی صلاحیتوں کی تعریف کی۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 18 ستمبر 2020

نواز دیوبندی کی نظموں کے مجموعہ 'دلکش نظمیں' کا اجرا

دلکش نظمیں

دیوبند: انور اکیڈمی و مدرسہ رحمت القرآن دیوبند کی جانب سے عیدگاہ روڈ پر واقع پبلک گرلز انٹر کالج میں شاعر نور دیوبندی کی نظموں پر مشتمل ان کی اولین کاوش 'دلکش نظمیں' کا اجرا عمل میں آیا۔ اجرا کی تقریب کی صدارت کرتے ہوئے اتر پردیش اردو اکادمی کے چیئرمین ڈاکٹر نواز دیوبندی نے کہا کہ دیوبند کی ادبی تاریخ میں پہلی بار کسی شاعر نے نظموں پر مشتمل کتاب کی اشاعت کی جرأت کی ہے۔ انھوں نے کہا کہ نظموں کے ذریعے بچوں سے گفتگو کرنا ان کے معیار، مزاج اور عمر کے مطابق انتخاب کرنا مشکل عمل ہوتا ہے کیونکہ بچوں کو سہل زبان اپنے عنوانات کے ذریعے متوجہ کرنا ہوتا ہے۔ دادری سے تشریف لانے والے سماجی کارکن قاری سی ایم مصطفٰی نے اپنے خطاب میں کہا کہ 'نور دیوبندی' نے 'دلکش نظمیں' کی اشاعت کر کے دیوبند کے ادبی آسمان پر ایک اور روشن ستارے کا اضافہ کر دیا ہے۔ انھوں نے کہا کہ ادب کی دنیا میں مشکل الفاظ تحریر کرنا سہل ہے مگر بچوں کو نظر میں رکھتے ہوئے سہل زبان میں لکھنا مشکل ہے۔ ڈاکٹر طاہر قمر میراپوری نے نور دیوبندی کی کاوش کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ ادب ہر اس شخص پر اثر چھوڑتا ہے جو اسے پڑھتا ہے۔ موجودہ دور میں ادب کے ذریعے بچوں کو کہانیوں، نظموں اور غزلوں کی مدد سے بہت سے اخلاقی اقدار سکھائے جا سکتے ہیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 ستمبر 2020

ضرب لطیف

رامپور: ایسٹ ویسٹ پبلک اسکول شاہ آباد گیٹ پر علم و ادب کی ایک انتہائی پروقار تقریب منعقد ہوئی۔ تقریب کے دوران طنز و مزاح کے معروف ادیب ایس فضیلت کی اہم کاوش اور طنزیہ مضامین، مزاحیہ خاکوں اور انشائیوں کے مجموعہ 'ضرب لطیف' کا اجرا رامپور کی سی ڈی او غزل بھاردواج کے دست مبارک سے عمل میں آیا۔ مورل سوشل ویلفیئر سوسائٹی و گلوبل سوشل ویلفیئر سوسائٹی کے باہمی اشتراک سے منعقد اس تقریب کی صدارت فخرالدین میموریل کمیٹی اتر پردیش کے سابق چیئرمین ڈاکٹر حسن احمد نظامی نے فرمائی اور مہمان خصوصی کی حیثیت سے رامپور کی سی ڈی او غزل بھاردواج نے شرکت کی۔ جبکہ نظامت کے فرائض معروف شاعر سید شکیل غوث نے اپنے منفرد انداز میں بحسن و خوبی ادا کیے۔ تقریب کے دوران مہمان ذی وقار کی حیثیت سے معروف محقق و ماہر قانون شوکت علی خاں ایڈوکیٹ، عالمی شہرت یافتہ شاعر اظہر عنایتی، ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی، صدر صولت پبلک لائبریری، سین شین عالم، انوار اللہ خاں ایڈوکیٹ، ڈاکٹر جاوید نسیمی، پروفیسر الف ناظم، ڈاکٹر رضیہ پروین، ذیشان مراد، عتیق جیلانی سالک، ڈاکٹر ارشد رضوی، ناصر خاں علیگ، نعیم نجمی، عبدالاحد فرقانی اور مسرور میاں اکرم موجود رہے۔ رسم اجرا تقریب کے دوران اپنے مختصر خطاب میں مہمان خصوصی غزل بھاردواج نے رامپور کی علمی وراثت و تہذیب کی پذیرائی کرتے ہوئے اردو سے اپنے تعلق کا ذکر کیا۔ ساتھ ہی ایس فضیلت صاحب کے لیے اپنی نیک خواہشات کا بھی اظہار کیا۔

روزنامہ 'اخبارِ مشرق' دہلی، 28 ستمبر 2020

ندا

سری نگر: شمالی کشمیر کے ضلع بارہمولہ میں 6 ستمبر کو ایک شاندار محفل مشاعرہ کا انعقاد ہوا جس دوران کورونا وائرس سے متعلق گائیڈ لائنز پر سختی سے عمل کیا گیا، محفل میں نوجوان شاعر بشیر زوگیاری کی دوسری تصنیف 'ندا' کی رسم اجرا انجام دی گئی۔ ساگر کلچرل فورم ژ کرپٹن کی طرف سے زوگیار شیری بارہمولہ میں ایک ادبی محفل منعقد ہوئی جس کی صدارت ادبی مرکز کمراز کے صدر فاروق رفیع آبادی نے کی۔ ریڈیو کشمیر کے سابق ڈائرکٹر سید ہمایوں قیصر نے بحیثیت مہمان خصوصی شرکت کی۔ محفل میں نوجوان شاعر بشیر زوگیاری کی دوسری تصنیف 'ندا' کی رونمائی ہوئی جس پر عابد اشرف نے تبصرہ کیا۔ روزنامہ 'صحافت' دہلی، 7 ستمبر 2020

مظفر حنفی

نئی دھلی: ممتاز اردو دانشور، شاعر، ناقد پروفیسر مظفر حنفی کا 10 اکتوبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 84 برس کے تھے۔

پسماندگان میں اہلیہ، ایک بیٹی اور پانچ بیٹے ہیں۔ ڈاکٹر محمد ابوالمظفر یکم اپریل 1936 کو کھنڈوہ (مدھیہ پردیش) میں پیدا ہوئے۔ ان کا آبائی وطن ہسوہ، فتح پور (یوپی) ہے۔ 1960 میں مدھیہ پردیش محکمہ جنگلات میں ملازم ہوکر بھوپال منتقل ہوگئے۔ اسی ملازمت کے دوران انھوں نے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے بی اے اور بھوپال یونیورسٹی سے ایم اے، ایل ایل بی اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ان کی تحقیق کا موضوع 'شاد عارفی - شخصیت اور فن' تھا۔ انھیں شاد عارفی سے تلمذ بھی حاصل ہے۔ 1976 سے وہ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے شعبہ اردو میں ریڈر کی حیثیت سے تدریس کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ 1989 میں کلکتہ یونیورسٹی نے انھیں 'اقبال چیئر' کے پروفیسر کی حیثیت سے فائز کیا۔ وہ اچھے افسانہ نگار، مترجم، شاعر، نقاد اور تیس سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ ان میں سے چند نام یہ ہیں: پانی کی زبان، تیکھی غزلیں، عکس ریز، صریر خامہ، دیپک راگ، یم بہ یم، کھل جا سم سم (شاعری)، دو غنڈے، دیدۂ حیراں (افسانے)، نقد ریزے، جہات وجستجو، باتیں ادب کی، لاگ لپیٹ کے بغیر، وضاحتی کتابیات، غزلیات میر حسن (تحقیق وتنقید)، روح غزل (انتخاب)، شاد عارفی۔

روزنامہ 'اخبار مشرق' دہلی، 11 اکتوبر 2020

ڈاکٹر کوکب قدر

کولکاته: اودھ کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ کے پرپوتے ڈاکٹر کوکب قدر کا مختصر علالت کے بعد یہاں ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں 13 ستمبر کو انتقال ہوگیا۔ وہ 78 برس کے تھے اور گزشتہ ایک ہفتے سے کورونا میں مبتلا تھے۔ ڈاکٹر کوکب قدر انقلاب کے ایڈیٹر شکیل شمسی کے خسر تھے۔ وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں درس وتدریس سے وابستہ رہے تھے اور تقریباً 35 برس تک وہاں ملازمت کرنے کے بعد ریڈر کے عہدے سے

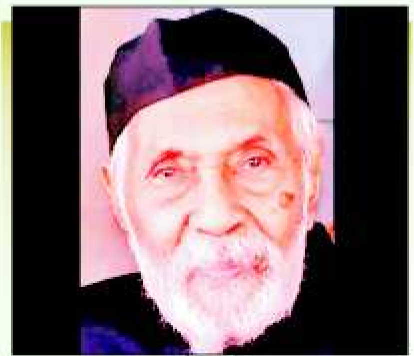

سبکدوش ہوکر کولکاتہ میں اپنے پشتینی مکان میں قیام پذیر تھے۔ وہ نواب واجد علی شاہ اور بیگم حضرت محل کے بیٹے برجیس قدر کے پوتے تھے۔ ان کے بڑے بھائی پرنس انجم قدر اور پرنس نیر قدر کا پہلے ہی انتقال ہو چکا ہے۔ وہ مٹیابرج میں واقع سبطین آباد ٹرسٹ کے ہیڈ ٹرسٹی بھی تھے۔ واضح ہو کہ 1857 میں آزادی کی پہلی جنگ میں شکست کھانے کے بعد بیگم حضرت محل نے تو نیپال میں پناہ لے لی تھی مگر نواب واجد علی شاہ کو انگریزوں نے گرفتار کرکے کولکاتہ کے فورٹ ولیم میں رکھا تھا اور بعد میں ان کو اس شرط پر رہا کیا گیا تھا کہ وہ لکھنؤ کبھی نہیں جائیں گے۔ رہا ہونے کے بعد نواب واجد علی شاہ نے ہگلی کے کنارے مٹیابرج کے نام سے ایک محلہ آباد کیا تھا جہاں پورا ماحول لکھنؤ جیسا تھا۔ وہیں ان کا بنوایا ہوا سبطین آباد کا امام باڑہ، مسجد اور دوسری عمارتیں موجود ہیں۔ نواب واجد علی شاہ کی قبر بھی اسی امام باڑے میں بنی ہے۔ بیگم حضرت محل کے نیپال میں انتقال کے بعد نواب برجیس قدر نیپال سے کولکاتہ آئے اور مٹیابرج میں ہی مقیم ہوئے اور پھر ان کے صاحبزادے مہر قدر بھی یہیں رہے اور سبطین آباد میں ہی دفن ہوئے۔ ڈاکٹر کوکب قدر کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ان کے پسماندگان میں بیوہ، تین بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 ستمبر 2020

عظیم امروہوی

امروهه: اردو زبان کے معروف شاعر، ادیب، نقاد اور عالمی مرثیہ سینٹر کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم امروہوی کا 75 سال کی عمر میں دہلی کے اسکارٹ اسپتال میں انتقال ہوگیا۔ گذشتہ ماہ ان کی کورونا رپورٹ مثبت آئی تھی جس

کے بعد ان کو اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا۔ ان کی 2 اکتوبر کو رپورٹ منفی آگئی تھی لیکن ہفتے کے روز اچانک ان کو ہارٹ اٹیک آگیا جس سے ان کا انتقال ہوگیا۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی کا شمار عالمی ادب میں ہوتا تھا۔ انھوں نے اردو شاعری کے ساتھ ساتھ رثائی ادب پر بہت کام کیا، جو سیکڑوں سال یاد رکھا جائے گا۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی نے اب تک پچاس سے زائد اردو میں کتابیں لکھی ہیں جن میں بیشتر تحقیقی مواد پر مبنی ہیں، ابھی گذشتہ دنوں صحافت میں امروہہ کا حصہ ادبی حلقوں میں پہنچی تھی۔ ڈاکٹر عظیم پندرہ سال قبل فوڈ کارپوریشن آف انڈیا کے اہم عہدے سے سبکدوش ہوئے تھے اور مسلسل اردو ادب کی خدمت میں مشغول تھے۔ امام المدارس انٹر کالج امروہہ کی مینیجنگ کمیٹی کے وہ چیئرمین بھی رہ چکے تھے۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی کئی ادبی اور ثقافتی اداروں کے سرپرست اور بانیان میں شامل تھے، سابق صدر جمہوریہ ہند گیانی ذیل سنگھ کے دست مبارک سے موصوف کو کئی اردو ایوارڈس کے ساتھ ساتھ مختلف ملکی وغیر ملکی، سرکاری وغیر سرکاری ایوارڈ سے نوازا گیا۔ حکومت اترپردیش اور مرکزی دار الحکومت کے اہم ثقافتی اداروں کی جانب سے بھی ان کی کئی کتابوں کو ایوارڈ حاصل ہوئے۔ علمی وادبی دنیا میں ان کے انتقال کو ایک عظیم خسارہ مانا جارہا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 اکتوبر 2020

ولایت جعفری

لکھنؤ: اردو کے معروف ادیب، گیت کار اور ممتاز ڈرامہ نگار ولایت جعفری کا 5 اکتوبر 2020 کو 85 برس کی عمر

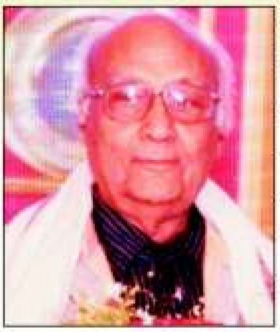

میں انتقال ہوگیا۔ وہ ممبئی میں اپنی بیٹی کے یہاں مقیم تھے۔ ولایت عرصے سے علیل تھے، کورونا سے بھی متاثر ہوئے لیکن کورونا کو مات دے کر گھر آگئے تھے کہ اچانک 5 اکتوبر کو داعی اجل کو لبیک کہا۔ ولایت جعفری 1952 میں تھیٹر کی دنیا سے وابستہ ہوئے اور ملک میں لائٹ اینڈ ساؤنڈ پروگرام کی شروعات کی۔ وہ رائے بریلی ضلع میں دو اکتوبر 1935 کو پیدا ہوئے۔ لکھنؤ یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی۔ 1986 میں لکھنؤ آکاش وانی کے ڈائرکٹر ہوئے۔ 1988 میں دوردرشن لکھنؤ کے ڈائرکٹر بنے۔ لکھنؤ سے خاص تعلق کے سبب شہر کے ادبی وعلمی حلقوں میں ان کے انتقال سے

سوگ کی لہر دوڑ گئی ہے۔ ولایت جعفری کے کئی نثری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں ان کی کہانیوں کے کئی مجموعے شامل ہیں جو اپنے زمانے میں بے انتہا مقبول تھے۔ انھیں اردو کے ادبی حلقوں میں مستحسن نظروں سے دیکھا جاتا ہے، وہ انتہائی خلیق، ملنسار اور اپنے چھوٹوں سے انتہائی شفقت سے پیش آتے تھے اور ان کی بڑی ہمت افزائی کرتے تھے، لکھنؤ ریڈیو اور دوردرشن پر وہ نئے نئے ٹیلنٹ ڈھونڈ کر لائے اور انھیں آسمان کی بلندیوں پر پہنچا دیا، چاہے وہ ادب کا میدان ہو یا ڈرامے کا۔ ان کے انتقال پر لکھنؤ دوردرشن کے سابق اسسٹنٹ ڈائرکٹر ڈاکٹر رفیق خاں ندوی نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ ولایت جعفری کے ساتھ مجھے ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ان کے بہت قریب ہو کر کام کرنے کا موقع ملا، لیکن ان کی جو چھاپ ہے وہ بالکل نمایاں اور منفرد ہے۔ آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے سابق ڈائرکٹر عتیق حنفی، کے کے نیر اور سینئر براڈ کاسٹر شفاعت علی صدیقی کے علاوہ لکھنؤ دوردرشن کے ڈائرکٹر ڈاکٹر منظور الامین، مسٹر گوسوامی اور مسٹر ششانک کی طرح ولایت جعفری نے اپنی زبردست چھاپ چھوڑی ہے، جس سے کئی نسلیں فائدہ اٹھا رہی ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 اکتوبر 2020

کپیلا واتسیاین

نئی دہلی: پدم وی بھوشن سے نوازی جا چکیں ملک کی معروف فن کار اور راجیہ سبھا کی رکن کپیلا واتسیاین کا 16

ستمبر کو انتقال ہو گیا۔ وہ 91 برس کی تھیں۔ محترمہ واتسیاین کے انتقال سے شعبۂ فن میں سوگ کی لہر ہے۔ وہ ہندی کے مشہور مصنف سچدانند ہیرانند واتسیاین کی اہلیہ تھیں اور تنہا زندگی گزار رہی تھیں۔ 25 دسمبر 1928 کو دہلی میں پیدا ہونے والی محترمہ کپیلا واتسیاین، موسیقی، رقص اور فن کی ادیب تھیں۔ انھوں نے دہلی بنارس ہندو یونیورسٹی اور امریکہ کے مشی گن یونیورسٹی سے تعلیم حاصل کی تھی۔ کپیلا جی، جو سنگیت ناٹک اکیڈمی کی فیلو رہ چکی تھیں، ممتاز ڈانسر شمبھو مہاراج اور مشہور مورخ واسودیو شرن اگروال کی شاگرد بھی تھیں۔ وہ راجیہ سبھا کے لیے 2006 میں نامزد رکن مقرر کی گئی تھیں۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 17 ستمبر 2020

ڈاکٹر نشتر امروہوی

امروهه: اردو زبان اور شاعری کی دنیا میں طنز ومزاح کی نامور بین الاقوامی شہرت یافتہ شخصیت ڈاکٹر نشتر امروہوی کا 17 ستمبر کو دہلی میں انتقال ہو گیا۔ ان کی تدفین شہر

امروہہ میں عمل میں لائی گئی جہاں ادبی و سماجی شخصیات نے نم آنکھوں سے شاعر طنز و مزاح کو رخصت کیا۔ حال ہی میں استاد شاعر ڈاکٹر شفاعت فہیم کے سانحۂ ارتحال کے بعد شہر امروہہ کی ادبی فضا کو یہ دوسرا صدمہ ہے۔ ڈاکٹر نشتر امروہوی طنز و مزاح کے میدان کے عالمی شہرت یافتہ شاعر تھے۔ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعے پورے برصغیر میں غیر معمولی شہرت حاصل کی تھی۔ ان کی کتاب پوسٹ مارٹم اور اردو ادب میں طنز ومزاح نے بھی بہت کامیابی حاصل کی تھی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 18 ستمبر 2020

ڈاکٹر شفاعت فہیم

امروهه: اردو زبان کی نامور شخصیت، استاد شاعر اور ادیب ڈاکٹر شفاعت فہیم امروہوی کا 10 ستمبر کو انتقال ہو گیا۔ ڈاکٹر شفاعت فہیم کا شمار ملک و بیرون ملک کے استاد شعرا میں ہوتا تھا۔ فن شاعری میں ان کو غیر معمولی

مہارت حاصل تھی۔ موصوف مشاعرہ کی محافل میں کم ہی حصہ لیتے تھے لیکن ملک و بیرون ملک کے معیاری رسائل میں ان کا کلام مسلسل شائع ہوتا رہتا تھا۔ ان کی شاعری کا سفر 5 دہائیوں پر مشتمل تھا جس میں ان کے کئی مجموعہ کلام منظر عام پر آئے جن میں 'ممکن' اور 'بروقت' کو بہت شہرت حاصل ہوئی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 ستمبر 2020

اعظم اثر

گلبرگه: گلبرگہ کے ممتاز و کہنہ مشق شاعر و ادیب اعظم اثر کا 8 اکتوبر کو 90 برس کی عمر میں انتقال ہو گیا۔ نماز جنازہ 9 اکتوبر کو بعد نماز جمعہ مسجد آثار شریف میں ادا کی گئی اور تدفین شاہ ابراہیم قادری قبرستان شاہ پور ضلع یادگیر میں عمل میں آئی۔ پسماندگان میں اہلیہ کے علاوہ دو فرزندان اور دو دختران شامل ہیں۔ مرحوم کا شمار ریاست کرناٹک کے کہنہ مشق شعرا میں کیا جاتا ہے جن کی تصانیف زخم آگہی، متاع آگہی، رشتوں کا درد اور موسموں کی سرحدیں اردو ادب کے سرمایہ میں قابل قدر اضافہ ہیں۔ انھوں نے شاعری کے علاوہ نثر نگاری اور بالخصوص طنز و مزاح نگاری میں اپنی علاحدہ شناخت قائم کی۔ اعظم اثر نے حمد باری تعالیٰ، نعت شریف، منقبت اور غزلوں کے علاوہ مختلف اصناف سخن میں اپنی شاعری کا لوہا منوایا، اردو ادب میں انھیں ایک اچھے شاعر و ادیب اور طنز و مزاح نگار کی حیثیت سے بھی ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ مرحوم ادب کے ساتھ ساتھ اپنی سماجی خدمات کی وجہ سے سیاسی حلقوں میں بھی کافی شہرت اور اثر رکھتے تھے۔ عوام میں ان کی ہر دلعزیزی و مقبولیت کی وجہ سے پانچ مرتبہ مجلس بلدیہ شاہ پور کے لیے منتخب ہوئے اور حکومت کرناٹک نے ان کی ادبی و سماجی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے انھیں رکن کرناٹک اردو اکادمی بنگلور نامزد کیا تھا۔ اپنی میعاد میں انھوں نے اردو زبان و ادب کے فروغ و اشاعت کے لیے قابل قدر خدمات انجام دیں۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 11 اکتوبر 2020

عبدالحفیظ خلش

اچلپور: 20 ستمبر 2020 کو اردو ادب کے معروف شاعر عبدالحفیظ خلش تسکینی اچلپوری کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال پر اردو برادری غم کے سمندر میں ڈوب گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ خداوند مرحوم کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ یقیناً اردو ادب میں خلش تسکینی اچلپوری کے جانے سے جو خلا پیدا ہوا ہے وہ مدتوں نہیں بھر پائے گا۔ میں خلش تسکینی اچلپوری صاحب کو انھیں کے شعر سے خراج عقیدت پیش کرتا ہوں۔

مری خموشی ہے تیری حماقتوں کا جواب
شعور آنے پہ انسان بولتا کم ہے

پریس ریلیز: سید ساجد علی اچلپور، پرنسپل الحاج اطہر مرزا اردو ڈی ایڈ کالج کلم نوری ضلع ہنگولی، 25 ستمبر 2020

خراج عقیدت

جگر مرادآبادی

مرادآباد: قومی ایوارڈ (پدم بھوشن) یافتہ وغزل کے بادشاہ علی سکندر جگر مرادآبادی کے 60 ویں یوم وفات پر سماجی تنظیموں نے خراج عقیدت پیش کیا ہے۔ نیشنل سوشل آرگنائزیشن

کے صدر الحاج مرزا ارشد بیگ نے جگر مرادآبادی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہا کہ جگر مرادآبادی نے مرادآباد کا نام دنیا میں روشن کیا۔ مرادآباد کی سرزمین پر بہت سے شعرا پیدا ہوئے، لیکن جو عزت و شہرت جگر مرادآبادی کو حاصل ہوئی، اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ جگر ہی وہ شخصیت ہے جس نے مرادآباد کو ادبی حلقوں میں متعارف کرایا۔ جگر مرادآبادی اردو کے مقبول ترین شعرا میں سے ایک ہیں۔ جگر صاحب ان خوش نصیب شعرا میں سے ہیں جنھیں اپنی زندگی ہی میں وہ مقبولیت نصیب ہوئی جس کے وہ حقدار تھے۔ اس عظیم المرتبت غزل گو شاعر کا 9 ستمبر 1960 میں انتقال ہوگیا۔ جگر مرادآبادی کو اردو دنیا کبھی بھلا نہیں سکے گی۔ ہر سال ان کے یوم پیدائش اور برسی پر ان کے چاہنے والے مشاعروں کے ذریعے ان کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 10 ستمبر 2020

ڈاکٹر تنویر علوی و توصیف احمد علوی عاصی کیرانوی

کیرانہ: کیرانہ کی دو ادبی شخصیات ڈاکٹر تنویر علوی و توصیف احمد علوی کو ان کی ادبی خدمات پر یاد کیا گیا، یہاں کی ادبی تنظیموں کے نمائندوں و معزز شخصیات نے خراج عقیدت پیش کیا، اس موقعے پر سید وحید احمد نے کہا کہ توصیف احمد علوی نے کیرانہ کے مکتب اسلامیہ میں تعلیم ہی نہیں دی بلکہ اس کو محنت و لگن کے ساتھ کامیاب کیا۔ انصار احمد نے کہا کہ ڈاکٹر تنویر علوی نے کیرانہ و اسارہ کے کالجوں میں اردو ادب کی تعلیم دے کر اردو کو فروغ دیا اور اس کے بعد اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے دہلی یونیورسٹی میں اردو کو فروغ دینے کی غرض سے سیکڑوں طلبہ کو کامیاب کیا جو آج بھی ملک میں بڑے عہدوں پر فائز ہیں، شیر خان ساحل نے کہا کہ ڈاکٹر تنویر احمد علوی و توصیف احمد علوی نے جہاں نثری میدان میں مختلف کتابیں لکھی ہیں، وہیں وہ شاعری کے میدان میں بھی پیچھے نہیں رہے۔ وثیق قاسم نے کہا کہ ڈاکٹر تنویر علوی و توصیف احمد عاصی علوی کیرانوی نے ملک و بیرون ملک میں اردو ادب کے فروغ میں جو نام کمایا ہے، اس سے ادبی حلقوں کے لوگ بخوبی واقف ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 21 ستمبر 2020

وصی اقبال

رامپور: وصی اقبال کا نام ادبی حلقوں میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ 1953 سے اپنے قلمی سفر کا آغاز کرنے والے وصی اقبال کی اصل پہچان افسانہ نگار کے طور پر ہے۔ ان کے تقریباً ایک درجن سے زیادہ افسانوی مجموعے مقبول عام ہو کر قارئین کی داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ اس کے علاوہ مرحوم نے مذہبی، اصلاحی اور معاشرتی موضوعات پر بھی متعدد کتابیں تحریر کی ہیں۔ ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں متعدد سرکاری و غیر سرکاری اعزازات سے انھیں سرفراز کیا گیا۔ ان خیالات کا اظہار مقررین نے وصی اقبال کی اٹھارہویں برسی پر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کیا۔ پروفیسر اقتدار محمد خاں شعبہ اسلامک اسٹڈیز، جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی نے اپنے والد ماجد کا تعارف کراتے ہوئے کہا کہ ملک کی آزادی کے بعد رامپور میں بہت تیزی کے ساتھ ادب تخلیق ہوا۔ شروعاتی دور کے افسانہ نگاروں میں ایس ایم شاہنواز، نعیمہ مسعود، وصی اقبال، نکہت افلاک، مسعود ظفر ایڈووکیٹ وغیرہ کا نام قابل ذکر ہے۔ 'گرتی دیواریں' کے مصنف وصی اقبال نئے انداز اور حسین پیرائے میں لکھنے کے لیے جانے جاتے ہیں۔ آپ کے کئی افسانوی مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ انداز تو پہچانو، کعبہ مرے آگے، بہاریں لوٹ آئیں گی اور آندھی میں چراغ ان کی تخلیقی قوتوں کی غماز ہیں۔ وصی اقبال جن کا خاندانی نام وصی محمد خاں ہے، سیف الدین خاں کی اولاد میں سے ہیں۔ آپ یکم جنوری 1934 کو پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی، بعدہ رامپور کے حامد اسکول سے بنیادی عصری تعلیم یعنی ہائی اسکول وغیرہ کی اسناد حاصل کیں، آگرہ یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے اور علی گڑھ سے ادیب کامل کیا۔ اپنے ذاتی شوق کی بنیاد پر ہندوستان کی مشہور دینی دانش گاہ دارالعلوم دیوبند سے دینیات میں فضیلت کی سند حاصل کی۔ ذریعۂ معاش کے لیے اتر پردیش کے محکمہ امداد باہمی میں ملازمت اختیار کی۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 24 ستمبر 2020

■

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا رچاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر .... بتاریخ .... بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرتعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: SYNB0009009 میں جمع کروا دیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ساحری، شاہی، صاحب قرانی (داستان امیر حمزہ کا مطالعہ) جلد اول: نظری مباحث

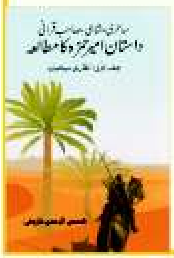

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 559

قیمت: 250 روپے

دربار اکبری

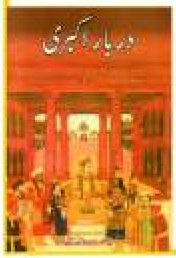

مصنف: شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد

تیسری طباعت: 2020

صفحات: 1070

قیمت: 475 روپے

اردو ادب کی سماجیاتی تاریخ

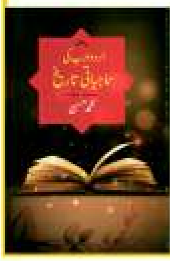

مصنف: محمد حسن

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 334

قیمت: 160 روپے

ساختیات، پس ساختیات اور مشرقی شعریات

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 620

قیمت: 275 روپے

گرونانک: حیات و خدمات

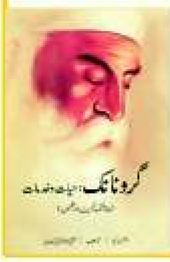

مرتبین: اختر الواسع، محمد حبیب

مفتی محمد مشتاق تجاروی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 190، قیمت: 110 روپے

حیاتیاتی تنوع اور ماحولیات کے مسائل

مصنف/مترجم: حافظ شائق احمد یحییٰ

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 132

قیمت: 90 روپے

راسخ عظیم آبادی: کلاسیکیت، شعریت اور انفرادیت

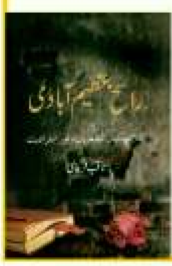

مصنف: ثاقب فریدی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 422

قیمت: 200 روپے

رامپور کے فارسی گو شعرا

مولفہ: ساجدہ شیروانی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 290

قیمت: 160 روپے

شعبہ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

URDU DUNIYA Monthly, November-2020, Vol.22, Issue:11
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/10/2020
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month

سوچھ بھارت
ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم وآگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان وادب سے متعلق اہم تنقیدی وتحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش وجستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

منگانے کے لیے رابطہ کریں:

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025